مولانا ابوالکلام آزاد کی خود نوشت

INDIAWINSFRFEDOM

آزادیٔ ہند

ترجمہ، تلخیص، تبویب، استدراک

رئیس احمد جعفری

طبع ہشتم ــــــــ ۱۹۸۱ء
اہتمام ــــــــ ملک مقبول احمد
مطبوعہ ــــــــ شاہ اینڈ سنز پرنٹرز۔ لاہور
قیمت ــــــــ روپے

مقبول اکیڈمی، لاہور

مُرارجی ڈیسائی کے نام!

جو میری آتش نوائی کا مقابلہ نہ کر سکے جنہوں نے سر فرانسس لو
ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا اور سید عبداللہ بریلوی ایڈیٹر بمبئی کرانیکل
کے سامنے نہایت تلخ اور درشت لہجے میں مجھ سے کہا:
"آپ کی جگہ ہندوستان میں نہیں پاکستان میں ہے،
اور جس قدر جلد آپ چلے جائیں آپ کے لیے بہتر ہوگا"

رئیس احمد جعفری

شکر و سپاس

اگرچہ یہ کام بڑا کٹھن، دشوار اور صبر آزما تھا
لیکن الحمد للہ، ہم بھی فارغ ہوئے شتابی سے"
خدا کا شکر ہے تقریباً ۲۵ دن کی شبانہ روز محنت
کے بعد یہ اتمام کو پہنچا۔ اس سلسلے میں اپنے مددگار
مسٹر احمد رضا کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں
جن کی مخلصانہ رفاقت نے اس کارِ دشوار کے انجام
دینے میں مجھے بہت سہولت پہنچائی، کاپیوں اور
پروفوں کی تصحیح میں انہوں نے بھی دن رات
ایک کر دیا، جب میں لکھتے لکھتے تھک جاتا تو
خود بولتا جاتا وہ لکھتے جاتے۔

اپنے عزیز اور مخلص دوست مسٹر علیم کا بھی
میں شکر گزار ہوں، انہی کی عنایت سے یہ کتاب
مجھے ملی جس کا ترجمہ آپ کے سامنے ہے۔

رئیس احمد جعفری

مترجم کا تعارف

چیف ایڈیٹر روزنامہ خلافت بمبئی ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۹ء
مینجنگ ایڈیٹر روزنامہ ہندوستان بمبئی سنہ ۱۹۳۹ء تا سنہ ۱۹۴۲ء
چیف ایڈیٹر روزنامہ انقلاب بمبئی سنہ ۱۹۴۲ء تا سنہ ۱۹۴۷ء
چیف ایڈیٹر روزنامہ خورشید کراچی سنہ ۱۹۴۸ء
ایڈیٹر ماہنامہ ریاض کراچی سنہ ۱۹۵۳ء تا سنہ ۱۹۵۴ء
چیف ایڈیٹر روزنامہ زمیندار لاہور سنہ ۱۹۵۴ء تا سنہ ۱۹۵۵ء

فہرست مضامین

آزادیٔ ہند کے مباحث

(۲)

ز

س

ع

ک

گ

عرضِ مکرّر

"آزادیٔ ہند" کا یہ چھٹا ایڈیشن ہے، قوم نے اسے پسند کیا، قوم کے دانشوروں نے داد دی، پرانے سیاستدانوں اور تحریکِ پاکستان کے علمبرداروں اور قائدِ اعظم کے پروانوں نے حوصلہ افزائی کی اور میں نے اپنی محنت کا صلہ پالیا۔ سیم وزر کی صورت میں کوئی انعام ملتا تو وہ چند روز میں ختم ہو جاتا، لیکن یہ انعام جو مجھے ملا یہ میری سب سے قیمتی پونجی ہے اور اسے زندگی کی آخری سانس تک میں اپنے سے جُدا نہیں کر سکتا۔

لیکن اس داد کے ساتھ "بیداد" کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

بعض دوست تیغ و سناں لے کر مخالفت کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں اُتر آئے ان کی عزیمت و استقامت قابلِ داد ہے کہ "چٹان" کی طرح اپنی جگہ جمے رہے، ان سے اگر میں کچھ کہہ سکتا تو اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا تھا کہ وار پر وار کیے جائیں، میرا داغ داغ سینہ بھر استقبال موجود ہے۔ تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے؟ کچھ "بے مہر" دوست ایسے بھی تھے، جنہوں نے اس کتاب کے خلاف ایک مورچہ قائم کر لیا اور جب تک کتاب بالکل ختم ہو کر بازارِ ادب میں جنسِ نایاب نہ بن گئی، انہوں نے جنگ جاری رکھی، اب پھر نیا ایڈیشن آ رہا ہے، دیکھئے مجھ نیم جان پر دوستوں اور کرم فرماؤں کے ہاتھوں کیا گزرتی ہے۔

جو حضرات مخالفت میں پیش پیش تھے انہوں نے مجھے گالیاں تو دیں، جی بھر کے

برا بھلا بھی کہا لیکن کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ تو نے فلاں جگہ ترجمہ غلط کیا ہے یا اپنے تردیدی حواشی میں فلاں بات غلط لکھی ہے یا اعداد و شمار تو نے غلط پیش کیے ہیں وہ فریب اور مغالطے پر مبنی ہیں، میں سمجھتا ہوں یہ ان کی شکست تھی!

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی صحت یا عدم صحت کے ذمے دار وہ خود ہیں لیکن ایک مترجم کی حیثیت سے میرا یہ حق اور فرض تھا کہ پاکستان کے بارے میں مولانا نے اپنے نقطہ نظر سے جو کچھ لکھا قائداعظم کے بارے میں جو غیر شایانِ شان جو کچھ تحریر فرمایا، تحریک پاکستان اور اس کے مضمرات و موثرات سے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا' اس میں اگر مجھے کوئی غلطی نظر آتی ہے تو اس کی تردید کر دوں، یہ تردید واقعات و حقائق، اور اعداد و شمار پر مبنی ہونی چاہیے، میں نے ایسا ہی کیا، پھر بھی پاکستان میں رہنے والے، پاکستان کی وجہ سے سرمایہ دار بن جانے والے، یہ احباب مجھ سے روٹھ گئے، ان کے پاس دلیل کوئی نہیں تھی، سب و شتم کا سرمایہ تھا۔ اس کی یہ کنکر اور پتھر سمجھ کر مجھ پر بارش کرتے رہے اور میں لعل و گوہر سمجھ کر انہیں اپنے دامن میں سمیٹتا رہا، البتہ ان مرحلوں پر قائداعظم مجھے ضرور یاد آتے اور بہت زیادہ یاد آئے۔

به جرمِ عشقِ تو ام می کشند غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آ که خوش تماشائیست

بات یہ ہے کہ کچھ اُلٹے دماغ اب تک پاکستان میں موجود ہیں جنہوں نے پاکستان کو خلوص اور سچائی کے ساتھ قبول نہیں کیا ہے، وہ ہر ایسے موقعہ پر تلملا اٹھتے ہیں جب پاکستان کا دفاع کیا جائے یا قائداعظم کے روشن چہرے سے تہمتوں کا گرد و غبار صاف کرنے کی کوشش کی جاتی، انہوں نے مجھے گرفتار کرانے کا مطالبہ کیا، انہوں نے مجھے مستحقِ تعزیر و عقوبت قرار دیا، انہوں نے چاہا کہ مجھ پر مقدمہ چلے۔ ان کی دل و جان سے کوشش تھی کہ یہ کتاب ضبط کر لی جائے۔

پاکستان اور قائداعظم سے قطع نظر کریں تو اس کتاب میں مولانا آزاد نے کانگرس کی قیادت اور کانگرس کے رہنماؤں کی ذہنیت کا تجزیہ کرتے ہوئے، اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر وہی کچھ فرمایا ہے جو قائداعظم نے دور بیٹھے ہوئے محض فراستِ مومن سے ارشاد فرمایا تھا، اس سلسلے میں میرا اگر کوئی جرم ہے تو صرف اتنا کہ مولانا نے

کانگرس کی اگر دس کوتاہیاں اور دراز دستیاں بیان فرمائی ہیں تو میں نے مزید پانچ کی نشاندہی کر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے پہلی اور آخری مرتبہ ایک سیاسی موضوع پر ایسی کتاب تحریر فرمائی، اختلاف جس کے صرف چند صفحات سے کیا جا سکتا ہے ورنہ ساری کتاب ایسے حقائق پر مبنی ہے کہ ان کا بدترین مخالف بھی یہ کہنے اٹھنے پہ مجبور ہے کہ کشش حرفوں کی ایسی ہے کہ ہم بھی صاد کرتے ہیں۔

افراد و اشخاص کا احترام یقیناً کرنا چاہیے اور وہ حضرات جو مسندِ قیادت پر متمکن ہوں وہ تو بہر حال اور بہر کیف اجلال و اکرام کے سزاوار ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ جس شخص کی تعظیم و تکریم کی جائے اس کی ہر رائے سے اتفاق بھی کیا جائے۔ البتہ ضرور ہے کہ اختلاف دیانت دارانہ اور شائستہ ہونا چاہیے۔ اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شخصیت پرستی سے روکتا ہے۔ نبی کے سوا کوئی معصوم نہیں ہے، اور جو معصوم نہیں اس سے فکر رائے اور اقدام عمل کی غلطی بھی ہو سکتی ہے اور اس غلطی کی نشاندہی کی جا سکتی ہے اگر اس بات پر کچھ لوگ خفا ہوں تو ان کی خفگی برداشت کرنے کو میں تیار ہوں۔ میں نبی کے سوا کسی کو بھی معصوم نہیں مانتا۔ ہر شخص کی رائے کو خواہ وہ شخص مجھے کتنا ہی عزیز و محبوب ہو، میں پرکھوں گا، قابلِ قبول پاؤں گا تو قبول کر لوں گا ورنہ رد کر دوں گا۔ اختلاف صرف رائے سے رہنا چاہیے نہ کہ شخصیت سے۔ میں نے صرف رائے سے اختلاف کیا ہے ذات اور شخصیت سے نہیں، اور یہ حق مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ یہی حق میں دوسروں کو ان بزرگوں کے لیے بھی دیتا ہوں جن کی فکر رائے میرے لیے عقیدے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ قائد اعظم سے لے کر موجودہ صدرِ مملکت تک جس سے چاہیں فکری اختلاف کریں لیکن انہیں بھی اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اختلاف صرف رائے تک محدود رہے۔ ذاتیات تک وسعت نہ اختیار کرے یہ ان کا ایسا حق ہے جسے ان کی رائے سے اختلاف رکھنے کے باوجود منوانے کے لیے میں ہر قسم کی قربانی دے سکتا ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ پاکستان کی ضرورت، اہمیت اور افادیت اور زیادہ واضح نہ ہو جاتی ہو۔ ہندوستان اگر غیر منقسم رہتا تو آج برِصغیر کی پوری ملتِ اسلامیہ جاں بلب ہوتی لیکن کیسی ستم ظریفی ہے کہ ان حقائق کے ہوتے ہوتے بھی بعض لوگ پاکستان

میں بیٹھ کر پاکستان کی، پاکستان کے بانی — قائداعظم — کی اور پاکستان کا تخیل بخشنے والے اقبال کی مخالفت کرتے رہتے ہیں اور جو اس مخالفت میں ان کا ساتھ نہیں دیتا اس سے خفا ہو جاتے ہیں۔ ان کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم ہے کہ پاکستان، قائداعظم اور اقبال کو برسرِعام بُرا کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، اس لیے کہ رائے عامہ سے خائف ہیں۔ لیکن استعاروں میں نجی مجلسوں میں اور شعر و فن کی جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں کوئی جھجک بھی نہیں محسوس کرتے اور جو انہیں مخاطب کیے بغیر ان کی رائے سے اختلاف کرتا ہے اس کے درپے آزار ہو جاتے ہیں۔

ابھی کچھ عرصہ ہوا میں پنڈی گیا وہاں الحاج خواجہ شہاب الدین وزیر اطلاعات و نشریات کی خدمت عالی میں بھی حاضر ہوا۔ خواجہ صاحب سے بارہ تیرہ سال کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی ۱۹۴۸ء میں جب میں نے کراچی سے روزنامہ خورشید نکالا تھا تو خواجہ صاحب اس کے خاص سرپرستوں میں تھے انہوں نے جب "پریس کنسلیٹو کمیٹی" قائم کی تو اس کے جو ممبر نامزد کیے تو ان میں الطاف حسین (ڈان) اور راشدی (سندھ آبزرور) کے علاوہ یہ خاکسار بھی شامل تھا۔ یہ ان کی شفقت اور حوصلہ افزائی کی انتہا تھی۔ پھر خواجہ صاحب گورنر بنے، سفارت کے منصب پر فائز ہوئے، برسہا برس وطن سے دُور رہے، آئے تو گوشہ نشین ہو کر بیٹھ رہے لیکن صدر ایوب نے ان کے خلوص، خدمات اور دیانتِ فکر کی قدر کی، اور اپنی کابینہ کا سینئر ممبر بنا لیا۔ اس طرح بارہ تیرہ سال کی طویل مدت کے بعد یک بیک یہ ملاقات ہوئی۔

خواجہ صاحب کی شفقت و مرحمت کا وہی عالم اس ناچیز کے ساتھ تھا جس کا ۱۹۴۷ء سے میں خوگر چلا آ رہا تھا، میں یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خواجہ صاحب نے اپنی گراں بار مصروفیات میں ایک گمنام اور ہیچ میرز کی بعض کتابوں پر بھی نظر ڈالنے کا وقت نکال لیا ہو، لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب خواجہ صاحب نے باتوں باتوں میں دفعتہً "آزادیٔ ہند" کا ذکر چھیڑ دیا، اور میرے اختلافی حواشی کی تعریف فرمائی، خواجہ صاحب کے محبت اور شفقت سے بھرے ہوئے الفاظ سے مجھے بہت مسرت ہوئی۔ اس لیے نہیں کہ انہوں نے ازراہ حوصلہ افزائی تعریف فرمائی تھی، اس کہ وہ ان چند باقیات الصالحات میں ہیں جو پاکستان کے تصور (آئیڈیالوجی) کے

پاسبان و نگہبان ہیں، ایک ایسی ہستی کے مُنہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ میرے لیے سرمایۂ فخر و ناز ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میرا جُرم اس کتاب کے سلسلے میں جو کچھ ہے وہ صرف یہ کہ میں نے تصوّرِ پاکستان کا دفاع اپنے مقدور بھر کیا ہے، اگر یہ جرم ہے تو مجھے اس کا اعتراف ہے اگر یہ قابلِ تعزیر جُرم ہے تو میں صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

تعزیرِ عشق جُرم ہے بے سود محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد

گزشتہ ایڈیشنوں میں کتابت کی کچھ غلطیاں رہ گئی تھیں، اس مرتبہ کوشش کی گئی تاکہ غلطیاں زیادہ سے زیادہ احتیاط کے ساتھ درست کر لی جائیں، ہو سکتا ہے پھر بھی کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں اس کے لیے پیشگی معذرت پیش کی جاتی ہے۔

رئیس احمد جعفری

آزادیٔ ہند

○

مسائل و مباحث

(ا)

حرفِ آغاز

مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت (INDIA WINS FREEDOM) جب میں نے پڑھی تو اس کے مباحث نے ایک نئی دنیا میرے سامنے پیش کر دی۔ ان مباحث کا ایک حصہ تو وہ ہے جو انکشافات سے تعلق رکھتا ہے، یہ بے حد عجیب اور بے انتہا دلچسپ ہے۔ ان مباحث کا دوسرا حصہ طومار ہے "غلطہائے مضامین" کا، واقعات غلط، اعداد و شمار نادرست، استخراجِ نتائج منطقی لیکن مغالطہ انگیز۔

بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ۱۹۳۴ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک سیاسی تحریکوں اور رہنماؤں سے الجھے دور رہتے ہوئے بھی قریب کے مواقع حاصل رہے، ۱۹۳۹ء تک میں روزنامہ خلافت بمبئی کا چیف ایڈیٹر اور مولانا شوکت علی کا ضمیمہ بنا رہا۔ مالوی جی سے لے کر گاندھی جی تک تصدق احمد خاں شروانی سے لے کر ڈاکٹر محمود تک مہاراجہ الور سے لے کر مہاراجہ پٹیالہ خلیق الزماں سے لے کر نواب اسماعیل خاں تک، شعیب قریشی سے لے کر عبدالرحمٰن صدیقی تک، راجہ محمود آباد سے لے کر قائدِ اعظم تک، ایک بے نام و نمود، ناقابلِ التفات، اور غیر اہم شخص کی حیثیت سے، مولانا شوکت علی کی معیت میں، سب کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے اور پرکھنے کے مواقع مجھے حاصل رہے، میں بطورِ خود ان کی محفل میں بار نہیں پا سکتا تھا جاتا تو دھتکار دیا جاتا، لیکن مولانا شوکت علی خاں کے ساتھ کوئی ہوتو اس سے بدسلوکی نہیں کی جا سکتی کیونکہ مولانا اپنے ہر ساتھی کو خواہ وہ کتنا ہی حقیر اور ہیچ کیوں نہ ہو خلافت ہاؤس سے باہر وہی حیثیت دیتے تھے جو خود اپنی۔ ان کے ساتھی کی توہین خواہ وہ معروف ہو یا

غیر معروف خوردان کی توہین تھی اور وہ نہایت متحمل ہونے کے باوجود اپنی توہین کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتے تھے، بمبئی کے پولیس کمشنر، سر پیٹرک کیلی ہوں یا گورنر، لارڈ برابورن، حکومت ہند کے ہوم ممبر، (بعد میں پنجاب کے گورنر)، سر ہنری کریک ہوں یا حیدر آباد فرخندہ بنیاد کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری، علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر ضیاء الدین ہوں یا زنانہ کالج کے بانی اور رُوحِ رواں شیخ عبداللہ، بمبئی کے کروڑ پتی تاجر اور غنڈوں کے سردار، سر سلیمان قاسم مٹھا، ممبر کونسل آف اسٹیٹ ہوں یا کوئی اور بزرگ، ایسے موقع پر مولانا کا آبنوسی ڈنڈا فوراً حرکت میں آجاتا تھا، وہ علی گڑھ کے گریجویٹ، اولڈ بوائز کے کرتا دھرتا، خلافت کے زعیم کبیر اور آل انڈیا شہرت رکھنے والے بطل جلیل ہونے کے بجائے اپنے رامپوری ہونے پر فخر کرنے لگتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۳ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۷ء تک کا وہ زمانہ تھا جب بار بار ہندو مسلمانوں میں صلح و مفاہمت کی کوششیں ہوئیں۔ لکھنؤ، الہ آباد، بمبئی، کلکتہ اور دوسرے مقامات پر صلح کانفرنسیں ہوئیں، ان کانفرنسوں میں مسلم لیگ، خلافت، مہاسبھا، کانگریس اور دوسری سیاسی جماعتوں کے نمائندے شریک ہوتے، پھر غیر رسمی کانفرنسوں اور نجی گفتگوؤں کا سلسلہ شروع ہوا، یہ وہ وقت تھا کہ ابھی قائد اعظم صرف مسٹر جناح تھے اور کوئی کانفرنس، کوئی تجویز، کوئی فارمولا اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا تھا جب تک مولانا شوکت علی اس پر صاد نہ کریں۔ لہٰذا خلافت ہاؤس میں گاندھی جی، پنڈت مالوی، مولانا آزاد، تصدق احمد خاں شروانی، ڈاکٹر سید محمود وغیرہ متعدد بار آئے۔ مولانا شوکت علی خط لکھوائیں یا مضمون یا کوئی اور کام درپیش ہو وہ مجھ سے یہ سارے کام لیتے تھے، مسٹر جناح یا افغان قونصل متعینہ بمبئی کو کوئی پرائیویٹ خط یا پیام بھیجنا ہو تو نگاہِ انتخاب مجھی پر پڑتی تھی، لہٰذا بہت سے سیاسی اکابر، سیاسی جماعتوں اور ان جماعتوں کے سربراہوں سے ذاتی تعارف نہ ہونے کے باوجود میں نہ صرف قریب رہا، بلکہ مجھے ان کے انداز و اطوار، طرزِ کلام اور طرزِ فکر کو بھی دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

بمبئی ہندوستان کی سیاسی دنیا کا مرکز تھا، ہر تحریک، ہر جماعت اور ہر قسم کا لیڈر یہاں موجود، مولانا شوکت علی کے انتقال کے بعد میں روزنامہ انقلاب کا چیف ایڈیٹر ہو گیا۔ جو بمبئی کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اور بہت زیادہ باوقار اخبار تھا، اس حیثیت سے

بھی مجھے بہت سے نادر مواقع، اکابر ہند سے ملنے، سیاسی جماعتوں کے جلسوں میں شریک ہونے
حتیٰ کہ کبھی کبھی ورکنگ کمیٹی اور مجلس مضامین تک کے اجلاسوں میں شروع سے آخر تک
بیٹھنے کے حاصل ہوتے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت یعنی INDIA WINS FREEDOM جب میں نے
دیکھی اور اس کے مباحث کے خارزار اور چمنستان کی جب میں نے سیر کی تو بہت سی بھولی بسری
باتیں میرے دماغ میں تازہ ہوگئیں اور میں اس کتاب کے مباحث کو اُردو میں منتقل کرنے
اور ان پر اپنے مشاہدات و معلومات کی روشنی میں گفت گو کرنے پر مجبور ہوگیا۔

معنوی اعتبار سے اس کتاب کے چار حصّے ہیں۔

۱۔ ذاتی حالات و سوانح

۲۔ در مدح خود

۳۔ حشو و زوائد

۴۔ مباحث مہمّہ

میں نے ذاتی حالات و سوانح کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، یہ باب مختصر سے حالات پر مشتمل ہے
اُردو زبان میں خود مولانا کا لکھا ہوا مفصّل "تذکرہ" موجود ہے جسے ذاتی حالات سے دلچسپی
ہو وہ تذکرہ پڑھ سکتا ہے۔

وہ حصّہ جو در مدح خود پر مشتمل ہے وہ صرف مخصوص عقیدت مندوں کے کام کا ہو تو ہو
سیاسیات کے پیچ و خم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس میں کوئی کشش نہیں۔

حشو و زوائد سے بھی مولانا نے کام لیا ہے یعنی نفس موضوع سے غیر متعلق باتیں یا پریس
کانفرنسوں میں ان کے طویل بیانات، یا ان کی صدارت میں منظور کی ہوئی کانگریس ورکنگ
کمیٹی کی تجویزیں یا بعض تجاویز کا، ان کا تیار کیا ہوا طویل مسودہ یا سر اسٹیفورڈ کرپس وغیرہ
سے مراسلات، یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کا خلاصہ چند سطروں میں خود مولانا ہی نے زیر
بحث موضوع پر گفتگو کرتے ہوتے بیان کر دیا ہے۔ میں نے مولانا کا یہی خلاصہ لے لیا
ہے اور طویل اور دماغ کو تھکا دینے والی عبارتیں ترک کر دی ہیں۔

اس کتاب کی جان؛ وہ سیاسی مباحث ہیں جو مولانا نے سپرد قلم فرماتے ہیں۔ یہ مباحث
اپنے اندر چند پہلو رکھتے ہیں۔

۱۔ انکشافات ـــــ وہ اسرارِ درون پردہ جنہیں صرف مولانا ہی بیان کر سکتے تھے کیونکہ آہنی پردہ (IRON CURTAIN) کے پیچھے کیا ہوتا رہا تھا، باہر والے صرف قیاس آرائی ہی کر سکتے تھے، مولانا اس پردہ کے پیچھے تماشائی کی حیثیت سے نہیں فعال ممبر کی حیثیت سے تشریف رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ ہمارے لیے انکشاف ہے، مولانا کے لیے مشاہدہ اور حقیقت اور اس حصہ میں وہ بلاشبہ چیلنج کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ـــ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔

یہ سارا حصہ میں نے لے لیا ہے۔

۲۔ اعترافات ـــــ اس کتاب میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں مولانا نے اپنے ساتھیوں، اور اپنی جماعت کی غلطیاں تسلیم کی ہیں اور پھر انہیں پیش آمدہ واقعات سے مبرہن کیا ہے۔ ایسے مباحث کے ایک ایک حرف کا میں نے ترجمہ کر ڈالا ہے۔

۳۔ شخصیات ـــــ اپنے معاصرین پر، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، انگریز ہوں یا پارسی، کانگرسی ہوں یا مسلم لیگی، مولانا نے نکتہ چینی بھی کی ہے، جو کہیں مبنی برحقیقت ہے کہیں اس میں ذاتیات کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے لیکن یہ چیز چونکہ کام کی تھی، کہیں کہیں حد سے زیادہ دلچسپ، نتیجہ خیز، معلومات افزا، اور سبق آموز بھی، اس لیے میں نے ایک حرف بھی اس کا ترک نہیں کیا۔

۴۔ تنقیدات ـــــ سیاسی جماعتوں (جن میں خود کانگرس بھی شامل ہے)، نظریوں، تحریکوں اور اختلافی مباحث پر بھی مولانا نے قلم فرسائی کی ہے۔ یہ حصہ بھی خاصا دلچسپ اور معرکہ آرا ہے، کچھ غلط کچھ صحیح لیکن اسے نظر انداز کرنا سیاسی دیانت کے خلاف ہوتا، میں نے اسے بتمامہٖ لے لیا ہے۔

۵۔ ذاتیات ـــــ در مدح خود کے علاوہ کتاب کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو صرف مولانا کے ذاتی واردات سے تعلق رکھتا ہے، اس میں سوز بھی ہے اور ساز بھی، درد بھی ہے اور گداز بھی، شیرینی بھی اور تلخی بھی، مایوسی بھی اور محرومی بھی، ناکامی کا احساس بھی اور آوازِ شکستِ دل بھی۔

بھلا اسے میں کیونکر چھوڑ سکتا تھا؟ چنانچہ اس سلسلہ کا ایک ایک حرف اس کتاب میں موجود ہے۔

اب میں ایک نہایت عجیب و غریب اور بظاہر ناقابلِ یقین دعوٰے کرنے والا ہوں، صرف دعوٰی سُن کر تو آپ چونک پڑیں گے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد آپ کو میرا ہمنوا ہونا پڑے گا۔

میرا دعوٰی یہ ہے کہ میری یہ کتاب جو درحقیقت مولانا ہی کی ہے، مولانا کی کتاب سے کہیں زیادہ دلچسپ، معنی خیز اور مفید ہے۔

مجھے اس کتاب پر وہ محنت کرنا پڑی ہے جو مولانا کو اسے سپردِ قلم کراتے وقت اور ہمایوں کبیر کو اسے انگریزی میں منتقل کرتے وقت بھی نہیں کرنی پڑی ہوگی۔

مولانا کی یہ خود نوشت ہے، انہوں نے قلم اٹھایا اور جو جایا لکھتے چلے گئے، ہمایوں کبیر نے قلم اٹھایا اور مولانا نے جو کچھ لکھوایا یا لکھا تھا، انگریزی میں منتقل کرتے چلے گئے —— کتاب تیار ہوگئی۔

میں نے اس کتاب کو زیادہ معنی خیز، دلچسپ اور TOTHEPOINT بنانے کے لیے یہ کیا کہ مولانا نے جن واقعات و مباحث اور شخصیات کو ساری کتاب میں بکھیر دیا تھا، الگ الگ عنوانات کے تحت یکجا کر لیا اور پھر ان پر ضروری تشریحی یا تصحیحی مواد بڑھا دیا، اس طرح ہر بحث پر مولانا کے خیالات یکجا طور پر سامنے آگئے، اس بحث کے جن جن پہلوؤں پر متفرق اور مختلف صفحات میں مولانا نے گفتگو کی تھی، وہ سب ایک جگہ ہوگئے، یوں مولانا کے خیالات بھی تفصیل اور یکسوئی کے ساتھ سامنے آگئے۔ ان پر مجموعی حیثیت سے رائے قائم کرنا بھی آسان ہوگیا اور ان کے تمام پہلوؤں پر میرے لیے تنقید و تبصرہ کرنا اور آپ کے لیے دونوں میں محاکمہ کرنا بھی آسان ہوگیا، اس طرح کتاب کی تبویب یکسر بدل گئی لیکن اس کی افادیت اور اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔

شخصیات کے سلسلہ میں خاص طور پر مجھے بہت زیادہ محنت اور دقتِ نظر سے کام لینا پڑا۔

مختلف شخصیات کا ذکر، سلسلۂ سخن میں مولانا نے مختلف صفحات میں کیا ہے، اصل مبحث کے زور و قوت کے سامنے شخصیات کا یہ ذکر دب گیا ہے مثلاً ہم کرپس مشن کے اہم ترین مبحث پر مولانا کے خیالات پڑھ رہے ہیں، روانیِ سخن میں مولانا نے راج گوپال اچاری کا ذکر بھی کیا ہے، جواہر لال کا بھی، قائداعظم کا بھی، گاندھی جی کا بھی اور دوسرے

معاصرین کا بھی، ان لوگوں کے سلسلہ میں جو چھُبھی ہوئی باتیں مولانا کہہ گئے ہیں ان سے ذرا ہم لطف لیتے ہیں یا متاثر ہوتے ہیں، پھر اصل مبحث میں کھو جاتے ہیں، اور مبحث کی اہمیت ہمیں شخصی تاثرات سے غافل کر دیتی ہے۔

اسی طرح کابینہ وفد، شملہ کانفرنس، ماؤنٹ بیٹن پلان، تقسیم ہند کی تجویز، دلّی کے قتلِ عام کے سلسلہ میں مولانا نے جو چیزیں پیش کی ہیں وہ بجائے خود اتنی اہم ہیں کہ ضمناً انہوں نے شخصیتوں کا جو ذکر کیا ہے وہ ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

میں نے ہر شخصیت کا ذکر کتاب سے چھانٹ چھانٹ کر الگ ایک مقالہ کی صورت میں صفحات کا حوالہ دیتے ہوئے مرتب کر لیا ہے، اس طرح زیرِ مطالعہ شخصیت کی پوری اور مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مولانا کے خیالات و تاثرات اس کے بارے میں اوّل سے آخر تک نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ مباحث سے اسے الگ کرنے کے بعد دونوں — مبحث اور شخصیت — کی حیثیتیں الگ الگ متعین ہو جاتی ہیں۔ دونوں کا خاکہ اور نقشہ الگ الگ پیشِ نظر ہو جاتا ہے، اور دونوں کی مستقل حیثیت قائم ہو جاتی ہے، اس طرح کتاب کی تبویب بھی نئی ہو گی، اور مباحث و شخصیات کا مکمل اور جداگانہ مرقع بھی مرتب ہو گیا۔ مباحث پر جب آپ مولانا کے خیالات پڑھیں گے تو کوئی غلط مبحث آپ کو اضطراب خیال میں مبتلا نہیں کرے گا۔ شخصیات کا جب آپ مطالعہ کریں گے تو غیر متعلق باتیں آپ کو اپنی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیں گی۔

اب میں ایک مثال دے کر واضح کر دوں۔

مسلم لیگ کا ذکر حسبِ ذیل صفحات میں ہے۔

۲۰، ۲۲، ۴۸، ۵۰، ۶۷، ۶۸، ۹۳، ۹۹، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۲۴، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۵، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۸، ۱۷۳، ۱۷۸، ۱۸۴، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۶، ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۲۵، ۲۲۹،

پھر دوسرے سلسلہ میں

۲۱، ۱۱۲، ۱۶۹،

پھر ایک اور سلسلہ میں

۱۱۰، ۱۱۱، ۱۳۶، ۱۴۲

اسی پر مسلم لیگ، دو قومی نظریہ، پاکستان، قائدِ اعظم، لیاقت علی خاں، سردار پٹیل اور دوسرے مباحث و شخصیات کا قیاس کر لیجیے۔

اس طرح میں نے تقریباً ہر مبحث اور ہر شخصیت کو نئے عنوان اور نئی تبویب کے ساتھ ایک مستقل صورت دے دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ صفحات کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔ یوں سمجھئے ریت کے سمندر سے سونے اور چاندی کے ذرے نکالے ہیں تاکہ کتاب کی افادیت اہمیت اور دلچسپی میں اضافہ ہو جائے اور میرا خیال ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ جب ۸؍مئی ۱۹۵۸ء کو میں نے اس کتاب کے ترجمہ اور تبویبِ استدراک کا کام مذکورہ بالا نقشہ کے ماتحت شروع کیا ادر اسی دن مجھے یہ اطلاع ملی کہ کوئی اور صاحب بھی اس کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں تو مجھے ذرا بھی تشویش نہیں ہوئی، جس طرح مولانا شبلی کو شعر العجم لکھتے وقت محمد حسین آزاد کے بارے میں اطلاع ملی کہ سخندانِ فارس لکھ رہے ہیں تو کوئی تشویش نہیں ہوئی تھی اس لیے کہ شبلی کا راستہ آزاد کے خیال میں نہیں آسکتا تھا اور آزاد کے راستہ پر شبلی نہیں چل سکتے تھے، دونوں کا اندازِ فکر جدا، پروازِ فکر الگ!

اس کتاب میں ایک بات بہت کھٹکتی ہے!

مولانا سے زیادہ اس حقیقت کا کون آشنا تھا کہ کشمیر پر ہندوستان نے غاصبانہ قبضہ استصواب رائے عامہ کے وعدہ پر کیا تھا، جوناگڑھ کی سرزمین پر ہندوستانی فوجیں معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر پہنچی تھیں، حیدر آباد سے نہرو اور پٹیل نے معاہدہ کیا تھا کہ حیدر آباد کا جداگانہ وجود قائم رہے گا، تقسیم ہند سے ایک سیکنڈ پہلے تک کانگرس کی تسلیم شدہ آل انڈیا زبان ہندوستانی (اُردو) تھی جس کی تشریح خود گاندھی جی نے یوں کی تھی۔

"ہندوستانی، یعنی وہ زبان جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے!"

لیکن تقسیم کے بعد! —— بجائے اس کے کہ کشمیر سے استصواب کا وعدہ پورا کیا جاتا اپنے یار غار شیخ عبداللہ تک کو پنڈت نہرو نے گرفتار کر لیا، جوناگڑھ کو زبردستی انڈین یونین کا حصہ بنا لیا، حیدر آباد کا جداگانہ وجود ختم کر کے اسے بمبئی، سی پی، مدراس وغیرہ میں تقسیم کر دیا، ہندوستانی (اُردو) زبان کا وجود بزور قوت ختم کر دیا، عثمانیہ اُردو یونیورسٹی زبردستی ہندی یونیورسٹی بنا دی گئی، عدالتوں سے، دفتروں سے حکومت کے ایوانوں سے اُردو کو کان پکڑ کر نکال دیا گیا، انتہا یہ ہے کہ اسٹیشنوں پر سے اُردو حروف کھرچ دیے گئے —— حالانکہ اُردو پاکستان کی زبان نہیں تھی، ہندوستانی تھی اور جس ہندی زبان کو اس کی جگہ دی گئی ہے وہ اب تک زیر تعمیر ہے۔

ان عنوانات پر مولانا کی خاموشی ان کے اختلاف کی دلیل ہے۔ مولانا کو چاہیے تھا کہ وہ ان مباحث پر بھی گفتگو کرتے، شاید ان مباحث پر انہوں نے خاموشی کو اس لیے ترجیح دی کہ وہ براہ راست پٹیل یا پنت کے بجائے جواہر لال پر پڑتی تھی اور مولانا کی کمزوری کا دوسرا نام جواہر لال تھا انہوں نے جواہر لال کے خلاف اگر کچھ کہا بھی ہے تو بہت رک رک کر، دب دب کر، بہت مختصر طور پر، شاید اس لیے کہ جواہر لال ان کے دوست ہی نہیں محبوب بھی تھے، مولانا دلّی میں بیٹھے تھے، ان کا ادب عالیہ لاکھ داغ کو خاطر میں نہ لاتے لیکن کبھی کبھی تو وہ جہان آباد کا آخری شاعر مولانا کی ترجمانی بھی کر جاتا تھا۔

یار کو پاس نزاکت دل ناشاد سے ہے
نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مولانا کے جو صفحات فی الحال تیس سال کے لیے میوزیم میں نظر بند

ہیں وہ انہی مباحث پر مشتمل ہوں، لیکن
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک؟

ترجمہ اور استدراک شروع کرنے سے دو روز پہلے چودھری محمد علی صاحب سابق وزیر اعظم پاکستان سے میری ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو میں (INDIA WINS FREEDOM) کا ذکر چھڑ گیا، میں اپنا خاکہ جب ان کے علم میں لایا تو انہوں نے بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا، اس حوصلہ افزائی نے یہ کام اور جلدی کرا دیا۔

میں نے یہ کام ۸ رمئی ۱۹۵۹ء کو شروع کیا تھا، آج ۳ رجون کو کہ رات کے پونے بارہ بجے ہیں یہ آخری صفحہ لکھ رہا ہوں —— والحمد اللہ علی ذالک!

رئیس احمد جعفری
۸۹۔ ٹیگور پارک۔ لاہور

---

(۲)

کانگرس اور اقلیتیں

نریمان سے ناانصافی مسٹر نریمان سے جو ناانصافی ہوئی اس سے قطع نظر کانگرس نے اپنے اصول پر قائم رہنے کی پوری پوری کوشش کی۔ ایک مرتبہ جب (صوبوں میں کانگرسی) وزارتیں قائم ہو گئیں، تمام اقلیتوں کے لیے انصاف حاصل کرنے کا پورا پورا بندوبست کر دیا گیا۔ (ص ۲۱)

کانگرس نے اقلیتوں پر ظلم نہیں کیا یہ پہلا موقع تھا کہ کانگرس نے ملک کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری قبول کی تھی، یہ کانگرس کے لیے امتحان کی گھڑی تھی، قوم یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ کانگرس کی تنظیم کس طرح اپنی قومی حیثیت کو برقرار رکھتی ہے۔

مسلم لیگ کا پراپیگنڈہ کانگرس کے خلاف مسلم لیگ کا سب سے بڑا پراپیگنڈائی حربہ یہ تھا کہ کانگرس صرف نام کی نیشنل ہے۔ عام طور پر کانگرس کو بدنام کرنے پر قناعت نہ کر کے مسلم لیگ نے یہ بھی پروپیگنڈا کیا کہ کانگرسی وزارتیں اقلیتوں پر بے پناہ مظالم توڑ رہی ہیں۔ میں نے ایک کمیٹی کی تشکیل کی جس نے ان تمام الزامات کی تحقیقات کی جو مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ کانگرسی وزارتوں کے نامنصفانہ سلوک پر مبنی تھے، میں ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ تمام الزامات قطعی طور پر بے بنیاد تھے، بالکل یہی خیال وائسرائے اور صوبہ جاتی گورنر کا بھی تھا چنانچہ لیگ نے جو (مظالم کانگرس کی) رپورٹ (جو پیر پور کمیٹی کے نام سے مشہور ہے) [illegible]

اس نے سمجھدار طبقہ کو ذرا بھی متاثر نہ کیا۔ (۱) (صفحہ ۲۱، ۲۲)

میں استعفیٰ دے دیتا

جب کانگرس نے وزارت قبول کی تو ایک پارلیمانی بورڈ قائم کیا گیا جس کا کام یہ تھا کہ کانگرسی وزارتوں کے کام کی نگرانی کرے اور پالیسی کے معاملات میں ہدایات دے۔ یہ بورڈ سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مجھ پر مشتمل تھا۔ اس طرح متعدد صوبوں بنگال، بہار، یوپی، پنجاب، سندھ اور سرحد کا میں انچارج قرار پایا۔ ہر وہ واقعہ جو فرقہ وارانہ نوعیت رکھتا تھا میرے سامنے ضرور آتا تھا لہٰذا ذاتی معلومات اور ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ میں کہہ سکتا ہوں کہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے جو الزامات مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں پر کانگرسی مظالم کے سلسلہ میں عائد کیے تھے وہ قطعی طور پر غلط تھے۔ ان الزامات میں اگر ذرا بھی صداقت ہوتی تو میں ناانصافی کے تدارک کی پوری کوشش کرتا۔ یہ ایسا اہم مسئلہ تھا کہ ضرورت ہوتی تو استعفا دینے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ (۲) (ص ۲۲)

---

(۱)

"ذاتی معلومات کی بنا پر" مولانا نے جو تردید فرمائی ہے کیا وہ واقعات و حقائق سے دور کا بھی تعلق رکھتی ہے؟ اگر کانگرس کا سلوک، مسلم اقلیت اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ ایسا ہی منصفانہ اور روادارانہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے اور اقلیتیں اس کے خلاف محاذ قائم کرلیں اور حد یہ ہے کہ اچھوتوں کا زعیم کبیر مایوس اور دل برداشتہ ہو کر، اپنا مذہب ہی بدل دیتا، یعنی بدھ مت اختیار کر کے ایک ناقابلِ فراموش احتجاج کی مثال قائم کرجاتا۔

مزید حیرت اس پر ہے کہ مولانا سب کچھ جانتے ہوتے انجان بن گئے ہیں!

(۲)

کانگرس کے ہر رہنما کا یہ دعویٰ کہ وہ ایک غیر متعصب اور خالص جمہوری جماعت ہے لیکن

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

عمل سے کانگرس نے ہمیشہ اس دعوے کے خلاف ثبوت دیا!

نریمان کا واقعہ

بمبئی کے مسٹر نریمان پارسی جماعت کے وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے کانگرس کی خاطر، قید و بند کے مصائب برداشت کیے اور بے انتہا

مصائب سے دوچار ہوتے لیکن ان کی جبین استقامت پر کبھی شکن نہیں آئی، وہ پوری مستعدی اور وفاداری سے کانگرس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں جب صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے وہ کانگرس (صوبہ بمبئی) کے صدر تھے آئین و دستور کا تقاضا یہ تھا کہ وہی بمبئی کے پہلے وزیراعظم بنتے۔ گورنر بمبئی نے اسی خیال سے کہ وہ صوبہ کانگرس کے صدر، اور اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے لیڈر ہیں، انہیں انٹرویو کے لیے طلب کیا لیکن دفعتہً مسٹر ولبھ بھائی پٹیل نے بازی اُلٹ دی۔ نریمان کے مقابلہ میں نسبتاً غیر معروف شخص مسٹر کھیر کو کانگرس پارٹی کا لیڈر منتخب کرایا اور وہی بمبئی کے وزیراعظم بن گئے۔ بتایا جائے اگر یہ تعصب نہیں تھا تو کیا تھا؟

ڈاکٹر کھرے کا انجام

ڈاکٹر کھرے سی پی کے پہلے کانگرسی وزیراعظم تھے، ان کی قابلیت اخلاص اور قربانیوں کا ہر کانگرسی معترف تھا لیکن جب ان کی کانگرس ہائی کمان، یعنی مسٹر پٹیل سے ان بن ہوئی تو انہیں وزارت عظمیٰ سے الگ کر دیا اور ان کی جگہ مسٹر راوی شنکر شکلا جن کی مہاسبھائی ذہنیت ہر شخص کے علم میں ہے وزیراعظم بنا دیے گئے۔

بوس کی درگت

مسٹر سوبھاش چندر بوس پہلی مرتبہ اس لیے ۱۹۳۸ء میں کانگرس کے صدر بن گئے کہ گاندھی جی کی مرضی یہی تھی۔

۱۹۳۹ء میں کانگرس کے عام ممبروں کی متفقہ رائے کے بعد صدر منتخب ہو جانے کے باوجود انہیں مستعفی ہو جانا پڑا، اس لیے کہ گاندھی جی ان سے تعاون اور اشتراک عمل کے لیے تیار نہیں تھے حالانکہ مسٹر بوس کانگرس کے صدر تھے اور گاندھی جی کانگرس کے چار آنے والے ممبر بھی نہیں تھے۔

یوسف شریف کا حشر

سی پی میں مسٹر یوسف، بیرسٹر، مسلم لیگ کو چھوڑ کر مسلم قوم سے غداری کر کے مسلمانوں کی عام اور ہمہ گیر مخالفت برداشت کر کے کانگرس میں تشکیل وزارت کے وقت (۱۹۳۷ء میں) شریک ہوئے اور کانگرس نے انہیں وزیر بنا بھی لیا، لیکن ان کی وزارت قائم نہ رہ سکی، انہیں صلۂ وفا یہ ملا کہ وہ ایک ہندو مہاسبھائی سابق جج ہائی کورٹ سر من متھ ناتھ مکرجی کی عدالت سے بری ہونے کے باوجود کانگرسی رہنے کے قابل نہ سمجھے جا سکے انہیں الگ

کر دیا گیا اور ان کے بعد کوئی غدار مسلمان کانگرس کو نہیں ملا۔ لہٰذا بغیر کسی مسلمان وزیر کے کانگرس کی وزارت قائم رہی۔ مسٹر یوسف شریف کا واقعہ کانگرس کی تاریخ میں ظلم وستم کا ایک نہایت دردناک اور تکلیف دہ واقعہ ہے اس لیے ہم اسے ذرا تفصیل کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

یہ ایک مسلّمہ اور ہر جگہ رواج پذیر قدیم معمول ہے کہ سزا یافتہ مجرمین حکومت کے پاس سزا کی معافی یا تخفیف کے لیے رحم کی درخواست کرتے ہیں اور حکومت زیر دفعات ۴۰۱، ۴۰۲ ضابطہ فوجداری اپنے اختیاراتِ رحم کو استعمال کر کے ملزم کو معافی یا سزا میں تخفیف کا حکم دیتی ہے یا درخواست نامنظور کر دیتی ہے۔ ہر سال اسی طرح کے سینکڑوں واقعات ہوتے ہیں۔ کانگرسی کابینہ کے پہلے وزیرِ عدالت مسٹر شریف کے پاس جولائی ۱۹۳۷ء سے مارچ ۱۹۳۸ء تک دو سو تریسٹھ درخواستیں رحم کی آئیں۔ انہوں نے صرف ۲۰ درخواستوں کے سلسلہ میں اپنے اختیاراتِ رحم کو استعمال کیا۔ ان بیس فائدہ پانے والوں میں سترہ مسلمان ہیں (ملاحظہ ہو روئداد سی۔ پی اسمبلی بابت ۲۹ مارچ ۱۹۳۸ء جلد ۳ صفحات ۱۰۱۳، ۱۰۱۸) جن کے حق میں اختیاراتِ رحم کو استعمال کیا۔ ان میں طرح طرح کے مجرم ہیں۔ قتل کے مجرمین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان درخواست کنندوں میں سے وٹھو، گنگو اور عبدالرزاق (دو ہندو اور ایک مسلمان بھی تھے جنہیں ایک چودہ سالہ لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کی اعانت میں دو دو سال کی سزا ہوئی تھی، مسٹر شریف نے ان کی درخواست کے سلسلہ میں یہ رائے قائم کی کہ چونکہ عدالت نے یہ امر تسلیم کیا ہے کہ لڑکی اگرچہ قانوناً نابالغ تھی لیکن آوارہ مزاج تھی اور واقعہ متعلقہ سے پہلے مقاربتِ جنسی کی لذت سے پوری طرح آشنا ہو چکی تھی۔ نیز مقدمہ کے سلسلہ میں ان ملزمین کو جتنی پریشانی اور زیرباری کا سامنا ہوا وہ ایک مزید سزا ان کے لیے ہوئی ہے اس لیے انہیں کافی سبق مل چکا ہے اور ان کی سزا بجائے دو سال کے اگر ایک سال کر دی جائے تو چنداں حرج نہیں۔ ان دو ہندو اور ایک مسلمان مجرمین کی سزا میں تخفیف کے بعد اسی مقدمہ میں سزا یافتہ ملزم ظفر حسین کی درخواستِ رحم بھی آئی جنہیں تین سال کی قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی تھی۔ مسٹر شریف نے اس درخواست پر انہیں واقعات کے پیش نظر جو اسی مقدمہ کے تین دیگر ملزموں کی سزا میں تخفیف کے محرک ہوئے تھے، ظفر حسین کی سزا بھی تین سال سے گھٹا کر ایک سال کر دی

مگر جرمانہ کی سزا بحال رہنے دی۔ ظفر حسین کی سزا میں تخفیف کیا ہوئی کہ نہ صرف سبھائی بلکہ بعض کانگریسی ہندو حلقہ میں بھی ایک تہلکہ مچ گیا۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ ظفر حسین کے ساتھ رحم کیے جانے سے پہلے کسی مجرم کی رعایت پر کوئی اعتراض نہ کیا گیا، بلکہ جب اسی مقدمہ اور اسی جرم کے سزا یافتہ دو ہندو مجرمین مسٹر شریف کے تخفیف کے حکم کی بدولت رہا ہوئے تب بھی کوئی اعتراض یا شور ہنگامہ نہیں ہوا لیکن جب ظفر حسین کی سزا میں تخفیف کی گئی تو ہندو حلقوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کانگریس ہائی کمان نے باوجود اس امر کے کہ صوبہ کی کانگریسی اسمبلی پارٹی مسٹر شریف کے فعل کو جائز قرار دیتے ہوئے ان پر اعتماد کا ریزولیشن پاس کر چکی تھی، ہندوؤں کی ایک ٹولی کے شور کو ہر طرح قابلِ اعتماد سمجھا اور مسٹر شریف کے خلاف ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کر دیا۔ اس سلسلہ میں بھی دو باتیں قابلِ تذکرہ ہیں۔ حاکم سر من متھو ناتھ مکرجی کو بنایا گیا جو کلکتہ ہائی کورٹ کے سابق جج اور غیر کانگریسی ہونے کے علاوہ ہندو مہا سبھا سے گہرے طور پر وابستہ تھے۔ دوسرے یہ کہ انہیں صرف اس امر پر تحقیقات کرنے کی ہدایت کی گئی کہ ظفر حسین کی سزا میں تخفیف کرنے میں مسٹر شریف نے بد دیانتی، جانبداری یا فرقہ پرستی حدِ اختیار سے تجاوز یا کسی اور قابلِ اعتراض اثرات سے کام لیا ہے یا نہیں۔ دوشو یا گنگو کے رہائی کے معاملہ کو قابلِ تحقیقات نہ سمجھا گیا بلکہ صرف ظفر حسین کے معاملہ کو۔ بہرحال کمیشن نے تحقیقات شروع کی۔ ہندوؤں نے کمیشن کے پاس ہر طرح متعلق کاغذات پیش کیے۔ ہندوؤں سے رکنِ کمیشن نے کہا کہ جو کچھ بھی ثبوت اس سلسلہ میں تم پیش کر سکتے ہو لاؤ۔ سر من متھو ناتھ نے کسی شہادت یا ثبوت کو اس بنا پر کہ یہ غیر متعلق ہے پیش کیے جانے سے نہیں روکا۔ انہوں نے الزام لگانے والی جماعت کو اس کا پورا موقعہ دیا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہیں۔ سردار پٹیل نے خود بھی ایک تحریر مسٹر شریف کے خلاف بھیجی۔ الزام لگانے والوں کی تمام شہادتوں اور ثبوتوں اور مسٹر شریف کی صفائی کو سننے اور ان پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد سر من متھا اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسٹر شریف نے نہ تو حدِ اختیار سے تجاوز کیا ہے اور نہ کوئی فرقہ پرستی کا ثبوت موجود ہے اور نہ بد دیانتی ثابت ہے اور نہ کسی اور قابلِ اعتراض امر کو کام میں لانے کا شائبہ پایا جاتا ہے البتہ واقعات مقدمہ کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مقدمہ میں تخفیف کی رائے قائم کرنے میں ان کی قوتِ فیصلہ نے غلطی کی۔ واضح رہے کہ

کمیشن کو انہیں امر کا مجاز نہیں بنایا گیا تھا کہ وہ اس بات کی بھی تحقیقات کرے کہ واقعات مقدمہ کے پیش نظر کیا رائے پیش کی جانی چاہیے تھی بلکہ صرف اس امر کی تحقیقات کا مجاز بنایا گیا تھا کہ مسٹر شریف کا طرز عمل مقدمہ سے قطع نظر کسی خارجی قابل اعتراض اثرات کے تحت تو نہیں تھا۔ باوجود اس کے کہ جن عنوانات کے تحت تحقیقات کرنے کا مجاز ہائی کمان نے کمیشن کو بنایا تھا، ان عنوانات کے سلسلہ میں کمیشن نے مسٹر شریف کے خلاف کسی الزام کا ثبوت نہیں پایا، کمیشن نے اپنے حد اختیار سے تجاوز کرتے ہوئے ایک ایسے معاملہ پر رائے دی جس کا اسے مجاز نہیں بنایا گیا تھا، پھر قوتِ فیصلہ کی غلطی، کس بشر اور کس انسان سے سرزد نہیں ہوتی؟ یہ کوئی ایسا جرم نہیں تھا کہ جس کے باعث کانگرس کا سارا انتظام درہم برہم ہو جاتا کسی وزیر کا ایک ملزم کی سزا تین سال سے کم کر کے ایک سال کر دینا ایک بہت ہی معمولی بات ہے۔ ایسی رائے قائم کرنے میں بلا کسی اثر سے متاثر ہوتے قوتِ فیصلہ سے غلطی کا صدور اگر کمیشن کی رائے درست تسلیم کر لی جائے، کسی منصف مزاج کے نزدیک ایسا قصور نہیں قرار پا سکتا کہ اسے وزارت کے قابل نہ سمجھا جائے۔ لیکن ہائی کمان نے اس قوتِ فیصلہ کی غلطی کو بھی ناقابل معافی جرم تصور کیا اور مسٹر شریف کو وزارت سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ اپنوں کو چھوڑ کر غیروں سے رشتہ جوڑنے کا خمیازہ انہیں مل گیا۔"

کانگرس کی اصول پرستی

کٹک کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر کھرے سابق کانگرسی وزیر اعظم سی، پی و سابق ممبر ایگزیکٹو کونسل وائسرائے ہند نے ۳۰ جنوری ۱۹۴۵ء کو کہا:۔

"میں پچیس برس تک کانگرس میں رہ چکا ہوں، اور اس پر مجھے فخر ہے، لیکن کانگرس کی سیاست میں اب یکسانیت نہیں رہی مثلاً جنگ کے سوال پر اس نے عہدے چھوڑ دیے اور اسمبلیوں کا بائیکاٹ کر دیا، لیکن اب مقصد حاصل کیے بغیر کانگرسی اسمبلی میں شریک ہونے لگے اور منتخب کمیٹیوں میں بھی شریک ہونے لگے میرے چند کانگرسی دوستوں نے کانگرسی نظر بندوں کو پیرول پر رخصت دلانے اور رہائی دلانے میں مجھ سے مدد لی اگر وہ پھر آئینی طریقوں کو پسند کرنے لگے تو میں اس پر خوش ہوں گا۔"

ایک لرزہ خیز معمّہ

کانگریس کے دورِ حکومت میں مسلمانوں پر کیا گزری؟ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا اور کس طرح انہیں ہدفِ ستم بنایا گیا، یہ بڑی طویل داستان ہے اس داستان کا ایک لرزہ خیز حصّہ درج ذیل ہے،

اگر کانگریسی دور کی تمام ظالمانہ عجوبہ کاریوں سے قطع نظر کر بھی لیا جائے تو صرف چاند اور بسوا سی۔ پی کا ایک ہی واقعہ انسانیت سوز بربریت کا مرقع ہے بلکہ اس سے اس امر کا بھی پورا ثبوت مہیا ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کو ایذا پہنچانے، ذلیل کرنے، کچلنے اور تباہ کرنے میں وزیر اعظم سے لے کر گاؤں کے پٹیل تک اور صوبہ کانگرس کمیٹی کے صدر سے لے کر معمولی کانگرسی ممبر تک کس طرح ہم آواز اور متحد ہو کر حکومت کی ساری مشینری کو حرکت میں لا کر اپنے وحشیانہ جذبات بغض و انتقام پسندی کی تسکین کا سامان پیدا کر سکتے ہیں۔

قرآن کی غزل

اس قصبہ کی کل آبادی تین ہزار کے قریب ہے جس میں مسلمانوں کی آبادی مرد عورت بچے ملا کر ایک ہزار کے قریب ہے۔ یہاں صرف چند گھر کھاتے پیتے مسلمانوں کے ہیں جو کچھ کھیت وغیرہ رکھتے ہیں ورنہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مزدور پیشہ ہے جو ہندوؤں کے کھیتوں میں عموماً کام کرتے ہیں۔ یہاں ۱۹۲۶ء میں مسجد کے سامنے باجہ بجانے کے سلسلہ میں بلوا ہوا تھا جس میں پولیس نے صرف مسلمان کا چالان کیا تھا اور انہیں سزائیں ہو گئی تھیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے خلاف پولیس سے نا اُمید ہو کر استغاثہ دائر کیا تھا جس میں مسٹر اسٹیلین ہوپ سب ڈویژنل مجسٹریٹ بلڈانہ نے ہندوؤں کو سزائیں دے دی تھیں مگر اپیل پر راؤ صاحب چٹنولیس نے جو اس وقت ایڈیشنل سیشن جج تھے۔ تمام ہندوؤں کو بری کر دیا۔ مسلمانوں نے جن ہندوؤں کے خلاف اس وقت استغاثہ دائر کیا تھا ان میں سے دو یہ تھے (۱) جگدیو پٹیل ہندوؤں کی مسلم آزار ٹولی کا سرغنہ اور (۲) لکشمن جو اس وقت اس گاؤں کا پٹیل ہے اس وقت کا عناد اس ٹولی کے دلوں میں ہمیشہ رہا۔ جگدیو پٹیل نے اس گاؤں میں ایک مرہٹی پریس قائم کیا اور ۱۹۱۹ء میں ایک آزار کتاب موسوم بہ "قرآن کی غزل" لکھی جس میں مسلمانوں کے مذہب، خدا، پیغمبر، ان کی مقدس کتاب کا

مضحکہ اڑایا گیا۔ یہ شخص ان غزلوں کو ملکاپور، بازار لبوا اور دیگر مقامات پر چار پانچ لڑکے ساتھ لے کر گا گا کر پڑھتا تھا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں پولیس نے اس سلسلہ میں زیر دفعہ ۲۹۵ اس کا چالان کیا اور اسے دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی اس کی اشتعال انگیزی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

مارچ سنہ ۱۹۳۹ء کو سی۔ پی کے ایک اور مقام میں بھی فساد کرا کے مسلمانوں کو کچلنے کی ترکیب پر عمل کیا گیا۔ جب محرم میں تعزیہ کا جلوس نکلا تو اس پر گوبر اور غلیظ کوڑا پھینکا گیا۔ مسلمانوں نے ضبط اور تحمل سے کام لیا پولیس کو اطلاع دی مگر پولیس حسب دستور شرارت کرنے والے کا پتہ نہ چلا سکی۔ دوسری مرتبہ جب مسلمانوں نے تعزیہ کا جلوس ہر سال رواج کے مطابق نکالنا چاہا تو ٹھیک اس جلوس کے وقت جو عموماً شب کو نکلتا ہے ڈنڈی کا جلوس بھی نکالنے کی تیاریاں کی گئیں۔ مسلمانوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ بلوہ کرانے کا پیش خیمہ ہے تعزیوں کا جلوس نہیں نکالا۔ اس موقع کے دستیاب نہ ہونے نے جگدیو پٹیل اور اس کے ساتھیوں کی آتش فساد کو اور تیز کر دیا۔ ۵ مارچ کو مسلمانوں کی لائبریری میں انسانی غلاظت پھینکی ہوئی پائی گئی۔ پولیس کو اطلاع دی گئی۔ مروجہ پالیسی کے مطابق کوئی کارروائی نہ ہوئی۔

جگدیو پٹیل گزشتہ انتخاب میں کانگریس کا مخالف تھا۔ کانگریس کے برسر اقتدار آتے ہی اس کے ساتھ کانگریس نے مفاہمت کر لی۔ اسے ملکاپور کانگریس کمیٹی کا صدر بنا دیا گیا اور ملکاپور لوکل بورڈ کا پریسیڈنٹ بھی۔

مسلم آزار نعرے

۱۷ مارچ کو یہ جگدیو پٹیل اپنے چند (تقریباً آٹھ نو) ساتھیوں کے ساتھ اسٹیشن سے اتر کر بستی کی طرف چلا۔ جب وہ ٹولی مسجد کے پاس پہنچی تو مسجد میں چند مسلمانوں کو بیٹھا دیکھ کر مسلم آزار اور دلخراش نعرے لگانے شروع کر دیے اور مسجد پر گوبر اور گلال پھینکے۔ ساڑھے پانچ بجے شام کا وقت تھا اور چار مسلمان مسجد میں تھے۔ ان مسلمانوں کے معترض ہونے پر جگدیو اور اس کی پارٹی نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے مدافعت کی ہاتھ چلائے۔ اس جھگڑے میں بعض مسلمان زخمی ہوئے اور جگدیو کی پارٹی کے بھی چند لوگ مجروح ہوئے۔ اتفاق سے جگدیو کو زیادہ چوٹیں آئیں، اور اسی روز شب کو ناندورہ ہسپتال میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس باہمی جھگڑے اور جگدیو پٹیل کے زخمی ہونے کی اطلاع اسٹیشن ماسٹر بسوا چاندرو نے بذریعہ فون نانڈورہ، ملکاپور اور دیگر مقامات پر کر دی۔ یہ گاؤں نانڈورہ تھانے کے اندر ہے اس وقت تھانے دار ایک مسلمان نظام الدین تھے۔ وہ اطلاع ملتے ہی ایک مال گاڑی پر سوار ہو کر بسوہ پہنچے، چار گھنٹے بعد تحصیلدار، ملکاپور اور سرکل انسپکٹر پولیس بھی بسوہ آ گئے۔ ایک مہابھائی وکیل مسٹر کلکرنی جو کھام گاؤں سے ملکاپور جا رہے تھے بسوہ اسٹیشن پر واقعہ کی اطلاع سن کر اتر پڑے یہ واقعہ کے آدھ گھنٹہ بعد ہی بسوہ پہنچ گئے تھے۔ جگدیو پٹیل کو زخمی ہونے کے بعد ایک مقامی اسکول میں رکھا گیا تھا۔ مسٹر کلکرنی اور دیگر حکام جو آ چکے تھے وہیں جمع تھے، تقریباً تین گھنٹہ بعد جگدیو کو ایک مال گاڑی کے ذریعہ نانڈورہ بھیجا گیا جہاں اسپتال پہنچنے کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔ دوسرے زخمیوں کو جن کی تعداد تقریباً آٹھ تھی، ایک بجے رات کو پارسل ٹرین کے ذریعہ نانڈورہ بھیجا گیا۔ مسلمان زخمیوں کی کوئی پروا نہ کی گئی۔

دراندازیاں

زخمیوں کو اور ان کے ہمدردوں کو پورا موقع دیا گیا کہ اپنی خواہش کے مطابق صلاح مشورہ سے افسانہ تیار کر لیں، ایک ہندو انسپکٹر مسٹر اتھاوڑے نانڈورہ بھیجے گئے اور بعض زخمیوں کا بیان پہلی مرتبہ انہوں نے دو بجے رات کو لیا۔ یعنی واقعہ کے تقریباً نو گھنٹے بعد اور بعض زخمیوں کے بیانات دوسرے روز بعد دوپہر لیے گئے تاکہ ایک کے بیان میں کوئی خامی ہو تو دوسرے کے بیان میں وہ دور ہو جاتے۔

واقعہ کے روز ہی یعنی ۱۷ مارچ کو مسٹر صوبہ دار اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کھام گاؤں اور مسٹر پٹیل آئی سی ایس سب ڈویژنل مجسٹریٹ کھام گاؤں بھی ایک بجے رات کو بسوہ پہنچے۔ اتنے بے شمار حکام کی آمد کا سبب یہ ہوا کہ اطلاع ملنے کے بعد ملکاپور، کھام گاؤں اور نانڈورہ کے کانگریسیوں نے تمام حکام اور اصحاب اختیار کو ادھر ادھر تار اور ٹیلیفون اس کثرت سے دیے کہ وہ لوگ بھی گھبرا گئے کہ شاید بہت ہی بڑا بلوہ ہوا ہے یا ۱۸۵۷ء جیسا غدر ہو گیا ہے۔ یوں بھی کانگریسی عہدے داروں کے "تار" پر توجہ نہ کرنا وزارت کی سرزنش اور انتقام کو دعوت دینا تھا۔ سب ڈویژنل مجسٹریٹ مسٹر پٹیل نے جو ایک تجربہ کار آئی سی ایس افسر ہیں اور اس سب ڈویژن کے سب سے بڑے حاکم اور انچارج تھے دو بجے رات کو یعنی اپنے آنے کے چار گھنٹے اور واقعہ کے نو گھنٹے بعد جو تار ڈپٹی کمشنر بلڈانہ کو دیا

بہت ہی اہم اور قابل غور ہے۔ اس تار سے صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اصل واقعہ کیا تھا۔ اور بل
میں سازش کے ذریعہ کیا سے کیا بنایا گیا۔ تار کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"چند مسلمانوں نے جگدیو پر بزدلانہ حملہ کیا۔ کوئی فرقہ وارانہ کشیدگی نہیں ہے کوئی
فرقہ وارانہ حملہ نہیں ہے۔ ملکاپور اور کھام گاؤں میں اس کے اثرات کی نگرانی رکھی جائے گی"

تار سب ڈویژنل مجسٹریٹ کھام گاؤں بنام ڈپٹی کمشنر بلڈانہ از بسوہ مورخہ ۱۷ر مارچ سنہ ۱۹۳۹ء۔

یہ تار ڈپٹی کمشنر بلڈانہ کو ۱۸ر مارچ سنہ ۱۹۳۹ء کو ساڑھے ۱۰ بجے دن کے وقت ملا۔ اس
میں ڈپٹی کمشنر کو بھی زحمت دینے کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی۔

مسلمانوں کی گرفتاری

سب ڈویژنل مجسٹریٹ مسٹر پٹیل نے دوسرے روز صبح (۱۹ سنہ ۱۹۳۹ء) اپنی تحقیقات کے بعد چار مسلمانوں کو گرفتار ہونے کا
حکم دیا۔ اس روز سرکل انسپکٹر نے اسٹیشن پر ان دو ہندو وکیلوں سے بھی ملاقات کی جو واقعہ
کے روز شب کو زخمیوں کے ساتھ ناندورہ گئے تھے اور لوگوں کے آنے جانے اور سرگوشیوں
کا سلسلہ جاری رہا۔ بطور احتیاط مسلمان سب انسپکٹر کو ایک معمولی بہانہ بنا کر ناندورہ بھیج دیا
گیا گرفتاری سے پہلے نہ ان کا کوئی بیان لیا گیا نہ صفائی پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔ اب
بسوہ میں سب کے سب ہندو حکام رہ گئے۔ ۱۲ بجے دن تک کوئی گرفتاری نہیں ہوئی
سرکل انسپکٹر نے ناندورہ فون کیا کہ سید اکرام الدین کو بسوہ لے آیا جائے۔ سید اکرام الدین
بسوہ کے ایک معزز، متمول اور بااثر باشندے ہیں اور ناندورہ میونسپل کمیٹی کے منتخب شدہ
ممبر ہیں۔ یہ سیاسی اعتبار سے کانگرس کے مخالف تھے اور میونسپل الیکشن میں کانگرسی
امیدوار کو شکست دی تھی۔ اکرام الدین صاحب سب انسپکٹر کے ساتھ بسوہ آگئے۔

۱۸ر مارچ کو دوپہر کے بعد سرکل انسپکٹر مسٹر تیواری نے قصبہ کے ممتاز اور بااثر اصحاب
کو جن میں سید اکرام الدین کے بھائی سید عین الدین اور محمد علی جمعدار تھے بلوایا اور
اسکول میں بیٹھنے کو کہا اور مع ان کے چھ معزز اور بااثر مسلمانوں کو گرفتار کر لیا۔

ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈپٹی کمشنر بھی اسی روز بعد دوپہر بسوہ پہنچ گئے
مسٹر اکرام الدین بھی اسی ٹرین سے بسوہ آ گئے، آتے ہی ان کو بلوایا گیا اور گرفتار کر لیا
گیا۔ واقعہ کے روز کچہری برخواست ہونے تک مسٹر اکرام الدین بلڈانہ میں تھے اور
واقعہ کے وقت ان کا بسوہ پہنچنا امر محال تھا۔ ان کے بلڈانہ میں ہونے کی ڈپٹی کمشنر سے رپ

اور کچہری کے دیگر اہل کاروں سے تصدیق بھی دوسرے روز کرلی گئی، مگر پھر بھی انہیں گرفتار ہی رکھا گیا۔

پنڈت شکلا کا کردار

گیارہ گرفتار شدہ مسلمانوں کو کھام گاؤں بھیج دیا گیا۔ ایک ملزم محمد عقیل بیمار تھے انہیں کرسی پر بٹھا کر سوار کیا گیا مگر ہتھکڑی نہیں کھولی گئی۔ پنڈت شکلا اس ضلع کے ممبران اسمبلی کے ساتھ ملکاپور آتے۔ انہوں نے یہاں مقامی کانگرسیوں اور آریہ سماجیوں سے گفتگو کی۔ یہ بسوہ ۱۸ر مارچ کی صبح کو پہنچے تاکہ متوفی جگدیو کی تعزیت میں شرکت کریں۔ متوفی کا لاشہ وزیر اعظم کی آمد کے انتظار میں جلایا نہیں گیا تھا۔ جگدیو راؤ کی ارتھی کا جلوس اسی جگہ سے نکالا گیا جہاں وزیر اعظم ٹھہرے ہوتے تھے۔ پنڈت شکلا ½ ۱ بجے دن کو نامدورہ واپس ہوگئے اور مسٹر رادھا کشن اور ان کی پارٹی کے ساتھ کھانا کھایا۔ یہ لوگ مسلمانان بسوہ کے مسلمہ لیڈر سید اکرام الدین کے زبردست مخالفین میں سے تھے۔ یہ لوگ شام کو پھر کھام گاؤں آتے، اور رات کا کھانا اپنے دن کے میزبانوں کے ساتھ کھا کر اسی روز ۱۰ بجے رات کو روانہ ہوگئے۔

اگرچہ جس علاقہ میں واقعہ ہوا تھا اس کے تھانیدار ایک مسلمان تھے اور اس ضلع کے سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی مسلمان تھے مگر ان کو تحقیقات میں حصہ نہ لینے دیا گیا۔ تحقیقات کا کل کام اس سرے سے اس سرے تک خالص ہندو افسروں کے ہاتھ میں رکھا گیا۔

مسٹر بیانی کا کارنامہ

آنریبل مسٹر برج لال بیانی جو کونسل آف سٹیٹ کے ممبر اور برار صوبائی کانگرس کمیٹی کے صدر ہیں اور اس صوبائی بورڈ کے بھی ممبر ہیں جس کا کام وزراء پر نگرانی رکھنا ہے۔ ۲۹ر مارچ کو دہلی سے بسوہ پہنچے تاکہ متوفی کے اعزا کو پرسا دیں۔ انہوں نے متوفی کے کارکنوں کو سراہا اور متوفی کی نیک یادگار قائم کرنے اور ان کے اعزا کی امداد کرنے کے لیے فنڈ کی اپیل کی۔

وزیر اعظم مسٹر شکلا نے ناگپور پہنچ کر جگدیو کی موت کے سلسلہ میں تحریکِ التوا کے مباحثہ کے موقع پر ۲۳ر مارچ کو اسمبلی میں قاعدہ کے بالکل خلاف ایک بہت ہی زہریلا اور جانبدارانہ بیان دیا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ وہ بسوہ میں صرف تین گھنٹے لبسے اور نامدورہ اور کھام گاؤں کے قیام کو ملا کر بلڈانہ ضلع کے اندر بارہ گھنٹے ٹھہرے۔ اس وقفہ میں انہوں نے حکام کے علاوہ کانگرسی اور آریہ سماج لیڈروں

اور مسلمانوں کے مخالفوں سے گفتگو کی لیکن تحقیقات مکمل ہونے سے پہلے انہوں نے رائے قائم کر لی اور اسمبلی میں یہ بیان دیا کہ ۱۔ جگدلیو کا قتل وحشیانہ اور بزدلانہ تھا، ۲۔ اسے مسلمانوں نے قتل کیا، ۳۔ اس کا قتل پہلے سے طے شدہ سازش کا نتیجہ تھا، ۴۔ اس قتل میں تقریباً پچھتر مسلمانوں نے حصہ لیا۔ وزیر اعظم کے اس تاریخی بیان نے واقعہ کا رُخ بدل دیا۔ ہر کس و ناکس سمجھ گیا کہ وزیر اعظم کا منشا کیا ہے اور سرکاری اور غیر سرکاری متعصب ہندو پوری آزادی اور حوصلہ کے ساتھ جو عنوانات وزیر اعظم نے قائم کیے تھے اس کی کڑیاں کو جوڑنے کے لیے ثبوت مہیا کرنے میں مشغول ہو گئے۔ علاوہ وزیر اعظم کے متعدد کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو ممبروں نے انتہائی منافرت انگیز زہریلی تقریریں کیں،

ستم رانی کا ڈرامہ

۳۔ اپریل ۱۹۳۹ء کو ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے اسسٹنٹ پر میشور دیال تیواری ناگپور سے بسوہ آئے۔ سرکل انسپکٹر ملکاپور مسٹر تیواری بھی آئے ضلع بلڈانہ کے مختلف مقامات کھام گاؤں، شیوگاؤں اور جلب وغیرہ سے بہت سی پولیس ہتھکڑیوں کی کافی تعداد کے ساتھ بسوہ بھیجی گئی۔ کھام گاؤں سے ایک ہندو اسسٹنٹ کمشنر کو بھی بسوہ بھیجا گیا۔ چند اور متعدد ہندو سب انسپکٹروں کو بھی وہاں پہنچ جانے کا حکم ملا۔ اس ساری فوج کے بسوہ پہنچ جانے کے بعد ۷ اپریل ۱۹۳۹ء کو کانگرسی حکومت کی ستم رانی کا ڈرامہ شروع ہوا، گاؤں کے تمام راستوں پر پولیس تعینات کر دی گئی کہ کوئی مسلمان باہر نہ جا سکے۔ گاؤں کی ساری مسلم آبادی کو پکڑ لایا گیا۔ جمعہ کا روز مسلمانوں کی ایذا رسانی کے لیے بہت ہی موزوں سمجھا گیا۔ ان تمام مسلمانوں کو اپریل کی سخت دھوپ میں صبح سے شام تک کھڑا رکھا گیا۔ واقعہ کے پورے بائیس تئیس روز بعد ان مسلمانوں کو مختلف ہندوؤں سے شناخت کرایا گیا۔ ان شناخت کرنے والوں میں جھگڑے کے روز مجروح ہونے والا کوئی ہندو نہ تھا۔ بیمار مسلمانوں کو بھی پکڑ کر شناخت کے لیے لایا گیا۔ انہیں دن بھر کچھ بھی کھانے کو نہیں دیا گیا۔ اور ان گیارہ آدمیوں کے علاوہ جو پہلے گرفتار ہو چکے تھے مزید ایک سو چھیالیس مسلمانوں کو گرفتار کر لیا گیا ان میں بوڑھے، جوان، کم عمر، بیمار، اور معذور سب ہی تھے۔

ان تقریباً ڈیڑھ سو مسلمانوں کو رات کے وقت مقامی اسکول کے کمرے میں جس کا رقبہ ۲۰×۳۰ ہے ٹھونس دیا گیا۔ رات کو بھی انہیں کھانے کو کچھ نہیں دیا گیا، اور نہ

رشتہ داروں کو دینے دیا گیا۔ اس گرمی کے موسم میں دن بھر بھوکا پیاسا رکھ کر رات کو بھی بلا دانہ پانی رکھا گیا اور سانس گھٹنے والی کوٹھری میں بند کر دیے گئے۔ بارہ بجے رات سے اسی کوٹھری میں انہیں ہتھکڑیاں ختم ہو گئیں تو انہیں جانوروں کی طرح رسی سے باندھ کر چھوڑ دیا گیا کانگرسی حکومت نے تو پوری کوشش کی کہ فرضی کال کوٹھری کے مقابلہ میں واقعی کال کوٹھری بسوا میں قائم کر دے مگر ان مسلمانوں کی سخت جانی نے یہ مراد پوری نہ ہونے دی۔ انہیں ۹ر اپریل کی صبح کو ملکاپور سے بلڈانہ موٹر لاری میں جانوروں کی طرح بھر کر لے جایا گیا۔ انہیں چھتیس گھنٹے بھوکا پیاسا رہنے کے بعد بلڈانہ میں رات کے وقت ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سامنے کھانے کو ملا۔ ۱۴۸ میں سے ۵۳ کو لاری میں بھر کر اکولا جیل بھیج دیا گیا۔

۷ اور ۸ اپریل کی شناخت کے موقع پر بعض بیمار مسلمان دھوپ کی شدت سے نڈھال ہو گئے اور چکر آنے کے باعث انہیں تلی پر تتلیاں آنے لگیں مگر انہیں اسی طرح کھڑے رہنے پر مجبور کیا گیا۔ ان صدمات کی تاب نہ لا کر ایک غریب ۱۱ر اپریل ۱۹۳۹ء کو جنت سدھار گیا۔ ایک بیوہ ضعیفہ جس کا لڑکا جوان ہنگامہ خیز حالات میں گرفتار کیا گیا مارے صدمہ کے ۱۴ر اپریل کو دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ایک منہارن ۹ر اپریل کی صبح کو جب ان بے گناہوں کو ملکاپور لے جانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں اپنے داماد کے لیے روٹی لائی کیونکہ گزشتہ چوبیس گھنٹے سے وہ بھوکا تھا اسے روٹی نہ دینے دی گئی۔ اس کے اصرار و التجا پر ایک ہندو افسر نے کہا کہ "جب جگدیو پر حملہ ہوا تھا تب تو کہاں تھی؟ اب ہمارا راج ہے۔"

اہمسا کی حکومت

یہ واقعہ "اہمسا اور صداقت" کی حکومت کا زندہ جاوید ثبوت ہے اس واقعہ نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں غم و غصہ اور نفرت کی لہر دوڑا دی۔ ہر جگہ احتجاجی جلسے اور نفرت کی تجاویز منظور ہوئیں۔ حکومت نے یہ محسوس کیا کہ اتنی بڑی تعداد کے ملزم بنانے سے مقدمہ بالکل ہی کمزور ہو جائے گا اور گواہ کبھی اتنے زیادہ آدمیوں کو ٹھیک طور پر نہ پہچان سکیں گے۔ اس لیے ایک سو ستاون گرفتار شدہ مسلمانوں میں سے ایک سو چودہ مسلمانوں کو ہر طرح کی ایذا پہنچانے اور ایک ماہ سے زائد عرصہ جیل میں رکھنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ کم از کم یہ ایک سو چودہ ضرور بے گناہ تھے اور انہیں جو ستم سہنے پڑے اس کی سیاہی سے کانگرسی حکومت کی

پیشانی داغدار رہے گی اس کے بعد ۳۰۴ مسلمانوں کو متعدد دفعات کے تحت جس میں قتل، ضرب رسانی، بلوہ اور سازش سبھی کچھ تھا چالان کیا گیا۔ پولیس نے استغاثہ کی طرف سے ۱۰۴ گواہ پیش کیے۔ عدالت ماتحت نے تمام ملزمین کو سیشن سپرد کر دیا۔

آتشِ انتقام کانگرسی وزراء اور اصحابِ اختیار کی آتشِ انتقام گاؤں کے تمام مسلمانوں کو جسمانی ایذا پہنچانے اور کثیر تعداد کو جیل بھیج دینے سے سرد نہ ہوئی۔ بلکہ تمام کام والوں اور کمانے والوں کو جیل میں بھیجنے کے بعد حکومت نے بسوہ میں تعزیری پولیس تعینات کر دی اور اس کے خرچ کا سارا بار کئی ہزار روپیہ سالانہ کا صرف مسلمانوں پر ڈالا گیا اور ان کی وصولی کے لیے وارنٹ جاری کیے گئے کہ ان کی جائداد، مکان اور جس کے پاس نہ ہو اس کا اثاثہ ضبط کر کے خزانہ میں داخل کیا جاتے۔

تاریخی فیصلہ سیشن جج ناگپور نے سماعت کے بعد ۳۰۴ ماخوذین میں سے چھ مسلمانوں کو پھانسی چوبیس کو حبس دوام اور ایک کو سو روپیہ جرمانہ کی سزا دی۔ بقیہ کو بری کر دیا۔ فاضل سیشن جج نے اس کا مطلق خیال نہیں کیا کہ گواہ کیسے ہیں، سچے یا جھوٹے بلکہ فیصلہ میں صرف یہ اصول رکھا کہ اتنے آدمیوں نے فلاں فلاں کو پہچانا لہٰذا یہ مجرم ہے مسلمانوں کو ایسی سنگین سزائیں دینے کے باوجود کانگرسی حکومت کی ماتحت پولیس اور حکام کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کرنے سے فاضل سیشن جج اپنا قلم نہ روک سکے چنانچہ «بسوہ کی کالی کوٹھری»، کا تذکرہ کرتے ہوئے فیصلہ میں لکھا ہے کہ "یہ وحشیانہ سلوک نازی جرمنی میں قابلِ عمل ہو تو ہو مہذب برطانوی حکومت کے سائے میں ایسا کیا جانا محکمہ انتظام کے لیے ایک نہایت بدنما داغ ہے"، فیصلہ میں آپ نے یہ بھی لکھا کہ ہندو اسیروں نے رائے دینے میں فرقہ پرستانہ ذہنیت سے کام لیا ہے۔"

ہائی کورٹ ہائی کورٹ میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی گئی، مقدمہ کی پیروی کے لیے نواب صدیق علی خاں صاحب کی کوششوں کی بدولت مسٹر قاسم علاؤالدین سومجی ایم، اے، ایل، ایل، بی بار ایٹ لا بمبئی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اپیل کی سماعت ناگپور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر گلبرٹ اسٹون اور مسٹر جسٹس جزادیون بوس کے سامنے شروع ہوئی۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی سے جس وقت یہ مقدمہ ہائی کورٹ پہنچا کانگرسی حکومت وزارت کو خیرباد کہہ چکی تھی اور ایڈووکیٹ جنرل کانگرس کے

ماخوذ کردہ نہ تھے۔ مسٹر سوبھی کی پانچ روز کی ابتدائی بحث کے بعد مسٹر والٹر روٹ ایڈووکیٹ جنرل نے عدالت کے سامنے یہ بیان دیا کہ مسل کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ "ان اکتیس ملزموں سے انیس کے خلاف سازش، قتل و بلوا کا جرم ثابت نہیں ہے۔ عدالت کا وقت ضائع نہ ہو اس لیے میں پہلے ہی اس بات کی وضاحت کر دیتا ہوں کہ میں ان انیس کے خلاف جرم کے مرتکب ہونے کے متعلق زور نہیں دوں گا" ان انیس میں ایک ملزم وہ بھی تھا جس کو صرف سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی تھی اور ضمانت پر رہا تھا۔ بقیہ اٹھارہ میں سے ایک کو پھانسی اور سترہ کو حبس دوام کی سزائیں ہوئی تھیں۔ ایڈووکیٹ جنرل کے اس بیان کے بعد سوبھی نے عدالت سے یہ درخواست کی کہ ان انیس ملزمین کو ضمانت پر رہا کر دیا جانا چاہیے۔

چنانچہ عدالت نے ایک عارضی فیصلہ کے ذریعہ ان انیس ماخوذین کو ضمانت پر رہا کیے جانے کا حکم صادر کیا۔ یہ حکم مسٹر جسٹس بوس نے لکھا جس سے چیف جسٹس نے اتفاق کیا۔ فاضل ججوں نے اس حکم میں تحریر کیا کہ اپیل کی سماعت کے ابتدائی دنوں ہی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ بہت سے ملزمین کے خلاف جرم کے ثبوت کا دارومدار "باہمی سازش" کے کمزور ستونوں پر ہے۔ یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ اس مفروضہ باہمی سازش کا وجود ثابت نہیں۔ ایڈووکیٹ جنرل نے مجلس وکلا کی شاندار روایات کی صحیح پیروی کرتے ہوئے اس کا اعتراف کر لیا ہے۔ اس سے ان ملزمین کو جن کے خلاف ایڈووکیٹ جنرل نے جرم کو مشکوک مان لیا ہے۔ جیل میں رکھنا مناسب نہیں بنابریں انہیں ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

عدالت عالیہ کا فیصلہ

دس روز تک اپیل کی سماعت کے بعد ۲ر مئی ۱۹۴۰ء کو عدالت عالیہ نے اس تاریخی مقدمہ میں اپنا تاریخی فیصلہ سنایا اور تمام ماخوذین کو بے دریغ رہا کر دیا۔ مسٹر گلبرٹ اسٹون چیف جسٹس ناگپور ہائی کورٹ نے فیصلہ کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے "یہ ایک اندوہناک مقدمہ ہے۔ یہ تعریف صحیح ثابت ہوتی ہے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مقدمہ میں ۴۴ آدمی قتل کے الزام میں ماخوذ ہیں اور ایسے گواہ جن کی شہادتیں جھوٹی بنائی ہوئی یا سکھائی ہوئی ہیں یکے بعد دیگرے

شہادت دینے کو چلے آرہے ہیں۔ ان میں سے سات گواہ ایسے ہیں جو کم عمر یا بچے ہیں جنہیں شہادت دینے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ ایسے مقدمہ میں جھوٹی شہادت دینا سکھائی ہوئی شہادتوں کی بنا پر آدمیوں کو شناخت کرنا یہ بتاتا ہے کہ گواہ یا اس کو سکھانے والا دوسرے انسان کو پھانسی پر چڑھا دینے کے لیے بلا اس خیال کے کہ یہ انسان قصور وار ہے یا نہیں اپنی تمام کوششیں صرف کر رہا ہے۔ انسانی اطوار کی پستی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے مخالف کی جان لینے کی کوشش بچوں کی زبان سے دروغ حلفی کے ذریعہ کی جائے۔"

چند ہی سطر آگے چل کر جج موصوف لکھتے ہیں۔

جج کا وزیر اعلیٰ پر اعتراض

"۱۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو بسوہ میں مسلمانوں کی مسجد کے سامنے باقریب چند منٹ کے لیے ایک ہنگامہ ہوا جس میں متعدد ہندو اور مسلمان زخمی ہوئے اور ایک ہندو ان زخموں کے صدمہ سے جو اسے لگے تھے بعد میں قضا کر گیا۔ ۲۰ مارچ کو صوبائی اسمبلی میں تحریک التوا پیش کی گئی اس کے مباحثہ میں اکثر ارکان اسمبلی نے ایسی تقریریں کیں گویا یہ قطعیت کے ساتھ معلوم ہو چکا ہے کہ کس جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے اور جہاں تک ایک ممبر کا تعلق ہے انہوں نے اشارہ کیا کہ کس شخص نے قتل کے جرم کا ارتکاب کیا ہے اس مباحثہ میں اس وقت کے وزیر اعظم نے بھی قتل کا لفظ استعمال کرنے اور یہ ظاہر کرنے میں کہ یہ واقعہ بلوا کا نہیں ہے بلکہ قتل کی ایک ایسی گہری سازش ہے جس پر پوری طرح عمل کیا گیا کوئی باک محسوس نہ کی۔"

یہ مقدمہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتنا جگر فگار، کتنا لرزہ خیز ہے؟ پھر یہ واقعہ نوعیت میں منفرد نہیں کانگریسی دور حکومت کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے مگر مولانا آزاد نے استعفا نہیں دیا نہ تدارک کیا۔

روسیاہوں کی سرخروئی

سی۔ پی کے مسٹر یوسف شریف کا ذکر ہو چکا ہے وہ خود زانی نہ تھے، اس قسم کے ایک ملزم کو انہوں نے کچھ رعایت دے دی تھی مگر وہ وزارت سے برطرف کر دیے گئے۔ اب مسٹر دوارکا پرشاد مصرا کانگریسی وزیر سی۔ پی کی سیاہ کاریاں، اور کانگریس ہائی کمان سے ان کی سرخروئی ملاحظہ فرمائیے، خوب غور کر لیجئے، یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتنا سنگین ہے

ہولناک، کتنا لرزہ خیز اور کتنا غیر شریفانہ ہے؟ صرف یہ الزام مصرا کو کانگریسی وزارت سے برطرف کر دینے کے لیے کافی تھا، لیکن اس الزام کے ثبوت پیش کیے گئے۔ وادرسی کی کوشش کی گئی، عرض درالتجا سے کام لیا گیا مگر کانگرس ہائی کمان نے اسے اپنے پرسٹیج کے خلاف سمجھا کہ وہ ایک ہندو وزیر کو برطرف کرے۔ اس سلسلہ میں ضروری واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

ایک کانگریسی لیڈر کی سیاہ کاری

جون ۱۹۳۷ء میں ایک مسلمان عورت نے جبلپور کوتوالی میں رپورٹ کی کہ اسکی نابالغ لڑکی کا اغوا ہو گیا ہے اور اس کا شک مسٹر مصرا کے ڈرائیور نامی نانا ٹیڈو پر ہے۔ دوران تحقیقات پولیس کو یہ معلوم ہوا کہ اس اغوا میں مسٹر مصرا اور اس کے کئی دوستوں کا زبردست ہاتھ ہے۔ پولیس کو یہ بھی پتہ چلا کہ مسٹر مصرا اور اس کے سرپرست سیٹھ گوندداس اس کی پوری کوشش کر رہے تھے کہ لڑکی اور ملزم کا سراغ نہ ملے۔ مسٹر مصرا پر کتنا سنگین الزام تھا؟ اس کا اندازہ پولیس ڈائری کے ان ٹکڑوں سے ہو سکتا ہے جس کو بعض لوگوں نے حاصل کر کے اخبارات میں چھپوایا اور ایک حلفیہ بیان کے ساتھ ناگپور ہائی کورٹ میں داخل کیا، بہت دنوں کی تلاش کے بعد جب لڑکی کو پولیس نے برآمد کر لیا تو لڑکی نے پولیس کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ "میری ماں کی عدم موجودگی میں نانا ٹیڈو آیا اور کہا کہ تیری ماں تجھے بلا رہی ہے، جب میں باہر نکلی تو اس نے ایک موٹر پر مجھے زبردستی ڈال دیا اور موٹر چلا دی، میرے چیخنے چلانے کی آواز کو اس نے موٹر کا ہارن بجا بجا کر دبا دیا۔ موٹر پر ایک آدمی اور تھا جسے میں اندھیرے کے سبب نہیں پہچان سکی مجھے گوپال باغ لے جا کر تانے میں بند رکھا گیا۔ نانا ٹیڈو نے اس رات کئی بار میری عصمت دری کی، نانا ٹیڈو مجھ سے بار بار یہ کہا کرتا تھا کہ مجھے مصرا جی کے گھر رہنا ہوگا وہاں آرام اور چین سے کٹے گی وہ بڑے آدمی ہیں۔

لڑکی کا حسب ذیل بیان جو پولیس کی ڈائری میں درج ہے مصرا جی کے خلاف جرم ثابت کرتا ہے۔ گوپال باغ میں میرے پہنچنے کے ایک یا دو دن بعد ایک رات مصرا جی کوٹھری میں آئے اور مجھ سے کہا میرے گھر چلو اور اس طرح کی باتیں کرنے لگے جو مجھے ناگوار معلوم ہوئیں۔ میں نے ان کے گھر جانے سے انکار کیا اور اس پر بھی راضی نہ ہوئی

کر وہ میرے ساتھ صحبت کریں لیکن اس شب کو انہوں نے میرے ساتھ زنا کیا۔"

وہ مسلمان مظلوم لڑکی

پولیس کے کاغذات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لڑکی کو بمبئی بھیجا جا رہا تھا، تلاش میں ایک کاغذ ملا جس پر سیٹھ گوبند داس کی فلم کمپنی "آدرش چترا" (جس کے منیجر مسٹر مصرا تھے) کے بمبئی آفس کے ایک ملازم کا پتہ تھا جس کے مکان سے لڑکی برآمد ہوئی۔ اس نے پولیس کے سامنے اقبال کیا کہ میرے بھتیجے نے جو نانا نائیڈو کا دوست ہے لڑکی اور یہ پتہ اور رقم حوالہ کی کہ اسے بمبئی پہنچا دیا جائے۔ پولیس کے کاغذات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر جارج ڈی صلوا سابق صدر جبلپور میونسپل کمیٹی اور ڈاکٹر مس قاضی سے لڑکی کے بلوغت کا جھوٹا سرٹیفکیٹ لینے کی کوشش کی گئی تھی مگر ناکامی ہوئی کیونکہ ان دونوں نے جعلی سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کیا اور بعد معائنہ کہہ دیا کہ لڑکی نابالغ ہے۔ اس سلسلہ میں پولیس نے مسٹر مصرا کا بیان لینا چاہا مگر کامیاب نہ ہوئی، ڈائری کے الفاظ یہ ہیں:

"جب سب انسپکٹر ان کے پاس گئے تو انہوں نے کہا کہ وہ بہت بیمار ہیں اور صاحب فراش ہیں اور باہر نکلنے کے قابل نہیں ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بیماری بناوٹی ہے اور وہ سب انسپکٹر کے سوالات سے بچنا چاہتے تھے کیونکہ یہ معلوم ہوا کہ بعد میں وہ گھومتے ہوئے دیکھے گئے اور تندرست حالت میں تھے۔"

کانگرس کا سیاہ کار لیڈر وزیر بن گیا

پولیس اس مقدمہ کی تحقیقات کر رہی تھی اور ایک دو دن میں مجسٹریٹ کے سامنے ان کی شناخت ہونے والی تھی کہ کانگرس نے انہیں وزیر منتخب کر لیا اور ان کے خلاف حکومت نے مزید کارروائی کرنے سے حکماً روک دیا اور اس طرح اتنے سنگین الزامات سے آلودہ شخص بغیر اپنے جرم کی صفائی پیش کیے وزارت جیسے کام پر مامور کیا گیا غالباً گاندھوی صداقت کی راج گدی ایسے ہی لوگوں کے لیے موزوں ہے۔ بہر حال جب حکومت نے اپنے اختیارات کے زور سے ان کے اخلاق سوز الزامات کی پردہ پوشی کی تو منصف مزاج لوگوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور رہائی کمان کے کانوں

تک یہ بات ہر طرح پہنچائی گئی کہ پہلے ان کے خلاف جو الزامات ہیں ان کی صفائی ہونی چاہیے اور ہائی کمان کو چاہیے کہ اس کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرے لیکن ہائی کمان نے اس مطالبہ کو سال بھر ٹالا اور جب بہت ہی بے بس اور لاجواب ہو گئی تو شریف صاحب کے معاملہ کی طرح کسی سابق جج اور غیر کانگرسی آدمی کو نہیں مقرر کیا بلکہ ورکنگ کمیٹی کے ایک ممبر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کو۔ انہوں نے شریف صاحب کے معاملہ کے تحقیقات کنندہ کی طرح الزام لگانے والوں کو اس کی آزادی نہیں دی کہ واقعاتی ثبوت اور شہادت کے ذریعہ جرم کو ثابت کر سکیں بلکہ مسٹر ڈیسائی نے بہت سی شہادتوں اور ثبوتوں کے لینے سے اس بہانہ سے انکار کر دیا کہ یہ نفس معاملہ سے غیر متعلق ہیں یا عدالتوں میں رائج قوانین کی شہادت کی دفعات کی روشنی میں ایسی شہادت یا ثبوت ناقابل قبول ہے۔ اس کی ذرا وضاحت کر دینی ضروری ہے قانون شہادت کے مطابق کسی دعوے کے ثبوت میں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے فلاں شخص کو ایسے کہتے ہوئے سنا تھا اور فلاں شخص زندہ ہو اور گواہی دینے کے قابل ہو اور ممکن طریقہ پر دستیاب ہو سکتا ہو تو اس فلاں شخص کی شہادت بھی پیش کرنی لازمی ہے ورنہ گواہی دینے والے کا بیان بطور ثبوت قابل قبول نہ ہوگا لیکن عدالت میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو اس کا موقع حاصل رہتا ہے کہ اگر متعلقہ گواہ شہادت میں آنے سے انکار کرے تو عدالت سے بذریعہ سمن اور اس پر بھی نہ آئے تو بزور وارنٹ اسے عدالت میں گواہی دینے پر مجبور کیا جائے مگر ڈیسائی کسی کو گواہی دینے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے، نہ مسٹر مصرا پر الزام لگانے والوں کو یہ موقع حاصل تھا کہ نارضامند گواہ کو مسٹر ڈیسائی کے سامنے شہادت پر مجبور کر سکیں ایک وزیر کے خلاف گواہی دینے پر راضی ہونا آسان نہیں اس لیے اس قسم کی تحقیقات میں قوانین شہادت پر ایسی سخت پابندی کے ساتھ عمل کہیں نہیں کیا جاتا اور مسٹر ڈیسائی کا ایسا کرنا سراسر غیر منصفانہ اور جانبدارانہ فعل تھا۔ اس صریح زیادتی کو دیکھتے ہوئے الزام لگانے والوں نے تحقیقات میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور ہائی کمان نے مسٹر مصرا کو بے قصور قرار دے کر مزید تحقیقات کی ضرورت نہ سمجھی۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس کا روزنامچہ ذیل میں سٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جبلپور کے خفیہ انگریزی روزنامچہ کا اردو ترجمہ بلجنیس کے

ساتھ درج کیا جاتا ہے۔ اس روزنامچہ کے مندرجات سے اندازہ ہوگا کہ مسٹر دوارکا پرشاد مصرا کانگرسی وزیر سی۔پی کے خلاف کتنا سنگین جرم تھا، اگر وہ وزارت میں نہ ہوتے اور کانگرسی حکومت نے پولیس کو مزید تحقیقات سے حکماً روک دیا ہوتا تو آج جیل میں ہوتے اور خان صاحب ظفر حسین سے زیادہ عبرت انگیز اور تکلیف دہ حالات سے انہیں دوچار ہونا پڑتا۔

یہ واقعہ، یہ مقدمہ، یہ تفتیش، یہ روزنامچہ، یہ سیاہ کاری ہر چیز تاریخی ہے۔ صرف طوالت بیان کے خوف سے ایسی اہم چیزوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ امکانی طور پر اختصار سے کام لیا گیا ہے، پھر بھی لاکھ مختصر کیجئے، سیاہ کاری کی داستان طویل ہو ہی جاتی ہے۔

اب روزنامچہ کے اہم اور ضروری اندراجات ملاحظہ ہوں۔

خفیہ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جبل پور

متعلق الزام ۳۱۳ دفعہ ۳۶۶ تعزیرات ہند سال ۱۹۳۷ء

بنام نانا تیڈوا ور ڈی، پی مصرا ملزمان

ہیڈ کانسٹیبل بھیا لال سیونی سے واپس آیا اور مظہر ہوا کہ اسے معلوم ہوا ہے کہ دس دن ہوتے نانا تیڈوا اور لڑکی مسماۃ حسینہ سیونی گئے تھے اور دو دن رہ کے وہاں سے چلے گئے۔

نانا تیڈوکا باوجود تلاش کچھ پتہ نہیں چلا یہ معلوم ہوا کہ ڈی، پی مصرا کے ایک بھائی کانپور میں ہیں اور یہ اطلاع ملی ہے کہ لڑکی کانپور بھیج دی گئی ہے، سیٹھ گوندداس اور ڈی، پی مصرا اس معاملہ میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نانا تیڈوا نہیں دونوں کے مشورہ سے چھپا ہوا ہے۔

مورخہ ۲۴/۵/۳۸ (دستخط سٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس)

نقل بخدمت جناب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب بہادر،

خفیہ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جبل پور

الزام ۳۱۳ دفعہ ۳۶۶ تعزیرات ہند بنام نانا تیڈوا ور ڈی، پی مصرا ملزمان

تفتیش مقدمہ ہذا جاری ہے اس وقت تک نانا تیڈوا اور لڑکی مسماۃ حسینہ کا کچھ پتہ نہیں چل سکا، اس اطلاع پر کہ نانا اور مسماۃ حسینہ کانپور میں ہیں، ہیڈ کانسٹیبل

مہاجر جو کانپور سے واقف ہے کانپور بھیجا گیا۔ اس سلسلہ میں ۲۴ر مئی ۱۹۳۷ء کو ایک تحریر
سی سپرنٹنڈنٹ پولیس کانپور کے پاس بھیجی جاچکی ہے کیونکہ رامیشور پرشاد مصرا
برادر ڈی۔پی مصرا سپلشری دیوی کانپور میں رہتے ہیں لیکن اس کا جواب موصول نہیں ہوا۔
لڑکی کی ماں نے ایک درخواست دی ہے کہ چونکہ اس معاملہ میں بڑے آدمیوں
کا ہاتھ ہے بہت ممکن ہے کہ لڑکی جان سے مار دی گئی ہو، اس پر بھی نگاہ رکھی جائے
گی۔

اس مقدمہ کے سلسلہ میں بہت سی افواہیں ہیں، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ڈی۔پی
مصرا اور سیٹھ گزمداس اس امر کے لئے کوشاں ہیں کہ بھاگنے والوں کا پولیس کو کچھ پتہ نہ
چلے اور انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ نانا کے جائے قیام کا پتہ نہ چل سکے۔

مورخہ ۸ جون (دستخط ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جبل پور)

خفیہ رپورٹ بسلسلہ تفتیش مقدمہ الزام ۲۱۳ دفعہ ۳۶۶ تعزیرات ہند
بنام نانا نائیڈو اور ڈی۔پی مصرا ملزمان

مقدمہ ہذا میں تفتیش جاری رہی اور گزشتہ پندرہ دن میں کئی مرتبہ اطلاعات نانا ملزم
اور لڑکی حسینہ کے متعلق ملتی رہیں، ان پر عمل کیا گیا مگر کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔
ہیڈ کانسٹبل سندر لال نے اطلاع دی کہ ایک نوجوان ہندو لڑکی جو ساڑھی پہنے ہے
ہندوانہ لباس میں ہے۔ وہ یوم کا عرصہ ہوا محلہ بھان تلیہ میں آئی تھی، بمبئی لے جائی جا
رہی ہے۔ وہ ہردیو سنگھ بیاس کے مکان پر ہے، محلہ کی عورتوں کے ذریعہ سے بمشکل
تمام اس لڑکی کا حلیہ معلوم کیا گیا تو اس کا حلیہ گم شدہ لڑکی حسینہ سے ملتا ہے۔ اولاً ہردیو سنگھ
نے بتایا کہ اس کے پاس ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے لیکن جب اس سے کہا گیا
کہ اس کے مکان کا دروازہ توڑ دیا جائے گا تو اس نے تسلیم کیا کہ لڑکی ہے، چنانچہ ایک
لڑکی دستیاب ہوئی جس کو حسینہ کی ماں نے اپنی بیٹی شناخت کیا۔ پہلے ہردیو سنگھ نے یہ
بیان کیا کہ اسے یہ لڑکی بھیک مانگتی ہوئی ملی تھی لہذا اپنی حفاظت میں وہ اسے لے
آیا۔ لڑکی کے اچھے لباس وغیرہ کو دیکھتے ہوئے یہ صریح جھوٹ ہے۔ وہ گرفتار کیا گیا
اور جلد راست گوئی پر اتر آیا اس نے تسلیم کیا کہ اس لڑکی کو اس کا بھانجا جو نانا کا دوست
ہے لایا تھا اور وہ اس کو بمبئی لے جا رہا تھا۔ ہردیو سنگھ کے مکان کی تلاشی پر بستر اور
صندوق سفر کے لیے بندھے ہوئے پائے گئے۔ ان کے کھولنے پر لڑکی کے کپڑے

ہردیو سنگھ کے کپڑوں کے ساتھ ملے۔ ایک پرچہ بھی ملا جو پرتاب سنگھ ہردیو سنگھ کے بھائی کا لکھا ہوا ہے۔ یہی پرتاب سنگھ لڑکی کو لایا تھا۔ اس پرچی میں نہرجی اور ش چیمبر لیمنگٹن روڈ بمبئی کا پتہ لکھا ہوا ہے جہاں لڑکی لیجا رہی تھی۔

یہ پرچہ ہردیو سنگھ کے کوٹ کی جیب سے برآمد ہوا۔ اورش چترا گوندو اس کی فلم کا دفتر ہے اور جس کے انتظام میں ڈی، پی مصرا کا پورا ہاتھ ہے۔ ہردیو سنگھ اور پرتاب سنگھ نے بعد میں یہ بھی بتایا کہ نانا بمبئی میں مذکورہ بالا پتہ پر موجود ہے۔ سب انسپکٹر ورما نانا کی گرفتاری کے لئے بمبئی بھیجے گئے ہیں۔ لڑکی حسینہ سے ابھی پورے طور سے دریافتِ حال نہیں کیا جا سکا۔ دستیابی اور اپنی ماں بہنوں اور چھوٹے بھائی کے ملنے سے وہ ایک بدحواسی کی سی کیفیت میں ہے اور متلی اور دردِ سر کی شکایت کرتی ہے جو کچھ بھی اس نے بیان کیا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ وہ گوپال باغ میں جبراً ایک کمرہ میں بند رکھی گئی اور وہاں نانا کے علاوہ ڈی، پی مصرا بھی اس سے ملا۔ افسرِ تفتیش کنندہ کو بھی بوجہ مصروفیت خانہ تلاشی و دیگر امور ضروری متعلق مقدمہ لڑکی سے مفصل دریافتِ حال کا موقع نہیں ملا۔

مورخہ ۶/۴ ۲۱ (دستخط سٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جبل پور)

رپورٹ بسلسلہ تفتیش مقدمہ الزام ۲۱۲/ دفعہ ۳۶۶ تعزیراتِ ہند
بنام نانا نائیڈو و ڈی، پی مصرا ملزمان خفیہ

مقدمہ ہذا کی تفتیش جاری رہی۔ لڑکی حسینہ نے جو بیان دیا ہے اس کا اختصار ہم رشتہ ارسال ہے، اس نے اپنے بیان میں بہت سی باتیں بتائی ہیں جس کی تصدیق کی جا رہی ہے۔

وہ سول سرجن اور لیڈی ڈاکٹر کے معائنہ کے لئے پیش کی گئی۔ معائنہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ لڑکی کی عمر تقریباً سولہ سال ہے، صحیح عمر کے یقین کے لئے سول سرجن سے مزید دریافت کیا جا رہا ہے اور اس کی عمر کے سرٹیفکیٹ کو بھوپال سے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

سب انسپکٹر ورما بمبئی سے واپس آئے نائیڈو کا نہ کچھ پتہ چلا اور نہ وہ گرفتار

کیا جا سکا بمبئی پولیس کو ضروری تفصیلات بتا دی گئی ہیں۔
حسینہ کی طبیعت خراب تھی، اور اسے بخار تھا لیکن کل سے وہ بہتر ہے۔ ۲۷ر جون ۱۹۳۷ء کو مجسٹریٹ کے روبرو اشخاص متعلقہ مقدمہ ہٰذا کی کارروائی شناخت لڑکی سے کرانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ مصرا کی کارروائی شناخت بعد مشورہ کرائی جائے گی۔
مورخہ ۲۶/۶/۳۷ (دستخط سٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جبلپور)

مختصر بیان مسماۃ حسینہ

سٹی کوتوالی جبلپور

خفیہ

حسینہ دختر محمد حنیف ساکن محلہ گڑھا پھاٹک جبل پور

جس روز چیری تال میں آگ لگی نانا نائیڈو قریب ساڑھے سات یا آٹھ بجے رات کو میری ماں کی عدم موجودگی میں میرے مکان پر آیا۔ اس سے قبل نانا نائیڈو تین چار مرتبہ میرے مکان پر آچکا تھا اور میری ماں سے بات چیت کی تھی میں نہیں کہہ سکتی کہ کیا بات ہوتی تھی۔ میں نے نہیں دیکھا کہ روپیہ یا نوٹ میری ماں کو پیش کیے گئے ہوں کیونکہ میں پردہ کرتی تھی اور گھر چھوٹا ہونے کی وجہ سے جب کوئی بیرونی شخص آتا تھا تو میں بادشاہ مسلمان اپنے پڑوسی کے یہاں چلی جاتی تھی۔ جب نائیڈو آتا تھا تب بھی میں یہی کرتی تھی جس دن چیری تال میں آگ لگی میری ماں حسبِ معمولی بازار گئی تھی، اس وقت سورج ڈوب رہا تھا یا اندھیرا ہو چکا تھا، اس روز جب میری ماں چلی گئی تو نانا نائیڈو آیا اور مجھ سے کہا کہ تیری ماں نے بلایا ہے جو گھر کے باہر ہے۔ جب نائیڈو آیا تھا تو مکان کے اندر کھانے پینے اور اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھی میں مکان سے باہر آگئی جب میں نے پوچھا کہ میری ماں کہاں ہے تو اس نے کہا اور تھوڑی دور چلو کچھ دور کے فاصلہ پر ایک موٹر کار کھڑی تھی جونہی کہ ہم موٹر کے قریب پہنچے اس نے مجھے زبردستی موٹر کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ نانا یہی کہتا رہا کہ ڈرو مت تمہاری ماں وہاں ہے اور وہ تمہیں بلا رہی ہے۔ میں رونے چلانے لگی اس نے موٹر کار کا ہارن بجانا شروع کیا جس سے میری آواز دب گئی۔ ایک آدمی اور بھی موٹر کار کی اگلی نشست پر بیٹھا تھا میں اسے نہیں پہچان سکی کیونکہ اندھیرا ہو گیا تھا اور

میں بہت پریشان اور خوفزدہ ہوگئی تھی۔ گوپال باغ میں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس
میں نشاندہی کر سکتی ہوں مجھے اس میں لے گئے اس کمرہ میں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے ا
کھڑکی کی پشت کی جانب ہے جس میں لکڑی کے جنگلے لگے ہیں اور اس کے دو ڈنڈ
غائب ہیں،" اس رات میرے ساتھ نانا نائیڈو نے کئی بار حرام کاری کی جب وہ باہر
تھا تو سامنے والے دروازہ کا تالا بند کر دیتا تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی اور نائیڈ
کی خوشامد کی کہ مجھے چھوڑ دیا جائے مگر وہ نہیں مانا یہ پانچ چھ روز تک ہوتا رہا۔ نا
کھانا لاتا رہا۔ جب مجھے رفع حاجت کی ضرورت ہوتی تو نانا چارپائی پر ایک کرسی رکھ دیتا
اور مجھے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے ڈنڈوں کے خلا سے باہر کر دیتا تھا جہاں کئی خالی
اور ویران مکان اور ان کی دیواریں تھیں۔ میں وہاں ضروریات سے فراغت پا لیتی۔
ان ایام میں نائیڈو مجھ سے کہتا رہتا تھا کہ مجھے مصرا جی (ڈپٹی پی مصرا) کے مکان
میں رہنا ہوگا جہاں عیش و آرام سے زندگی کٹے گی، مصرا جی بڑے آدمی ہیں، دو ایک
روز کے بعد مصرا جی میرے کمرے میں آئے اور انہوں نے مجھ سے اپنے گھر چلنے کو
کہا اور مجھ سے اس قسم کی باتیں کیں جو مجھے ناپسند تھیں۔ میں نے ان کے ساتھ جانے
اور مجامعت کرنے سے انکار کر دیا، لیکن اسی رات انہوں نے مجھ سے بدفعلی کی، مصرا
جی کے اس واقعہ کے بعد میں نے نائیڈو سے کہا کہ میں خواہ کچھ بھی ہو مصرا جی کے
ساتھ گوپال باغ میں نہیں رہوں گی۔ میں دن بھر روتی رہی۔ میں گوپال باغ میں
ایک ہفتہ کے قریب رہی ان مقامات کی نشاندہی کر سکتی ہوں،" اس کے بعد میں
کیدار ناتھ کے مکان پر لے جائی گئی جہاں قریباً پندرہ دن تک رہی۔ کیدار ناتھ ٹیچر
ہیں۔ نانا روز وہیں آتا تھا وہاں سے ایک دن کے لیے مجھے سینیٹری انسپکٹر کے مکان
پر لے گئے اور پھر گورکھ پور پرتاپ سنگھ کے یہاں لے گئے، میں پرتاپ سنگھ کے
ساتھ دس دن تک رہی اور پھر وہاں سے ہردیو سنگھ کے مکان پر لائی گئی جہاں
ہ دستیاب ہوئی ہے۔

خفیہ رپورٹ بسلسلہ تفتیش الزام ۳۱۲ دفعہ ۳۶۶ تعزیرات ہند
بنام نانا نائیڈو اور ڈپٹی پی مصرا ملزمان

تفتیش مقدمہ ہذا جاری رہی۔ لڑکی حسینہ نے مجسٹریٹ کے روبرو سی آر نا ئیڈو سینئر پی انسپکٹر کو شناخت کر کے بتایا کہ وہ جن لوگوں کے گھر رکھی گئی تھی۔ ان میں سے یہ ایک ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر جارج ڈی سلوا نے اس کا معائنہ اسی سی آر نائیڈو سینئر پی انسپکٹر کے مکان پر کیا اور یہی اس کو لیڈی ڈاکٹر مس زیڈ۔ ایچ قاضی کے مکان پر معائنہ کے لئے لے گیا تھا۔ لڑکی نے جبکہ وہ معائنہ کے لیے ہسپتال بھیجی گئی مس قاضی کو بھی پہچانا۔

سی آر نائیڈو نے تسلیم کیا کہ نانا نائیڈو اس لڑکی کو اس کے مکان پر لایا تھا اور پہلی مرتبہ ہر پرشاد مرد ستقوا بیرسٹر نانا نائیڈو کے ہمراہ اس کے مکان پر آیا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کا ڈاکٹری معائنہ لیڈی ڈاکٹر سے کرایا جائے تب وہ اس لڑکی کو مس قاضی کے پاس لے گئے۔ انہوں نے لڑکی کا معائنہ کر کے اپنی رائے دی کہ وہ سولہ برس سے کم قریب چودہ برس کی ہے، لہٰذا انہوں نے کوئی سرٹیفکیٹ نہیں دیا۔ دوسرے دن لچھمن سنگھ چوہان ڈاکٹر جارج ڈی سلوا کو لے کر میرے مکان پر آتے اور لڑکی کا معائنہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر ڈی سلوا کی رائے میں بھی لڑکی نابالغ پائی گئی اور اس کی عمر یقیناً سولہ سال سے کم تھی لہٰذا ان سے بھی سرٹیفکیٹ نہ حاصل کیا گیا۔

ڈاکٹر جارج ڈی سلوا سے بھی دریافت کیا گیا، کچھ پس و پیش کے بعد انہوں نے کہا کہ وہ پولیس کو مدد دینے کے لئے قانوناً مجبور ہیں مگر ایسے معاملات میں بیان دیتے ہوئے انہیں شرم آتی ہے کیونکہ ایسے معاملات میں بدنامی ہوتی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ اسمبلی کی نامزدگی کے دوسرے دن وہ لچھمن سنگھ چوہان کے ہاں کاغذات وغیرہ لینے گئے تھے۔ لچھمن سنگھ نے انہیں ایک لڑکی کی عمر کی تنقیح کرنے کے لیے اس کے ڈاکٹری معائنہ کے لیے کہا چنانچہ وہ لچھمن سنگھ چوہان کے ساتھ سی آر نائیڈو انسپکٹر کے مکان پر گئے اور وہاں ایک لڑکی کا معائنہ کیا جو نابالغ تھی کیونکہ اس کے بغل اور شرمگاہ پر بال نہ تھے اور دیگر علامات بھی ایسی تھیں جن سے وہ لڑکی قریب چودہ سال کی معلوم ہوتی تھی لہٰذا انہوں نے لڑکی کی بلوغت کا سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے مزید بیان کیا کہ اگر عدالت ان کو طلب کرے گی تو وہ سچے معاملات کا اظہار کریں گے۔

معاً سے بھی سوالات کرنے کی کوشش کی گئی۔ جب سب انسپکٹر ان کے پاس گیا

توانہوں نے کہلا دیا کہ وہ بہت بیمار ہیں اور چارپائی سے اُٹھنے یا باہر نکلنے کے قابل نہیں ہیں، سب انسپکٹر کے سوالات سے بچنے کے لئے یہ بیماری بناوٹی معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اس کے بعد تندرست حالت میں گھومتے پھرتے دیکھے گئے ہیں ان سے استفسارِ حال کیا جائے گا۔

(دستخط) سٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جبل پور ۲۷ $\frac{۹}{۴۷}$

ان اوران جیسے صدہا ناقابلِ تردید واقعات وحقائق کے باوجود اقلیتوں کے ساتھ کانگرس کے منصفانہ برتاؤ پر مولانا آزاد کا اصرار نہ صرف حیرت انگیز بلکہ عبرت انگیز ہے یہ الفاظ "امام الہند" کے ہیں۔ حیرت، عبرت، حسرت کا یہ کیسا دلدوز منظر ہے۔

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا بتاؤں رات مجھے کس کے گھر ملے

---

(۳)

دوسری جنگِ عظیم

میرا دورِ صدارت

رازِ درونِ خانہ

۳، ستمبر ۱۹۴۱ء کو یورپ میدانِ کارزار بن گیا۔ ایک مہینہ ختم ہونے سے پہلے پہلے پولینڈ جرمن ہتھیاروں کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ پولینڈ والوں کی مصیبت میں مزید اضافہ یوں ہوا کہ روس نے اس کے مشرقی حصے پر قبضہ کر لیا۔ جب پولینڈ کی فوجی مزاحمت جواب دے گئی تو یورپ کے میدانِ جنگ پر کچھ دیر کے لیے سکوت چھا گیا۔ فرانس اور جرمنی اپنی قلعہ بند حدوں پر ایک دوسرے کے سامنے مسلح کھڑے تھے لیکن وسیع پیمانے پر جھڑپوں کا سلسلہ معطل تھا۔ ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

گاندھی جی کا اصرار

ہندوستان میں بھی خوف اور دہشت کا احساس غالب تھا۔ اس پس منظر میں کانگرس کے نئے صدر کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ جنگ کے بحرانی دور میں مجھے ہر اس خدمت کو فریضہ سمجھ کر انجام دینا چاہیے جس کا مجھ سے مطالبہ کیا جاتے۔ گاندھی جی نے جب بار بار مجھے صدر کانگرس بننے کی ترغیب دی تو میں راضی ہو گیا۔ ایم۔ این۔ اے میرے مقابلے میں کھڑے ہوئے تھے جو بری طرح ہارے۔ کانگرس کا اجلاس رام گڑھ میں منعقد ہوا۔ یہاں ایک تجویز منظور ہوئی جو میرے خیالات کی آئینہ دار تھی۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد سے میں نے صدارت کا چارج لے لیا۔ مجھے ورکنگ کمیٹی کی

از سرِ نو تشکیل کرنی تھی، جواہر لال گزشتہ ورکنگ کمیٹی میں نہیں تھے انہیں پھر سے واپس لے آیا۔ میرے نامزد ممبروں میں راجگوپال اچاریہ، ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر آصف علی بھی تھے۔

نازک مرحلہ

کانگرس کی تاریخ میں یہ بہت نازک مرحلہ تھا۔ ہندوستان سے باہر کی دُنیا میں جو لرزہ خیز واقعات رونما ہو رہے تھے ہم سب اُن سے متاثر تھے لیکن سب سے زیادہ پریشان کن چیز خود ہمارے اندرونی اختلافات تھے، میں کانگرس کا صدر تھا میں چاہتا تھا کہ ہندوستان جمہوری ممالک کے کیمپ میں داخل ہو جائے بشرطیکہ اُسے آزاد کر دیا جاتے۔

گاندھی جی کا ارادۂ خودکشی

گاندھی جی اب تک اپنی رائے پر قائم تھے، یعنی ہندوستان کو کسی حالت میں بھی شریک جنگ نہ ہونا چاہیے وائسرائے سے ملاقات کے دوران میں بھی انہوں نے یہی بات کہی۔ یہ وہ وقت تھا کہ فرانس گھٹنے ٹیک چکا تھا اور جرمن طاقت اپنے عروج پر تھی۔

گاندھی جی کے لئے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ متعدد مواقع پر انہوں نے خودکشی تک کا ارادہ ظاہر کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر وہ جنگ کی لائی ہوئی مصیبت روک نہیں سکتے تو کم از کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے اس ہولناک منظر کے تماشائی نہ بنیں۔ انہوں نے متعدد بار مجھ پر زور دیا کہ میں ان خیالات کی پشت پناہی کروں لیکن میں ان سے متفق نہ ہو سکا۔

میرے نزدیک عدم تشدد کی حیثیت پالیسی کی تھی۔ عقیدہ کی نہیں میرا خیال تھا کہ اگر کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ جائے تو ہندوستانیوں کو تلوار سنبھالنے کا حق ہے۔ البتہ آزادیٔ ہند کی جدّ و جہد پُر امن طریق پر ہونی چاہیے۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی اس مسئلے پر دو گروہوں میں بٹ گئی۔ پہلے مرحلے میں جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، راجگوپال اچاریہ اور خان عبدالغفار خاں میرے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد اچاریہ کرپلانی اور شنکر راؤ دیو دل و جان سے گاندھی جی کے حامی تھے۔ یہ لوگ گاندھی جی کے اس خیال سے متفق تھے کہ اگر ایک مرتبہ یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ آزاد ہندوستان جنگ میں عملی حصہ لے گا تو آزادیٔ ہند کے لیے ہندوستان کے عقیدۂ عدم

تشدد کی بنیاد منہدم ہو جائے گی لیکن اس کے برعکس میرا خیال یہ تھا کہ اندرونی جدوجہد آزادی کے درمیان اور بیرونی طور پر جارحیت کا مقابلہ کرنے میں فرق ہے۔ آزادی کی جدوجہد الگ چیز ہے اور آزادی کے بعد جنگ میں حصّہ لینا دوسری چیز ان دونوں کو گڈ مڈ نہ کرنا چاہیے۔(١)

کانگرس کا فیصلہ

جولائی سنہ ۱۹۴۱ء میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگرس کے جلسے پونا میں ہوئے۔ جہاں میرا نقطۂ نظر تسلیم کر لیا گیا۔ دو تجویزیں منظور ہوئیں۔

١۔ پہلی تجویز میں کانگرس کے اس عقیدہ کی تجدید کی گئی کہ آزادیٔ ہند کے لئے عدم تشدد کی پالیسی صحیح اور درست ہے اور اسے برقرار رہنا چاہیئے۔

٢۔ دوسری تجویز میں اعلان کیا گیا کہ نازیت اور جمہوریت کی اس جنگ میں ہندوستان کا صحیح مقام جمہوریت کا کیمپ ہے لیکن مساعیٔ جنگ میں ہندوستان اس وقت تک حصّہ نہیں لے سکتا جب تک آزاد نہ ہو جائے۔

دونوں تجویزوں کا مسودہ میرا بنایا ہوا تھا۔

گاندھی جی کا اضطرابِ خیال

ان تجاویز سے گاندھی جی بہت خوش ہوئے۔ مبارکباد کا ایک تار بھیجتے ہوئے انہوں نے مجھے لکھا کہ وہ اس بات سے خوش ہیں کہ آزادی کی جدوجہد میں عدم تشدد کے عقیدہ کی میں نے تائید کی ہے۔ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ موجودہ حالات میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی میری تجویز منظور کرے گی کہ اگر ہندوستان آزاد کر دیا گیا تو وہ مساعیٔ جنگ میں حصّہ لے گا۔ انہوں نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکوں گا کہ ملکی جدوجہد آزادی کے لئے وہ عدم تشدد کی پالیسی پر قائم رہے۔

ممبرانِ کمیٹی کی روش

جنگ کے سلسلے میں ورکنگ کمیٹی کے ممبروں نے بہت جلد حیص بیص کا اظہار شروع کر دیا۔ ان میں سے کوئی بھی یہ بات فراموش نہیں کر سکتا تھا کہ اصولی طور پر گاندھی جی کسی طرح شرکتِ جنگ کے حامی نہیں بن سکتے یہ لوگ اسے بھی فراموش نہیں کر سکتے تھے کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی گاندھی جی کی قیادت ہی میں اس درجے تک پہنچی تھی۔ اب پہلی مرتبہ اس بنیادی مسئلے پر ان سے اختلافِ رائے

کر کے وہ انہیں تنہا چھوڑ رہے تھے۔ مہینہ بھر کے اندر ہی اندر سردار پٹیل نے رائے بدل دی اور گاندھی جی کے ہمنوا ہو گئے۔ ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبر بھی جو کنم میں گرفتار گئے۔ راجندر پرشاد اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں نے مجھے لکھا کہ جنگ کے سلسلے میں گاندھی جی سے پورے طور پر متفق ہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ کانگرس بھی اسی مسلک پر گامزن رہے لیکن چونکہ میں اس رائے سے اختلاف رکھتا ہوں اور کانگرس کمیٹی میری تائید کر چکی ہے لہٰذا دستخط کنندگان کو شبہ ہے کہ آیا انہیں ورکنگ کمیٹی کا ممبر رہنا چاہیے۔ یہ حضرات اس وقت تک ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہنے پر تیار تھے جب تک یہ اختلاف عملی طور پر ظاہر نہ ہو جائیں۔ اگر حکومتِ برطانیہ یہ شرائط تسلیم کر لیتی ہے اور شرکتِ جنگ کا مسئلہ بن جاتا ہے تو ان کے لیے مستعفی ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

اس خط سے مجھے بہت تکلیف پہنچی، جواہر لال، راجگوپال اچاری، ڈاکٹر سید محمود اور آصف علی کے سوا تمام ممبروں کے اس پر دستخط تھے حتیٰ کہ عبدالغفار خاں نے بھی جو اس وقت تک میرے سرگرم حامی چلے آ رہے تھے اپنی رائے بدل دی۔ اپنے رفقا سے اس قسم کے رویے کی میں توقع نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے انہیں لکھا جب تک برطانوی حکومت کے رویے میں تبدیلی نہیں ہوتی شرکتِ جنگ کا مسئلہ صرف ایک علمی مسئلہ ہے لہٰذا میں نے اُن سے درخواست کی کہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے کام کرتے رہیں۔ (ص ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶)

سول نافرمانی کا آغاز انگریزوں نے جب کانگرس کا دستِ تعاون جھٹک دیا تو گاندھی جی نے خیال کیا کہ محدود پیمانے پر سول نافرمانی کا آغاز کر دینا چاہیے۔ ونوبا بھاوے پہلے ستیہ گرہی منتخب ہوئے پھر جواہر لال نہرو، بعد میں دوسرے لوگ۔ جلد ہی انفرادی ستیہ گرہ قومی پیمانے پر شروع ہو گئی۔ پنجاب سے واپس آتے ہوئے الٰہ آباد کے اسٹیشن پر میں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے دو سال کی سزا ملی اور میں نینی جیل بھیج دیا گیا کچھ عرصے بعد ڈاکٹر کاٹجو بھی ہم سے آن ملے۔

روس پر جرمن حملے کے نتائج ۱۹۴۱ء میں جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا چھ مہینے کے اندر جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کر کے امریکہ کو چونکا دیا اس طرح صحیح معنے میں یہ جنگ عالمگیر ہو گئی۔ امریکہ برطانیہ کو امداد دے رہا تھا

لیکن اب تک میدانِ جنگ سے باہر تھا پرل ہاربر پر جاپان کے حملے نے امریکہ کو میدانِ جنگ میں پہنچا دیا۔

جاپان کی حیرت انگیز کامیابیاں

ابتدائی مرحلوں میں جاپان کی حیرت انگیز کامیابیوں نے جنگ کو ہندوستان کے دروازے تک پہنچا دیا۔ چند ہفتوں کے اندر جاپان نے ملایا اور سنگاپور پر قبضہ کر لیا۔ پھر فوراً ہی برما اس کے تسلط میں آگیا۔ جاپانی جہاز خلیج بنگال میں نظر آنے لگے۔ بہت جلد انڈمان اور نکوبار پر جاپانی بحریہ کا قبضہ ہو گیا۔ صدر روزویلٹ نے برطانوی حکومت سے استدعا کی کہ ہندوستانی لیڈروں کو مطمئن کیا جائے، برطانوی حکومت اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی اس نے اپنی پالیسی بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔

جیل سے رہائی

دسمبر ۱۹۴۱ء میں وائسرائے نے مجھے اور جواہر لال کو رہا کر دیا اس موقع پر میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ جنگ گزشتہ دو سال سے جاری ہے لیکن آزادیٔ ہند کے سلسلے میں ہمارا کوئی قدم آگے نہ اٹھ سکا ہم حالات کا شکار بنے ہوئے تھے اپنی قسمت کے مالک نہیں۔

ص، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰۔

(۱)

مولانا آزاد نے جنگ کے سلسلے میں کانگرس کے فلسفۂ تشدد اور عدمِ تشدد سے متعلق جو معلومات اپنی سرنوشت میں درج کئے ہیں وہ بے حد دلچسپ ہیں۔

۱۹۴۱ء میں گاندھی جی، سردار پٹیل، راجندر پرشاد اور دوسرے کانگرسی رہنما عدمِ تشدد پر اتنا گہرا اور ایسا لازوال اعتقاد رکھتے ہیں کہ اگر جنگ میں شرکت کی شرط پر یعنی میدانِ جنگ میں جمہوریت دشمن عناصر سے تشدد (ہتھیار) کے ذریعے مقابلہ کرنے سے آزادیٔ ہند کی نعمت حاصل ہوتی ہو تو آزادیٔ ہند سے عشق و شغف کے باوجود اُسے یہ ٹھکرانے، غلام رہنے اور ہدفِ استہزاء بننے پر تیار رہتے مگر تشدد سے اپنا دامن آلودہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

پھر چھ سال بعد جب ہندوستان آزاد ہو گیا، گاندھی جی ہندوستان کے شاہ بے تاج بن گئے، جواہر لال وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر فائز ہو گئے۔ سردار پٹیل نے وزارتِ داخلہ

اور ریاستی ہند کا محکمہ سنبھالا۔ راجندر پرشاد کابینۂ ہند کے رکن رکین بن گئے۔ تو ان عادم تشدّد کے پرستاروں نے بے تامل کشمیر پر چڑھائی کر دی، اس پر اپنے اصول کے خلاف ایک مستبد فرمانروا کی دعوت پر عوام سے مشورہ کیے بغیر قبضہ کر لیا اور عوام جو جمہوریت کے نام پر اپنے لیے حقِ خود ارادیت طلب کر رہے تھے بندوقوں کی باڑھ اور تلواروں کی نوک پر رکھ دیے گئے۔

پھر یہی وہ عادم تشدّد کے پرستار اور علمبردار تھے جنھوں نے حیدرآباد پر پولیس ایکشن کیا اُن کے ٹینکوں نے بے گناہوں کو کچلا، اُن کی توپوں نے آگ اُگلی اور بے گناہوں کو خاکستر کر کے رکھ دیا، اُن کے سپاہیوں نے شریف اور پاک دامن عورتوں اور لڑکیوں کی آبرو ریزی کی، اُن کے غنڈوں نے دولت مند مسلمانوں کو برباد کیا، ان کی دکانوں کو لوٹا، ان کے گھروں پر قبضہ کر لیا۔

پھر یہی عادم تشدّد کے پرستار اور علمبردار تھے جنھوں نے میر عثمان علی خاں فرمانروائے حیدرآباد کو عوام سے غداری پر آمادہ کیا، اس سے معاہدہ کیا کہ تمہاری حکومت قائم رہے گی، تمہارے حقوق قائم رہیں گے، تمہارا دبدبہ قائم رہے گا، تمہاری دولت و ثروت اور جاہ و حشم قائم رہے گا لیکن حیدرآباد پہنچنے کے بعد انھوں نے نظام سے وہی سلوک کیا جو ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے غدر پر قابو پا لینے کے بعد سرکش ریاستوں کے ساتھ کیا تھا، اس کی دولت چھین لی، اس کی جاگیر پر قبضہ کر لیا، اس کے "صرفِ خاص" کا محکمہ "سرکارِ خاص" مخصوص کر دیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد اس پر بھی جوشِ انتقام کی تسکین نہ ہوئی تو ایک حد بندی کمیشن بنا کر ہندوستان کی اس سب سے بڑی ریاست کے وجود کو جسے انگریزی کاغذات میں ریاست نہیں بلکہ مملکت لکھا جاتا تھا ختم کر دیا۔ اس کا کچھ حصہ مدراس کو مل گیا، کچھ بمبئی کو، کچھ سی پی کو، حالانکہ حیدرآباد کے ہندو تک اس آپریشن کے خلاف احتجاج کرتے رہے۔ پھر یہ عادم تشدّد کے پرستار اور علمبردار جوشِ تعصب و عناد میں اتنے بے قابو ہو گئے کہ انھوں نے رواداری، جمہوریت اور انسان دوستی کا جو نقاب اوڑھ رکھا تھا اسے اپنے ہاتھوں سے نوچ کر پھینک دیا۔ گزشتہ چوتھائی صدی سے عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو تھا۔ اس یونیورسٹی اور اس کے ملحقہ کالجوں میں انجینئرنگ، ڈاکٹری، فلسفہ ادب، تاریخ جملہ علوم و فنون کی تعلیم اُردو میں دی جاتی تھی۔ یہاں کے گریجویٹ لندن

اور پیرس اور برلن کی دانش گاہوں میں تکمیل کے لیے جاتے تھے اور اپنے وطن کی ان جامعات کے طلبہ کے مقابلے میں تعلیمی لحاظ سے برتر ثابت ہوتے تھے جن کا ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا یہ عثمانیہ یونیورسٹی جبراً خالص تشدد کے ذریعہ بغیر کسی معقول سبب کے ہندی یونیورسٹی بنادی گئی۔ یہ حکم ہندوستان کے وزیرِ تعلیمات اُردو زبان کے غیر فانی انشاپرداز ابوالکلام آزاد نے دیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی بن گئی۔ ہندی جو ابھی تک زیرِ تشکیل زبان ہے، ہندی جس سے جنرل ہند کے ہندو بھی نفرت کرتے ہیں، ہندی جس کے خلاف گاندھی جی کے دستِ راست ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل، مدراس کے سابق وزیرِ اعظم اور کانگرس کے رکن رکین راجگوپال اچاری برابر زہر اگلا کرتے ہیں مسلمانوں کی اس یادگار کو مٹانے کے لیے تشدد پسند کے پرستار اور علمبردار اس کارنامہ پر بھی مطمئن نہیں ہوئے۔ انہوں نے حیدرآباد کے دائرۃ المعارف کو نام نہاد طور پر قائم رکھا اس لیے کہ عرب ممالک کو مبتلائے فریب کیا جا سکے کہ یہاں سے عربی کتابیں چھپتی ہیں لیکن دارالترجمہ کے دروازہ پر تالا لگا دیا جہاں اُردو زبان میں دنیا کے ہر علم و فن پر تراجم کا بیش بہا ذخیرہ ہر سال شائع کیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ اُردو کو مٹانا عدمِ تشدد کے تشدد کا پہلا فریضہ تھا۔ پھر لاکھوں روپے کی کتابوں کو کوڑیوں کے مول فروخت کردیا تاکہ پنساریوں اور عطاروں کی دکانوں پر ان کتابوں کو پھاڑ پھاڑ کر پڑیاں باندھی جائیں، اس پر بھی جی ٹھنڈا نہ ہوا تو کسی دل جلے نے باقیماندہ اثاثہ کو آگ لگا کر قصہ ہی ختم کردیا۔

کتنے شاندار اور لازوال کارنامے ہیں یہ ان اصحاب ہمم کے جو غلامی پر راضی تھے لیکن تشدد میں حصہ لے کر آزادی حاصل کرنا ننگ سمجھتے تھے مگر آزادی حاصل کرنے کے بعد تشدد اور سفاکی میں اپنے پیشرو انگریزوں سے بھی بازی لے گئے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا!

لیکن تشدد اور عدمِ تشدد کی یہ داستان ابھی ختم کہاں ہوئی؟

چلئے تم کہاں میں نے تو دم لیا ہے
فسانۂ دلِ زار کا کہتے تھے!

وہ بھی یہ عدمِ تشدد کے پرستار اور علمبردار ہی تھے جنہوں نے ہر اصول، ہر معاہدہ اور

ہر قدر کو بالائے طاق رکھ کر جوناگڑھ پر زبردستی قبضہ کر لیا اور اعلان کر دیا کہ جوناگڑھ ہمارا حصّہ ہے اور وہ بھی عدم تشدد کے پرستار اور علمبردار ہیں جن میں اتنی ہمت بھی نہیں کہ گو کو تنہا بھی نظر سے دیکھ لیں۔ یہ لوگ کتنی آسانی سے عقیدہ کو پالیسی میں اور پالیسی کو عقیدہ میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ ہندوستان کے اردو شاعر کے محبوب کی طرح کہ اس نے اپنے دل کو

شب موم کر لیا، سحر آہن بنا لیا

(۲)

سیاسی زبان میں گفت گو کیجئے تو یہ "ڈپلومیسی" ہے۔ صاف بیانی سے کام لیجئے تو یہ منافقت ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر ورکنگ کمیٹی کی تجویز سے اختلاف تھا اور تشدد میں حصہ لینا کسی طرح گوارا نہیں تھا تو ان ممبران ورکنگ کمیٹی کو غیر مشروط طور پر استعفیٰ دے دینا چاہیے تھا لیکن استعفیٰ کو اس وقت تک ملتوی رکھنا جب تک برطانوی حکومت آزادی دینے پر رضامند نہیں ہو جاتی نہایت پست قسم کی سیاست ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوا کہ اگر برطانوی حکومت آزادی دینے پر کسی صورت سے رضامند نہ ہوئی تو ہم تشدد کا ہتھیار ہیں جو چاہے آزمالے۔ آخر یہ کون سی منطق ہوئی۔

(۳)

مولانا نے فرمایا ہے "جب انگریزوں نے کانگرس کا دستِ تعاون جھٹک دیا" تو گاندھی جی سول نافرمانی کی تیاری کرنے لگے۔

واقعات کی ترجمانی اگر مولانا کے الفاظ کر رہے ہیں تو انگریزوں کی اس حرکت ناشائستہ کا جواب سول نافرمانی ہی ہو سکتی تھی۔

لیکن نہیں واقعہ یہ نہیں ہے!

لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند نے گاندھی جی اور قائداعظم سے تعاون کی درخواست کی دونوں نے اپنے اپنے شرائط پیش کیے۔ قائداعظم صرف اتنا مانگتے تھے جو اُن کا حق تھا۔ گاندھی جی اپنا اور قائداعظم کا اور دوسری اقلیتوں کا حصّہ بھی اپنی جیب میں ڈال لینا چاہتے تھے۔ بات یوں نہیں بنی وائسرائے کے لیے گاندھی جی کا اتنا خطرناک

"دست تعاون" جھٹک لینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

گاندھی جی نے سوچا یہ جنگ کا زمانہ ہے، انگریز پریشان ہیں۔ اگر سول نافرمانی یعنی عدم تشدد کے ذریعے تشدد کا مظاہرہ کیا جائے تو انگریز مجبور ہو جائیں گے کہ اکثریت کو راضی رکھنے کے لیے اس کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اقلیتوں کو ٹھکرا دیں، بدقسمتی سے ان کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اب انہوں نے دباؤ ڈالنا چاہا اور سول نافرمانی شروع کر دی یہ سول نافرمانی کی تحریک جتنی انگریزوں کے خلاف تھی اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کے خلاف تھی۔

(۴)

گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی ناکام ہوئی، وہ بھی جیل سے باہر آگئے اور دوسرے رہنمایان کانگرس بھی۔

یہ حضرات یہ تو سوچ رہے تھے کہ:

"ہمارا کوئی قدم آگے نہ اٹھ سکا۔"

لیکن اس حقیقت پر غور نہ کر سکے کہ کیوں نہ اٹھ سکا؟ یہ انگریزوں سے سب کچھ چھین سکتے تھے بشرطیکہ دوسروں سے بھی سب کچھ چھین لینے پر آمادہ نہ ہو جاتے، انگریز بھی ہوشیار ہو گئے اور دوسرے بھی چوکنے ہو گئے اور انہیں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ:

"ہم حالات کا شکار بنے ہوئے تھے۔ اپنی قسمت کے مالک نہیں۔"

---

(۴)

عدمِ تشدد کا عقیدہ "حسبِ ضرورت"

گاندھی جی کا عدمِ تشدد بے نقاب سوبھاش چندر بوس کی خدمت میں گاندھی جی کا خراجِ تحسین ان عوامل میں سے ایک تھا جنہوں نے ہندوستان میں کرپس مشن کی آمد کے وقت فضا کو زیادہ ناسازگار بنا دیا تھا۔

اس مسئلہ پر میں آگے چل کر تفصیل سے گفتگو کروں گا یہاں صرف اس رپورٹ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو کرپس کی آمد کے وقت ہندوستان میں شائع ہوئی تھی، ہندوستان میں ایک خبر یہ چھپی کہ سوبھاش چندر بوس ایک ہوائی حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ یہ خبر جتنی ہندوستان کے لیے سنسنی خیز ثابت ہوئی اتنی ہی گاندھی جی کے لئے، انہوں نے تعزیت کا ایک پیغام بوس کی والدہ کو بھیجا جس میں ان کے بیٹے کو شاندار خراجِ تحسین اس کے ناقابلِ فراموش خدمات کے سلسلہ میں ادا کیا گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا، یہ خبر غلط تھی۔ کرپس نے مجھ سے شکایت کی کہ وہ گاندھی جی جیسے شخص سے یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ وہ سوبھاش چندر بوس کے لیے اتنے شاندار الفاظ استعمال کریں گے۔ گاندھی جی عدمِ تشدد کے عقیدہ پر سختی سے قائم ہیں، اس کے برعکس سوبھاش چندر بوس نے کھلے بندوں محوریوں کا ساتھ دیا اور میدانِ جنگ میں اتحادیوں کی شکست کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ (۱)

(۱) ص: ۱۴۱

(گاندھی جی کی نمائندہ خصوصی میرابن سے جب وائسرائے نے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تو)۔

بغاوت اور عدم تشدد

"مہادیو ڈیسائی نے ایک بیان جاری کیا کہ بعض حلقوں میں گاندھی جی کے عزائم سے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے، یہ کہنا درست نہیں کہ گاندھی جی نے انگریزوں کے خلاف عدم تشدد پر مبنی باغیانہ تحریک چلانے کا پروگرام بنا لیا ہے۔

میں اعتراف کرتا ہوں، مہادیو ڈیسائی کے بیان نے مجھے متحیر کر دیا یہ واقعہ ہے کہ گاندھی جی نے جواہر لال کا پکڑ لیا اور عدم تشدد پر مبنی انقلاب کی باتیں شروع کر دیں۔ ممکن ہے (اس لفظ کا کوئی خاص مفہوم ان کے دماغ میں موجود ہو) لیکن عوام کا تعلق جہاں تک ہے، انہوں نے اس لفظ کا مطلب یہی لیا کہ کانگرس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ عدم تشدد کا راستہ ترک کر کے انگریزوں کو اختیارات سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا جائے۔ (۲)

(ص: ۸۱)

شرکت جنگ کے لیے گاندھی جی تیار

(۱۹۴۴ء گاندھی جی رہا ہو چکے ہیں، اپنے سابقہ اعلانات کے برعکس (رنیوز کرانیکل، لندن) میں اعلان کرتے ہیں کہ اگر ہندوستان آزاد کر دیا جائے تو وہ مساعی جنگ میں برطانوی حکومت سے پورا تعاون کرے گا۔)

میں یہ کہے بغیر کسی طرح بھی نہیں رہ سکتا کہ تشدد اور عدم تشدد کے مسئلہ پر گاندھی جی کے مقرب بارگاہ متبعین تک میں قلب ماہیت کا منظر میں نے دیکھا، سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد، اچاریہ کرپلانی اور ڈاکٹر پرفلا گھوش نے اس وقت فوراً اپنا استعفا پیش کر دیا تھا، جب کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ایک تجویز منظور کی تھی کہ اگر ہندوستان آزاد کر دیا جائے تو مساعی جنگ میں ہندوستان پورا پورا تعاون کرے گا۔ ان حضرات نے اپنے خط میں مجھے لکھا تھا کہ عدم تشدد ان کی نظر میں ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ عقیدہ ہندوستان کی آزادی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ مگر ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ہندوستانی فوج منتشر کر دی جائے بلکہ اس کے برعکس انہوں نے اصرار کیا کہ ہندوستانی فوج بھی تقسیم کر دی جائے اور تقسیم شدہ ہندوستانی فوج فوراً گورنمنٹ آف انڈیا کے کنٹرول میں لے لی جائے اور یہ اصرار اس تجویز کے بالکل برعکس

تھا جو اس وقت کے کمانڈر انچیف نے پیش کی تھی کہ تین سال تک مشترک فوج اور مشترک کمان کرتے رہیں لیکن ان حضرات نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ اگر عدم تشدد واقعی ان کا عقیدہ تھا تو انہوں نے اس گورنمنٹ کا بوجھ اپنے کندھوں پر کیوں اٹھایا جو فوج پر ایک ارب روپیہ سالانہ سے زیادہ خرچ کر رہی تھی بلکہ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ ان میں بعض حضرات مسلح افواج کے مصارف میں اضافہ کے نہ کہ کمی کے خواہش مند تھے اور آج وہ خرچہ دو ارب روپیہ سالانہ سے زائد ہو چکا ہے۔ (۳۳) (ص ۹۴، ۹۵)

مولانا کی ان تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی جی اور ان کے پارٹی کے متبعین اور عام رہنمایان کانگرس "عدم تشدد" کے عقیدہ پر بے شک استوار تھے لیکن صرف حسب ضرورت! یعنی اگر شکست کا اندیشہ ہو تو عدم تشدد کے بیکر، فتح کا امکان ہو تو تشدد کے اوتار، جو لوگ انگریزوں کی شمشیر و سنان اور توپ و تفنگ کے سامنے عدم تشدد کے پیرو تھے جب ان کے قبضہ میں شمشیر و سنان اور توپ و تفنگ کی قوت آئی تو حیدر آباد و کشمیر، جونا گڑھ اور حریت طلب ناگا قبائل کے لیے وہ چنگیز و ہلاکو بن گئے۔ اقبال نے انگریزوں کی ہوس استعمار سے جل کر کہا تھا ؎

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

لیکن اگر وہ گانگرسی سامراج کے کرشمے دیکھنے کے لیے زندہ رہتے تو یہی بات کانگرس کے لیے کہتے۔

اب ذرا مولانا کی تصریحات بالا سے متعلق کچھ تشریحات پیش کروں گا۔

(۱)

گاندھی جی سبھاش چندر بوس کے پرانے حریف و رقیب تھے، بوس جواہر لال کی طرح نیاز مند نہ تھے۔ خود دار اور خود شناسی کے جوہر سے بہرہ ور تھے۔ گاندھی جی کے مسلک کے خلاف انہوں نے ہندوستان سے راہ فرار اختیار کی، افغانستان ہوتے ہوئے محوریوں کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ آزاد ہند فوج بنائی اور ہندوستان پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں، ان حالات میں گاندھی جی نے حسب معمول پلٹا کھایا اور بوس کی متشددانہ سرگرمیوں کے ہمنوا ہو گئے کیونکہ ہندوستان کی رائے عامہ یہی تھی اور انگریزوں پر دباؤ اسی طرح پڑ سکتا تھا کہ

سوبھاش کے تشدد اور گاندھی کے عدمِ تشدد میں سے جو چیز بھی چاہے منتخب کر لیں۔ ان دو کے علاوہ تیسری چیز نہیں تھی۔

(۲)

صرف عوام ہی نے نہیں خواص نے بھی مطلب یہی نکالا اور گاندھی جی کے الفاظ کا مطلب بھی یہی تھا کہ اب بغاوت ہوگی، عدمِ تشدد روپوش ہو جائے گا اور تشدد کی کارکردگی شروع ہو جائے گی اور بعد میں ان کانگریسیوں کے ہاتھوں کون سی منزل تھی تشدد کی جو سر نہ ہوئی؟

حکومتِ ہند نے گاندھی جی کے متشددانہ بیانات، بغاوت، انقلاب اور خون کی ندیوں سے متعلق اعلانات کا ایک دلچسپ مجموعہ ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع کیا تھا جس میں تفصیل سے گاندھی جی کی خونی تشدد پسندی آشکارا کی گئی تھی اور ان کے اقوال زریں بسط و تفصیل سے درج کیے گئے تھے۔

(۳)

یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کانگریس نے عدمِ تشدد کی پالیسی صرف حسبِ ضرورت اور مصلحت اختیار کی، خود گاندھی جی کا رویہ بھی یہی رہا، مولانا کو حیرت اس پر ہے کہ یہ حضرات اس آسانی سے اپنے خیالات میں تبدیلی اپنے عقائد میں تغیر اور اپنے مسلک میں انقلاب کس طرح پیدا کر لیتے تھے؟ اور ہم کو اس پر حیرت ہے کہ مولانا ان متلون کیشوں کے ساتھ کس طرح ساری زندگی نباہ دے گئے۔

---

(۵)

کانگرس اور گاندھی جی سے میرا اختلاف

تریاق زہر آلود گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نے صوبائی آزادی کا موقع بہم پہنچایا تھا لیکن یہ تریاق زہر آلود تھا، مخصوص اختیارات گورنروں کے ہاتھ میں تھے وہ جب چاہتے ہنگامی صورت حال کا اعلان کر سکتے تھے اور اس اعلان کے ساتھ دستور معطل کر دینے اور سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینے کا انہیں حق بھی حاصل تھا۔ گویا صوبوں میں جمہوریت گورنروں کے رحم و کرم پر تھی۔ پھر یہاں تک مرکزی حکومت کا تعلق تھا حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ پوری کوشش دو عملی قائم رکھنے کی حکومت نے کی تھی۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نقائص نہ صرف یہ کہ مرکزی حکومت ایک کمزور وفاق ہوتی ایک مصیبت یہ تھی کہ والیان ریاست اور دوسرے مفادات کو پاسنگ دے کر اسے بھی بے کار کر دیا گیا تھا کھلی ہوئی بات تھی کہ والیان ریاست برطانوی حکام ہی کا ساتھ دیتے۔

کانگرس کا اختلاف لہٰذا یہ کوئی تعجب خیز بات نہ تھی کہ کانگرس جو آزادی کامل کی جدوجہد کر رہی تھی ان انتظامات کو قبول نہیں کر سکتی تھی۔ کانگرس نے واضح الفاظ میں مجوزہ مرکزی وفاق کی مخالفت کی تھی۔ ایک عرصہ دراز تک ورکنگ کمیٹی بھی مجوزہ صوبائی اصلاحات کی مخالفت کرتی رہی تھی۔ کانگرس کا ایک بڑا گروہ سرے سے انتخابات میں حصہ لینے ہی کا مخالف تھا، لیکن میری رائے بالکل مختلف

تھی۔ میرا خیال تھا کہ انتخابات کا مقاطعہ کرنا غلطی ہے۔ اگر کانگرس نے ایسا کیا تو ناپسندیدہ عناصر مرکزی اور صوبائی مجالس آئین ساز پر قابض ہو جائیں گے وہ جو کچھ کہیں گے ترجمانِ قوم کی حیثیت سے کہیں گے۔ علاوہ ازیں الیکشن کی مہم نے عوام کی سیاسی تربیت کا ایک بہترین مواقع فراہم کر دیا ہے۔ آخر کار میرے رائے مان لی گئی۔ کانگرس نے انتخابات میں حصہ لیا جس کے شاندار نتیجہ کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ (۱) ص: ۱۳۱۔

کانگرس کی قیادت کا باہمی اختلاف

اب صورتِ حال یہ تھی کہ کانگرس کی قیادت اختلاف باہمی کا شکار ہو رہی تھی۔ نئے اختلافات پیدا ہوئے۔ ایک گروہ وزارت قبول کرنے کا مخالف تھا، اس کا خیال تھا کہ گورنروں کے مخصوص اختیارات کی موجودگی میں صوبائی آزادی کا تصور ایک مذاق سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس کو یہ خیال بھی تھا کہ کانگرس کو مجلس آئین ساز کے اندر پہنچ کر اس آئین کی دھجیاں اڑا دینی چاہئیں نہ کہ وزارت قبول کر کے اسے کامیاب بنانا۔ میری رائے اس معاملے میں بھی مختلف تھی کہ گورنروں سے کانگرسی وزارت کی تحریک کے مسئلے پر غور کیا جائے جب یہ اندیشہ واقعہ کی صورت اختیار کر لے۔

تاریخی فیصلہ

لیکن جب وائسرائے نے یہ یقین دلا دیا کہ گورنر کانگرسی وزارتوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے تو ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبروں کی رائے بدل گئی، وہ وزارت قبول کرنے پر تیار ہو گئے لیکن مشکل یہ تھی کہ کانگرس اتنی پرزور اور مسلسل مخالفت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی کر چکی تھی کہ کوئی شخص بھی یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ جواہر لال صدرِ کانگرس تھے۔ وہ اتنے واضح الفاظ میں وزارت قبول کرنے کی مخالفت کرتے رہے تھے کہ اب ان کا وزارت قبول کرنے کی تجویز پیش کرنا بہت مشکل تھا۔ وار دھا میں جب ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرے رفقا حقائق کا مقابلہ کرنے میں متامل اور متذبذب نظر آ رہے تھے لہٰذا میں نے بے جھجک تجویز پیش کر دی کہ کانگرس کو وزارت قبول کر لینی چاہیے۔ کچھ بحث مباحثے کے بعد گاندھی جی میری تائید میں ہو گئے اور کانگرس نے صوبوں میں وزارتیں قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا، یہ ایک تاریخی فیصلہ تھا کیونکہ اب تک کانگرس منفی پالیسی پر عمل پیرا اور

ذمہ داریاں قبول کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ لیکن اب پہلی مرتبہ کانگریس نے ایک مثبت رویہ اختیار کیا تھا اور حکومت کا بار اٹھا لینے پر آمادہ ہو گئی تھی۔

(ص ۱۴، ۱۵)

دوسری عالمگیر جنگ یہ بات روز بروز واضح تر ہوتی چلی جا رہی تھی کہ عالمگیر جنگ اب کسی کے روکے نہیں رک سکتی۔ جرمن ریش (پارلیمنٹ) سے آسٹریا کا الحاق سڈیٹن لینڈ کے مطالبے کے فوراً بعد عمل میں آگیا تھا۔ مسٹر چیمبرلین نے ڈرامائی انداز میں جب میونخ کا سفر کیا تو بظاہر برطانیہ اور جرمنی میں سمجھوتہ ہو گیا اور چیکوسلواکیہ کا ایک حصہ بغیر جنگ کے جرمنی کے حصے میں آگیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جنگ کا خطرہ ٹل گیا لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ میونخ کا معاہدہ امنِ عالم کے لیے سازگار نہیں ثابت ہوا، بلکہ اس کے برعکس اس نے جنگ کو اور زیادہ قریب کر دیا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے ایک سال کے اندر اندر برطانیہ کو جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا۔

گاندھی جی کی روش سے اختلاف گاندھی جی نے ورکنگ کمیٹی کو مشورہ دیا کہ بین الاقوامی بحران کے اس موقع پر ہندوستان کا موقف واضح کرے۔ گاندھی جی کی رائے یہ تھی کہ کسی حالت میں بھی ہندوستان کو شریکِ جنگ نہیں ہونا چاہیے۔ اگرچہ اس شرکت کے صلے میں ہندوستان کو آزادی ہی کیوں نہ ملتی ہو میں اس معاملے میں گاندھی جی کا ہمنوا نہ تھا۔ میرا خیال یہ تھا کہ یورپ دو ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے ایک طرف نازیت اور فسطائیت ہے دوسری طرف جمہوری عناصر، ان دونوں کی کشمکش میں اگر ہندوستان کو آزادی سے ہمکنار ہونا ہو تو اسے جمہوری عناصر کا ساتھ دینا چاہیے

(ص ۲۴، ۲۵)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا ابوالکلام اپنی انفرادیت، ہر جگہ اور ہر حالت میں اور ہر ایک کے سامنے قائم رکھتے تھے، اور یہ رائے کسی کی نیازمندی یا تقلید یا رعب کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتی تھی بلکہ سوچ سمجھ کر تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد وہ کوئی رائے قائم کرنے کے عادی تھے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ گاندھی جی اور جواہر لال کے اقوال کو

گفتۂ او، گفتۂ اللہ بود!

سمجھا کرتے تھے لیکن یہ غلط ہے، جواہر لال ہوں یا گاندھی جی یا کوئی اور صاحب وہ دوسروں کو اپنی رائے کا تابع بنانے کی کوشش ضرور کرتے تھے لیکن خود دوسروں کی متابعت کریں یہ بات اُن کی فطرت سے بعید تھی۔

وہ کانگرس میں خدمات اور قربانی کے اعتبار سے گاندھی جی سے بھی ٹکر لے سکتے تھے جواہر لال یا دوسروں کا کیا ذکر۔ اُن کی فکر رسا اور نگاہ بلند کا اندازہ کرنا ہو تو صرف اس گفتگو کا مطالعہ کر لینا ہی کافی ہوگا جو انہوں نے سر اسٹیفرڈ کرپس سے جب وہ "کرپس مشن" پر ۱۹۴۲ء میں دہلی تشریف لائے تھے کی تھی، حیرت ہوتی ہے کہ عالمی سیاست کے اُلجھے ہوئے مسائل پر دستورِ ہند کے پیچ در پیچ مرحلوں پر مجوزہ برطانوی دستور کے آئینی مضمرات و مندرجات پر گفتگو وہ شخص کر رہا ہے جس نے کسی کالج یا یونیورسٹی سے نہ سیاسیات کا درس لیا ہے نہ کسی دار العلوم اور دار الفنون کا متعلّم رہ چکا ہے، جس نے جو کچھ پڑھا جو کچھ سیکھا، جو کچھ حاصل کیا وہ اپنے گھر میں، اپنے مطالعے سے، اپنے مشاہدے کے بل پر جو ٹھوس اور خالص آئینی و دستوری اعتراضات گاندھی جی اور جواہر لال کو بھی نہیں سوجھے تھے۔ اس نے بین الاقوامی سیاست کے ایک نامور کھلاڑی کو زِچ کر دیا۔

لیکن مولانا آزاد کی یہ بدقسمتی تھی کہ وہ مسلمان تھے اس لیے وہ بہترین دلائل سے مسلّح ہونے کے باوجود ہمیشہ شکست خوردہ رہتے۔ اُن کی خود نوشت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر انہیں کانگرس ہائی کمان سے بنیادی معاملات و مسائل میں اختلاف کرنا پڑا اور بعد میں ان کی رائے مان بھی لی گئی، لیکن اس وقت جب گاندھی جی نے ساتھ دیا، یا جواہر لال نے ان کی پشت پناہی کی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ۱۹۲۴ء میں کانگرس کا سالانہ سیشن بمبئی میں ورلی کے میدان میں منعقد ہوا۔ موجودہ صدرِ جمہوریہ ہند راجندر پرشاد صدرِ اجلاس تھے۔ میں روزنامہ "خلافت" کا چیف ایڈیٹر تھا۔ مجھے نہ صرف اس اجلاس میں شرکت کا بلکہ ڈائس کے بالکل قریب بیٹھنے اور ورکنگ کمیٹی مجلسِ مضامین (سبجیکٹس کمیٹی) اور عام اجلاس کی کارروائیوں کے مشاہدہ کا موقع ملا۔

کھلے اجلاس میں پیش ہونے والی ہر تجویز کے لیے ضروری تھا وہ مجلسِ مضامین کے مرحلے سے پہلے گزرے یہاں گاندھی جی ایک گوشے میں بیٹھے چرخہ کات رہے تھے۔

سردار پٹیل اپنی گھنی اور بڑی مونچھوں سے کھیل رہے تھے اور قہقہہ لگا رہے تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو بڑی سنجیدگی سے اپنے ہمعصر لیڈروں پر فقرے چست کر رہی تھیں۔ ان فقروں سے وہ خود کم لطف اندوز ہوتی تھیں، دوسرے زیادہ۔ مولانا آزاد مسند پر ایک تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور مسز نائیڈو کی شوخی اور بذلہ سنجی سے وقار و تمکنت کے ساتھ لطف اندوز ہو رہے تھے۔

مجلس مضامین جو تجویز زیر بحث لاتی اگر اس کی تحریک و تائید کسی ہندو لیڈر کی طرف سے ہوتی تھی تو بسر و چشم قبول کر لی جاتی، خواہ اس کی تقریر کتنی ہی پھس پھسی اس کے دلائل کتنے ہی بودے اور اس کا انداز بیان کتنا ہی لچر ہو حاضرین ہمہ تن گوش ہو کر اس کے ارشادات سنتے تھے لیکن جب مولانا آزاد کسی تجویز کی تحریک یا تائید کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حاضرین ان کی خطابت سے متاثر ہیں نہ ذہانت سے وہ صرف یہ چاہتے کہ بس تقریر ختم ہو جائے، بعض لوگ تو تقریر سننے کے بجائے گپ بازی میں مصروف ہو جاتے تھے اور مولانا کی تقریر کے بعد جدھر چاہتے تھے ہاتھ اٹھا دیتے تھے۔

ان حالات میں مولانا کا کانگریس میں شامل رہنا بڑے دل گردہ کا کام تھا لیکن ان کے پائے ثبات میں جنبش نہ آئی۔ مزید حیرت اس پر ہے کہ وہ اختلاف بھی کرتے تھے تو کسی نہ کسی بڑے ہندو لیڈر کی آڑ لے کر کبھی گاندھی جی کا سہارا لے کر کبھی موتی لال یا جواہر لال کے سہارے تب اپنا اختلاف منوا پاتے تھے۔

اس موضوع پر ہم نے مولانا کے جن خیالات کو پیش کیا ہے ان میں بعض پہلو تشنہ گفتگو ہیں، ان پر گفتگو ضروری ہے۔

(۱)

اس زمانے میں کانگریس کے اندر دو گروہ تھے ایک وہ جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ تباہ (WRECK) کرنا چاہتا تھا، دوسرا وہ جو (WORK) عمل میں لانا چاہتا تھا مولانا آخری گروہ سے تعلق رکھتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مولانا ان لوگوں میں تھے جو (WORK) کر کے اسے (WRECK) کرنا چاہتے تھے۔ حیرت اس پر ہے کہ مولانا کے ذہن رسا نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ ان الجھنوں میں پڑنے کے بجائے بہترین راہ عمل یہ ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی قومیں خود باہمی اشتراک و تعاون سے اپنا دستور بنائیں

اور اُسے حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کر کے اُس سے مطالبہ کریں کہ یہ ہے ہمارا دستور جسے تم منظور کرنے پر مجبور رہو۔

۱۹۲۶ء میں لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند نے ہندوستان کو چیلنج دیا تھا کہ ہم ہندوستان کو آزاد کرنے پر تیار ہیں لیکن ہندوستان اپنے باہمی اختلافات رفع کر کے ایک متفقہ دستور بھی نہیں بنا سکتا وہ آزاد ہندوستان کا انتظام کیا کر پائے گا۔

برکن ہیڈ کے ان الفاظ پر کانگرس، خلافت اور مسلم لیگ کے لیڈر، گاندھی جی، محمد علی، شوکت علی اور مسٹر جناح بہت بگڑے تھے۔ کانگرس نے تو پنڈت موتی لال نہرو کی زیر صدارت ایک کمیٹی بھی بنا دی جس کا کام یہ تھا کہ "متفقہ دستور ہند" تیار کرے۔ اس کمیٹی کے مسلمان ممبروں میں شعیب قریشی بھی شامل تھے۔ پھر بعد میں خلیق الزماں اور تصدق احمد خاں شیروانی بھی شامل کر لیے گئے لیکن یہ کمیٹی متحدہ و متفقہ دستور تو کیا بناتی خود باہمی اتفاق بھی قائم نہ رکھ سکی۔ ہندو ممبر الگ، مسلم لیگ سکھ الگ لیکن گاندھی جی بضد تھے کہ یہ ہندوستان کا متفقہ دستور ہے چنانچہ کانگرس نے اختلافات کے نعروں میں یہ "متفقہ دستور ہند" منظور کر لیا۔

بلا سے جان ہے غالب اس کی ہر بات

۱۹۲۴ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک آزادی ہند کی منزل تک پہنچنے کے لیے "متفقہ دستور ہند" کی حسب ذیل کوششیں عمل میں آئیں۔

۱۔ ۱۹۲۴ء۔ گاندھی جی کا ۲۱ روزہ برت مولانا محمد علی کے مکان پر دہلی میں،

۲۔ ۱۹۲۶ء۔ شملہ یونٹی کانفرنس شملہ، نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال نے اس اجتماع کے سامنے اتحاد کی ضرورت پر ایک دل ہلا دینے والی تقریر کی۔

۳۔ ۱۹۲۷ء۔ مسٹر جناح کے مشہور چودہ نکات جنہیں انفرادی طور پر کانگرس لیڈروں نے اور اجتماعی طور پر مسلم زعماء نے منظور کیا۔

۴۔ ۱۹۲۸ء۔ نہرو کمیٹی (لکھنؤ)

۵۔ ۱۹۲۹ء۔ کانگرس کی زیر سرپرستی نیشنل کنونشن کا انعقاد (کلکتہ)

۶۔ ۱۹۲۸-۲۹ء۔ حکومت برطانیہ کا قائم کردہ اصلاحات سیاسی کا کمیشن جس کے صدر لارڈ سائمن تھے اور جو "سائمن کمیشن" کے نام سے مشہور تھا۔

۷۔ سنہ ۱۹۲۸،۲۹ء۔ نائر کمیٹی، سائمن کمیشن کی دہلی کمیٹی، جس کے صدر سر سنکرن نائر تھے اور ممبروں میں جیکر اور سپرو جیسے لوگ شامل تھے۔

۸۔ سنہ ۱۹۲۹ء۔ مسلم کانفرنس، دہلی میں سر آغا خاں کی زیر صدارت۔

۹۔ سنہ ۱۹۳۱،۳۲ء۔ گول میز کانفرنس لندن، جس میں ہندوستان کی سیاسی جماعتیں شریک ہوئیں۔ کانگریس کی طرف سے گاندھی جی اور مسز نائیڈو نے شرکت کی۔

۱۰۔ سنہ ۱۹۳۲ء۔ یونٹی کانفرنس الہ آباد۔

۱۱۔ سنہ ۱۹۳۳ء۔ یونٹی کانفرنس، کلکتہ،

۱۲۔ سنہ ۱۹۳۴ء۔ ”جناح راجندر پرشاد مذاکرات“، بمبئی میں۔

۱۳۔ سنہ ۱۹۳۵ء۔ جناح جواہر لال مراسلت، پھر ملاقات،

۱۴۔ سنہ ۱۹۳۶ء۔ جناح گاندھی خط و کتابت، پھر ملاقات،

۱۵۔ سنہ ۱۹۳۷ء۔ جناح بوس ملاقات،

۱۶۔ سنہ ۱۹۳۰ء۔ جناح جواہر لال ملاقات،

۱۷۔ سنہ ۱۹۳۹ء۔ گاندھی لن لتھگو ملاقات،

۱۸۔ سنہ ۱۹۳۹ء۔ جناح لن لتھگو ملاقات،

۱۹۔ سنہ ۱۹۴۰ء۔ روز ویلٹ چرچل گفتگو (خفیہ)

۲۰۔ سنہ ۱۹۴۱ء۔ چرچل حکومت اور چین کا تبادلۂ خیال (خفیہ)

۲۱۔ سنہ ۱۹۴۲ء۔ چیانگ کائی شیک، متحدہ چین کے سربراہ مملکت کا کلکتہ اور دہلی میں ورود، آزادیٔ ہند اور اقوام ہند کی مفاہمت باہمی پر جواہر چیانگ پھر گاندھی چیانگ ملاقات،

۲۲۔ سنہ ۱۹۴۲ء۔ کرپس مشن

۲۳۔ سنہ ۱۹۴۲ء صدر روز ویلٹ کی اپیل کانگریس سے کہ تجاویز کرپس قبول کرکے آزادیٔ ہند کی طرف قدم بڑھانا چاہیے۔

۲۴۔ سنہ ۱۹۴۴ء۔ سپرو کمیٹی، سر تیج بہادر سپرو کی قائم کردہ دستوری کمیٹی،

۲۵۔ سنہ ۱۹۴۴ء۔ گاندھی جناح ملاقات اور خط و کتابت،

۲۶۔ سنہ ۱۹۴۴ء۔ جناح راجہ جی ملاقات۔

۲۷۔ ۱۹۴۵ء۔ لیاقت ڈیسائی فارمولا۔

۲۸۔ ۱۹۴۵ء۔ ویول پیشکش، شملہ کانفرنس، ویول کی گاندھی جی، جواہر لال، ابوالکلام آزاد، قائد اعظم وغیرہ سے گفتگو اور تبادلۂ خیال،

۲۹۔ ۱۹۴۵ء۔ "جناح پنت" گفتگو

۳۰۔ ۱۹۴۵ء۔ سپرو کمیٹی کی رپورٹ،

۳۱۔ ۱۹۴۶ء۔ کابینہ وفد کی آمد، تبادلۂ خیالات، سفارشات،

۳۲۔ ۱۹۴۶ء۔ مسٹر اٹیلی وزیر اعظم برطانیہ کی دعوت پر جواہر لال اور قائد اعظم کا سفر لندن، آخری کوشش۔

۳۳۔ ۱۹۴۷ء۔ نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی آمد، کانگرس اور لیگی لیڈروں سے مذاکرات۔

۳۴۔ ۱۹۴۷ء۔ ماؤنٹ بیٹن پلان۔ تقسیم ہند۔

گویا ۴۴ سال میں ۳۴ مرتبہ متحدہ دستورِ ہند بنانے کی ذمہ دار لوگوں نے کوشش کی مگر ہر مرتبہ وہ کانگرس کی ضد اور خود غرضی پر قربان ہو گئی جو کانگرس خود اپنے لیے حق خود ارادیت کی جویا تھی کامن ویلتھ میں شرکت تک کے لیے خود ارادیت کا حق حاصل کرنا چاہتی تھی وہ نو کروڑ آبادی رکھنے والی ایک قوم کو زبردستی اپنے ساتھ رکھنے پر مُصر تھی۔ یہ کانگرس لاکھوں کی آبادی رکھنے والے ممالک کی آزادی تسلیم کرتی تھی لیکن اُسے یہ گوارا نہ تھا کہ نو کروڑ کی آبادی رکھنے والی ایک قوم حقِ خود ارادیت سے بہرہ اندوز ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ متحدہ دستورِ ہند نہیں بنا سکی۔

آخر کار دستور بنے، دو جُدا گانہ اور نئی مملکتوں کے۔ ایک ہندوستان کا، ایک پاکستان کا — پاکستان!

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

(۶)

کرپس مشن

کرپس ہندوستان میں دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی سر اسٹیفرڈ کرپس نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس زمانہ میں انہوں نے مجھ سے متعدد ملاقاتیں کیں۔ اور ہم نے متعدد امور پر تبادلۂ خیالات کیا۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے دوران انعقاد میں وہ وارد ھا آتے اور کئی دن تک وہاں مقیم رہتے۔ مساعی جنگ میں ہندوستان کی شرکت قدرتی طور پر ہمارے موضوع گفتگو کا اہم ترین عنوان تھا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ اگر ہندوستان آزاد ہو گیا تو سارا ملک مساعی جنگ میں دل و جان سے حصہ لے گا۔ سر اسٹیفرڈ کرپس نے مجھ سے دریافت کیا کہ ایسے ہنگامی حالات میں کیا ہندوستان فوج میں جبری بھرتی کو بھی قبول کرے گا؟ میں نے جواب دیا اس کا خیر مقدم کریں گے اور اسے ملحوظ رکھیں گے کہ ہندوستان کی شرکتِ جنگ مکمل اور بامعنی ہو۔ (۱)

وزارتِ جنگ کا فیصلہ میں وارد ھا میں تھا کہ وائسرائے کا ایک ٹیلیگرام ملا جس میں لکھا تھا، برطانیہ کی وزارتِ جنگ نے فیصلہ کیا ہے کہ سر اسٹیفرڈ کرپس ہندوستان کے سامنے تجاویز مفاہمت پیش کریں لہٰذا مجھے دہلی پہنچ جانا چاہیے،، میں نے دعوت قبول کر لی۔

(ص: ۴۶، ۴۷، ۴۸)

سر کرپس سے پہلی ملاقات

سر اسٹیفرڈ کرپس سے میری ملاقات ۲۹ مارچ سنہ ۴۲ء کو تین بجے سہ پہر کے وقت ہوئی۔ انہوں نے اپنی تجاویز پیش کرتے ہوئے مجھ سے کہا وہاں پر بحث و گفتگو اور اگر ضرورت ہو تو ان کی تشریح و توضیح کے لیے تیار ہیں۔ ان تجاویز کی رُو سے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی از سرِ نو تشکیل عمل میں آتی۔ موجودہ ممبران ایگزیکٹو کونسل کو مستعفی ہونا پڑتا۔ کانگریس اور دوسری نمائندہ سیاسی جماعتوں کے نامزد اصحاب ممبر بنا لیے جاتے۔ دورانِ جنگ تک یہی کونسل کام کرتی، اختتامِ جنگ کے بعد برطانوی حکومت کا عہد تھا کہ آزادیٔ ہند کا مسئلہ فوراً طے کر دیا جائے گا۔

مجوزہ ایگزیکٹو کونسل

ان تجاویز کی رُو سے ایگزیکٹو کونسل انگریز ممبروں کی بجائے صرف ہندوستانی ممبروں پر مشتمل ہوتی۔ انگریز افسران سیکرٹری کی حیثیت سے تا اختتامِ جنگ نظامِ حکومت میں بہرحال کوئی تبدیلی نہ ہوتی۔

سوال و جواب

میں نے سر اسٹیفرڈ سے دریافت کیا کہ ایگزیکٹو کونسل میں وائسرائے کی حیثیت کیا ہوگی؟ سر اسٹیفرڈ نے جواب دیا، وائسرائے ویسے ہی دستوری سربراہِ حکومت ہوں گے جیسے انگلستان میں بادشاہ! ہر طرح کے شبہات رفع کرنے کے خیال سے میں نے کہا تو اس کی توثیق کیجئے کہ دستوری سربراہِ حکومت کی حیثیت سے وائسرائے کونسل کے مشورے قبول کرنے کا پابند ہوگا۔ کرپس نے کہا کہ مطلب یہی ہے میں نے دوبارہ سوال کیا، بنیادی سوال یہ ہے کہ اقتدار کا استعمال کون کرے گا۔ مجوزہ کونسل یا وائسرائے؟ سر اسٹیفرڈ نے کہا اقتدار و اختیار اسی طرح کونسل کے ہاتھ میں ہوں گے جیسے انگلستان میں برطانوی کابینہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا اس خاکہ میں انڈیا آفس کی حیثیت کیا ہوگی؟ اسٹیفرڈ نے کہا یہ سوال تفصیل طلب ہے جس پر انہوں نے ابھی غور نہیں کیا لیکن مجھے یقین دلایا کہ اس سلسلہ میں کانگریس کے جو خیالات ہوں گے ان کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ بعد میں کچھ سوچ کر سر اسٹیفرڈ نے یہ اضافہ کیا کہ انڈیا آفس قائم رہے گا، وزیرِ ہند بھی موجود رہے گا۔ لیکن اس کی پوزیشن ڈومنین سیکرٹری کی ہوگی۔

ہماری پہلی ملاقات خوشگوار اور پُر امید ماحول میں ختم ہوئی۔

(گاندھی جی کرپس سے ملتے ہیں) ص: ۴۹

گاندھی جی سے نوک جھونک

ملاقات کے دوران میں گاندھی جی اور کرپس کے مابین نوک جھونک بھی ہوئی لیکن خالص دوستانہ انداز میں۔

گاندھی جی نے کہا یہ تجاویز اس قدر خشک اور بے لچک ہیں کہ بمشکل گفت و شنید کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ پھر انہوں نے ہنستے ہوئے کرپس کو متنبہ کیا کہ میں رسّی ڈھیلی چھوڑ رہا ہوں، انہیں ہوشیار رہنا چاہیے کرپس نے برجستہ کہا آپ جانتے ہیں میرے پاس اتنی لمبی رسّی ہے جو آپ کے گلے کا پھندا بن سکتی ہے۔

(ص: ۵۰)

گاندھی جی حق خود ارادیت کے مخالف

گاندھی جی پہلے ہی دن سے کرپس تجاویز قبول کرنے کے مخالف تھے۔ میرا خیال ہے ان کا یہ رویہ تجاویز کی مخالفت پر نہیں بلکہ جنگ سے نفرت پر مبنی تھا۔

تجاویز کا آخری حصہ بھی گاندھی جی کو پسند نہیں تھا جس میں کہا گیا تھا کہ اختتام جنگ کے بعد کانگرس اور مسلم لیگ کو فرقہ وارانہ گتھی سلجھانے کا موقع دیا جاتے۔

(ص: ۵۰)

کرپس مشن کی ناکامی کا سبب

کرپس مشن کی ناکامی نے ملک میں مایوسی اور بے عملی کی ایک لہر پیدا کردی بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ چرچل کابینہ نے سر اسٹیفرڈ کو چین اور امریکہ کے دباؤ سے مجبور ہو کر بھیجا تھا۔ ورنہ حقیقتاً چرچل کا یہ ارادہ نہ تھا کہ وہ ہندوستان کی آزادی تسلیم کرلیں۔ بہت سی سیاسی پارٹیوں کو بحث و گفتگو میں شریک کرنے کا مدعا یہ تھا کہ باہر کی دنیا پر ثابت کیا جاتے کہ کانگرس ہندوستان کی پورے طور پر نمائندگی نہیں کرتی اور ہندوستانیوں کی نااتفاقی وہ اصل سبب ہے جو انگریزوں کو اختیارِ حکومت منتقل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

(ص: ۷۰)

حق خود ارادیت پر غصہ

کرپس تجاویز میں سب سے زیادہ دکھ دینے والی بات یہ تھی کہ صوبوں کو انڈین یونین میں شامل نہ ہونے کا حق دیا

گیا تھا۔ گاندھی جی اس بات سے بہت آشفتہ خاطر تھے۔ انہوں نے سختی سے اس کی مخالفت کی۔ میں جب گاندھی جی سے کرپس کی پہلی ملاقات کے بعد ملا تو میں نے فوراً محسوس کر لیا کہ یہ تجاویز ان کے لیے قطعاً ناقابلِ قبول ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا اور فرقہ وارانہ مفاہمت ناممکن ہو جائے گی۔ (۲)

(ص: ۵۸)

ہندو مسلم اتحاد آزادی کا ضامن ہے میں نے اس مسئلہ پر کرپس سے گفتگو کی انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اگر ہندو مسلم مفاہمت ہو جائے تو آزادیٔ ہند کا مسئلہ ابھی طے ہو سکتا ہے۔ (۳)

(ص: ۵۸)

مشن ناکام ہو گیا ۹، اور ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کو افسوس کے ساتھ ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ کرپس تجاویز ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہیں۔ (۴)

(ص: ۵۸)

مولانا آزاد کی ان تصریحات سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱)

گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس کا اصول نہیں عقیدہ یہ تھا کہ وہ عدم تشدد پر سختی سے قائم ہے لیکن اختیاراتِ حکومت کا وعدۂ فردا کر لیا جائے تو وہ اس سے دستبردار ہو سکتی تھی۔ اور "جبری" فوجی بھرتی تک پر رضامند ہو سکتی تھی، یعنی ہندوستان سے وعدہ نہ ہو تو جو لوگ فوج میں داخل ہوں غدار اور ہندوستان سے آزادی کا وعدہ کر لیا جائے — وعدۂ فردا — تو جو ہندوستان کی فوج میں جبری بھرتی سے انکار کریں وہ غدار، جب تک آزادی کا وعدہ نہیں کیا جاتا، ہندوستان اتحادیوں کا دوست تھا لیکن محوریوں کا دشمن نہیں، لیکن جب وعدہ کا پوسٹ ڈیٹڈ چیک (PASTDATEDCHEQUE) مل جاتا تو اتحادی محبوب و مطلوب اور محوری، مردود و معتوب۔

مسلم لیگ کی ضد میں لارڈ ویول کو اپنے نمائندوں کی فہرست پیش کرتے وقت کانگریس نے کیا۔ آزاد ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں کیا؟

لارڈ ویول کو جو فہرست پیش کی گئی اس میں پہلا نام مولانا آزاد تھا لیکن جب

(الف) ہندوستانی کابینہ میں نائب وزیر اعظم کا عہدہ پیدا کیا گیا، تو پہلا نام سردار پٹیل کا تھا — حالانکہ مستحق مولانا آزاد تھے۔

(ب) پٹیل کے انتقال کے بعد بھی مولانا آزاد "سینئر موسٹ" ممبر تھے، لیکن یہ عہدہ ختم کر دیا گیا، مگر مولانا کو مستحق نہ سمجھا گیا حالانکہ ان کا جرم سوا اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے۔

(ج) ماؤنٹ بیٹن کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ اب کوئی ہندوستانی گورنر جنرل بنایا جائے تو پہلا نام راج گوپال اچاری کا پیش ہوا اور منظور ہوا، حالانکہ خدمات کے لحاظ سے سزاوار مولانا تھے۔

(د) پھر جب صدر جمہوریہ ہند کا منصب تخلیق ہوا تو بھی مولانا نظر انداز کر دیے گئے اور راجندر بابو کا پہلا اور آخری نام منظور کر لیا گیا۔ حالانکہ خدمات کے لحاظ سے، پٹیل، راجہ جی، راجن بابو سب مولانا کے سامنے طفل مکتب تھے۔

جس "قومی تنظیم" کا صحیح معنی میں یہ حال ہو اس سے ویول، ماؤنٹ بیٹن، کرپس، اٹیلی سب دھوکا کھا سکتے تھے لیکن قائد اعظم اس کے دام فریب میں نہیں آسکتے تھے۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جھٹکے میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

شملہ کانفرنس کی ناکامی کا سارا الزام کانگریس اور صدر کانگریس نے مسلم لیگ پر تھوپ دیا، لیکن کیا واقعہ یہی تھا؟

بمبئی کارپوریشن کے سابق میئر، اور ایک زمانہ میں کانگریس کے رکن مسٹر جمنا داس مہتہ نے ۱۶ جنوری ۱۹۴۵ء کو بیان دیتے ہوئے فرمایا:

"وائسرائے نے یہ کانفرنس لیاقت ڈیسائی سمجھوتہ کی بنا پر طلب کی تھی جس کی تحریک خود مہاتما جی نے کی تھی، ان حالات میں کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے کانگریس کا جوش و جذبہ قدرتی تھا، ناکامی کا اصل سبب ڈیسائی لیاقت سمجھوتہ پر کانگریس کا قائم نہ رہنا ہے۔

مسٹر جناح جس نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہیں میں اسے مسلمانوں
اور ہندوؤں بلکہ ہر ہندوستانی کے لیے خودکشی سمجھتا ہوں مگر کانگرس کے
مقابلہ میں مسٹر جناح نے وہی رویہ اختیار کیا جو تجویز پاکستان کے بعد اختیار
کیا جا سکتا تھا۔ اگر کانگرس پانچ ممبر مسلم لیگ کو دے دیتی تو مسٹر جناح
بھی نوابزادہ کی بات پر قائم رہتے جو اس سمجھوتہ کے دوسرے فریق تھے۔"

---

(۷)

شملہ کانفرنس

لارڈ ویول کا سفرِ لندن یورپ میں جنگ کی صورتِ حالات جیسے ہی بہتر ہوئی امریکہ نے برطانیہ پر زور دیا کہ ہندوستان کا مسئلہ حل کیا جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مئی ۱۹۴۵ء میں ہندوستان کے معاملات سلجھانے کے لیے لارڈ ویول لندن گئے تاکہ وزیرِ ہند سے صلاح و مشورہ کریں، طے یہ ہوا کہ ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے۔ یورپ میں تو اپریل ہی کے مہینہ میں عملی جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن ایشیا میں اس کے ختم ہونے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ جاپان اب تک ایک بہت بڑے علاقہ پر قابض تھا۔ سرزمین جاپان اب تک جنگ کی ہولناکیوں سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ امریکہ کا جہاں تک تعلق تھا جرمنی سے زیادہ جاپان کی شکست اس کے لیے اہمیت رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ یورپ ختم ہونے کے بعد صدر روزویلٹ اور مارشل اسٹالن نے جاپان پر حملہ کرنے کا عہد کر لیا۔ امریکی محسوس کر رہے تھے کہ اگر ہندوستان محفوظ کر لیا جائے تو جاپان کی شکست بہت آسان ہو جائے گی۔ برما، سنگاپور اور انڈونیشیا پر اب تک جاپان کا قبضہ تھا۔ ان تمام رقبوں کی تجدید فتح میں ہندوستان سے غیر معمولی مدد مل سکتی تھی۔ اگرچہ یورپ میں ہٹلر کا جنازہ نکل چکا تھا لیکن جاپان کی فوری شکست کے لیے ہندوستان کا تعاون لازمی تھا۔

مسٹر ایمرے کا بیان

مسٹر ایمرے وزیر ہند نے چودہ جون ۱۹۴۵ء کو پارلیمنٹ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا "ایک آزاد قوم کی حیثیت سے جنگ کے بارے میں ہندوستان کو فیصلہ کرنے کی پوری آزادی دی جائے گی۔" ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں سے تشکیل حکومت کے سلسلہ میں درخواست کر رہے ہیں۔ (۲)

عام تاثر

اس بیان نے ہندوستان پر عام تاثر یہ پیدا کیا کہ آخر کار ملک کی سیاسی گتھی حل ہونے کا وقت آگیا۔ لوگوں نے محسوس کیا کوئی وجہ نہیں ہے کہ کانگرس یہ پیش کش منظور نہ کرے۔ ہر روز سینکڑوں تار اور خطوط مجھے ملتے تھے جس میں زور دیا جاتا تھا کہ کانگرس کو یہ پیش کش منظور کر لینی چاہیے۔ رہائی کے دوسرے روز شملہ کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جو جون کو منعقد ہو رہی تھی وائسرائے کی طرف سے مجھے شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ (۳) (ص ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳)

ویول تجاویز

شملہ پہنچنے کے دوسرے روز میں وائسرائے سے ملا۔ وہ مہربانی سے پیش آئے اور مختصر طور پر وہ تجاویز انہوں نے میرے سامنے رکھیں جو برطانوی حکومت کی طرف سے لائے تھے۔ انہوں نے کہا دوران جنگ میں کوئی دوررس دستوری تبدیلی نہیں کی جا سکتی لیکن وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل مکمل طور پر ہندوستانی ممبروں پر مشتمل ہو گی اور وہ اس بات کی پوری کوشش کریں گے کہ ایسی روایت قائم کریں کہ وائسرائے ہمیشہ کونسل کے مشورہ پر کاربند رہا کرے۔ انہوں نے مجھ سے اپیل کی کہ حکومت پر اعتماد کروں۔ یہ ان کی مخلصانہ تمنا تھی کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی ہندوستان کا مسئلہ طے کر دیا جائے۔ انہوں نے بتایا کہ جنگ بہت جلد ختم ہوا چاہتی ہے۔ خود ہندوستان کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ یہ پیش کش قبول کر کے وہ جنگ کو فتح مندانہ طور پر ختم کرانے کی جدوجہد میں پورا پورا تعاون کرے۔

پھر انہوں نے مسلم لیگ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا بہت ضروری ہے کہ کانگرس اور مسلم لیگ میں مفاہمت ہو جائے۔ میں نے واضح الفاظ میں وائسرائے کو بتا دیا کہ

مسلم لیگ سے مفاہمت مشکوک ہے جن لوگوں کا لیگ پر تسلط ہے وہ خیال کرتے ہیں کہ حکومت کی پشت پناہی انہیں حاصل ہے لہٰذا وہ کوئی معقول بات تسلیم نہیں کریں گے وائسرائے نے واضح الفاظ میں اس بات کی تردید کی۔ انہوں نے کہا کہ حکومت ہرگز لیگ کی پشت پناہ نہیں ہے اگر مسلم لیگ کے لیڈر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں تو اس کا جلد از جلد رفع ہو جانا بہتر ہے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ حکومت پہلے بھی غیر جانبدار رہتی اور آئندہ بھی غیر جانبدار رہے گی۔ (۴)

ویول کو خراج تحسین

اس کے بعد وائسرائے نے برطانوی حکومت کے تجاویز کا تفصیل سے ذکر کیا۔ ان تجاویز پر میرا پہلا ردِ عمل یہ تھا کہ مغز کے اعتبار سے یہ کرپس پیش کش سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ لیکن ایک فرق بہرحال تھا۔ کرپس پیش کش کے وقت برطانوی حکومت ہندوستانی تعاون کی بُری طرح محتاج تھی۔ اب یورپ میں جنگ ختم ہو چکی تھی۔ ہٹلر پر اتحادیوں نے فتح حاصل کر لی تھی۔ بایں ہمہ برطانوی حکومت اپنی پیش کش پر قائم تھی تاکہ ہندوستان ایک صحت مند سیاسی فضا سے دوچار ہو۔ میں نے وائسرائے سے کہا کہ اگرچہ کانگرس نے مجھے با اختیار نمائندہ بنا کر بھیجا ہے لیکن اپنے رفقا سے مشورہ کیے بغیر میں کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتا چنانچہ میں ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ شملہ میں طلب کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ہی ان تجاویز کے بارے میں کچھ کہہ سکوں گا لیکن میں نے لارڈ ویول کو یقین دلایا کہ بہترین کوشش کسی حل کو پیدا کرنا ہو گا نہ کہ مشکلات کو بڑھانا۔ (۵) (ص ۱۰۷، ۱۰۶)

تاریخ ہند میں پہلی مرتبہ

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں شملہ کانفرنس ایک پشتہ ثابت ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مصالحت کی گفت و شنید برطانیہ اور ہندوستان کے اختلاف کی بنیاد پر منقطع نہیں ہوئی بلکہ اس کے انقطاع کا سبب فرقہ وارانہ اختلاف تھا۔ (۶)

(ص ۱۲۰)

سببِ اختلاف میں نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کو لارڈ ویول کی پیش کش منظور کرنے پر راضی کرلیا تھا کیونکہ برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان اختلاف تھے وہ قریب قریب طے ہو چکے تھے۔ کانفرنس کی ناکامی ایگزیکٹو کونسل میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے تناسب پر اختلاف کے باعث ہوئی۔

(ص ۱۱۲)

فہرست مرتب ہوگئی سیاسی معاملات پر اتفاق کے بعد ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل پر اختلافات نمایاں ہوتے گئے۔ جب بنیادی اصول طے ہوگئے تو وقت آیا کہ کانگرس اور مسلم لیگ اپنے اپنے نمائندوں کے نام پیش کریں۔ قدرتی طور پر کانگرس کی فہرست میں پہلا نام صدر کانگرس کا تھا۔ ہم نے جواہر لال اور سردار پٹیل کو بھی شامل کرلیا۔ باقی دو ناموں کے لیے میرا اصرار تھا کہ ایک پارسی اور ایک عیسائی لیا جاتے۔

(ص، ۱۱۲)

یہ تھا ثبوت میری اس تجویز کا ماحصل یہ تھا کہ کانگرس کی طرف سے جو فہرست پیش کی گئی تھی اس میں صرف دو ہندو تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا ۔اگر ثبوت کی ضرورت ہو تو — کہ کانگرس صحیح معنی میں ایک قومی تنظیم تھی۔ (۷)

(ص: ۱۱۳)

شملہ کانفرنس کے بارے میں مولانا آزاد کے ارشادات "غلطیہائے مضامین" کا مجموعہ ہیں، ضروری ہے کہ اصل حقیقت پیش کردی جائے۔

(۱)

مولانا آزاد کا خیال یہ ہے کہ شملہ کانفرنس نتیجہ تھی امریکی اثر اور دباؤ کا، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، رہنمایان کانگرس جیل میں بند تھے۔ گاندھی جی بعض وجوہ سے رہا کردیے گئے "ہندوستان خالی کردو"، کی ناکام تحریک نے انہیں دل شکستہ کردیا تھا وہ چاہتے تھے، حالات پھر سنبھلیں۔ چنانچہ ان کی تحریری اجازت سے بھولا بھائی ڈیسائی نے "کانگرس لیگ مساوات" کی بنیاد پر لیاقت علی خاں سے ایک سمجھوتہ کرلیا۔

اس کے بعد یہ سمجھوتہ لے کر ڈیسائی

وائسرائے سے ملے، وائسرائے اس تحریک سے متاثر ہو کر لندن گئے اور انہوں نے شملہ کانفرنس کا اعلان کیا، لیکن ڈیسائی لیاقت فارمولے میں اور ویول فارمولے میں فرق تھا۔ اوّل الذکر کی بنیاد لیگ کانگرس مساوات پر تھی، ثانی الذکر مسلمانوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی مساوات پر مبنی تھا۔ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد برطانیہ نے اعلان کر دیا تھا کہ اب پہل دوسری طرف سے ہونی چاہیے۔ دوسری طرف سے جب پہل ہوئی تو ویول پلان تیار ہو گیا۔

میرے اس دعوے کی تائید خود گاندھی جی کے بیان سے ہوتی ہے۔ انہوں نے وائسرائے کے اعلان کے بعد پنچ گنی سے ۱۵ رجون ۱۹۴۵ء کو ایک طویل بیان شائع کر کے وائسرائے کو خوب سراہا، پھر فرمایا:

"ڈیسائی لیاقت سمجھوتہ ہی وائسرائے کے موجودہ اعلان کی بنیاد ہے بھولا بھائی ڈیسائی تجویز (لیگ کانگرس مساوات) میں وہ رنگ نہیں ہے جو وائسرائے کے نشریہ (مسلمانوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی مساوات) میں ہے "اونچی ذات کے ہندو" کی اصطلاح میرے کانوں کو سخت ناگوار گزر رہی ہے۔ کانگرس کو تو جانے دیجئے جو تمام ہندوستان کی نمائندگی کی مدعی ہے کیا ویر ساورکر، ڈاکٹر مکرجی اور ڈاکٹر مونجے اچھوتوں کو اپنا ایک جزو نہیں سمجھتے تھے؟

مجھے امید ہے کہ وائسرائے نے یہ اصطلاح ناواقفیت کی وجہ سے استعمال کی ہے۔ میں انہیں ہندوؤں کے جذبات مجروح کرنے اور ان میں تفرقہ انگیزی کی غلطی سے ہوشیار کر دینا چاہتا ہوں۔"

۱۸ رجون ۱۹۴۵ء کو گاندھی جی نے پھر وائسرائے کو تار دیا۔

"مسلمانوں اور اونچی ذات والے ہندوؤں میں مساوات قائم کرنے سے ناقابل تسلیم مذہبی تقسیم آزادی کے وقت سرکاری طور پر تسلیم شدہ ہو جائے گی۔ ذاتی طور پر میں، اور اگر میں کانگرس کے دماغ کو سمجھتا ہوں تو وہ بھی کبھی اسے قبول نہ کرے گی۔"

پھر اس بیان میں آگے چل کر گاندھی جی نے فرمایا:

"کانگرس اور مسلم لیگ کی مساوات تو سمجھ میں بھی آسکتی ہے

لیکن اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مساوات قائم کر کے غیر ارادی طور پر آپ اپنی کانفرنس کو ناکام بنا دیں گے۔"

گاندھی جی وقتی اور سیاسی طور پر لیگ کانگرس مساوات تسلیم کر سکتے تھے لیکن دائمی اور قومی بنیاد پر ہندو مسلم مساوات قبول نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اچھوتوں کا کسی قیمت پر ہندو قوم سے جداگانہ تشخص قبول کرنے پر تیار نہیں تھے کیونکہ ہندو اکثریت ختم ہو جاتی، ہندو امپیریلزم کا خواب تشنۂ تعبیر رہ جاتا۔

(۲)

مولانا آزاد نے وزیر ہند کے جس بیان کا ذرا سا ٹکڑا دیا ہے وہ پورا بیان میرے سامنے ہے۔ مسٹر ایمرے نے تجاویز ویول کا اعلان کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں ایک طویل تقریر کی، جس میں انہوں نے مسئلہ کے مالہ اور ماعلیہ پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ:

"ہم اپنے اختیارات اس حکومت یا حکومتوں کو دے سکتے ہیں جو لینے کو تیار ہوں، ہم ہندوستان کو خانہ جنگی کے حوالہ نہیں کر سکتے۔ ہم نے اپنے سامنے ہمیشہ جو مطمع نظر رکھا ہے وہ یہی ہے کہ ہندوستان ایک متحدہ یونین ہے لیکن چونکہ متحدہ ہندوستان کی بنیاد ہندو مسلم مفاہمت پر ناممکن ہے لہٰذا موجودہ تجاویز (تجاویز ویول) کا اثر متحدہ یا منقسم ہندوستان پر نہیں پڑ سکتا۔"

کانگرس کا ایک اور مطالبہ جو بظاہر خالص جمہوری لیکن درحقیقت خالص استبدادی تھا، یہ تھا کہ ایگزیکٹو کونسل کے "کثرت آراء" پر مبنی ہوا کریں۔ اس کے جواب میں مسٹر ایمرے نے کہا کہ:

"اگر ہم حکومت کو اسمبلی کے سامنے جواب دہ بنا دیں تو مسلمانوں کو اعتراض ہوگا کہ مسلم ہندوستان کو ہندو اکثریت کے سپرد کر دیا گیا ہے۔"

ان حقائق کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے اسباب میں سب سے اہم سبب کانگرس کی ناروا داری اور کج فہمی تھی۔ اگر وہ اپنے حقوق لینے کے ساتھ دوسروں کے حقوق بھی تسلیم کر لیتی تو یہ کشمکش کیوں ہوتی؟

(۳)

مولانا کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وائسرائے نے انہیں صدر کانگرس کی حیثیت سے شملہ کانفرنس میں مدعو کیا اور انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی۔

حالانکہ امرِ واقعہ یہ تھا کہ گاندھی جی کے ایما اور ڈیسائی کی تحریک پر یہ کانفرنس وائسرائے نے طلب کی تھی جس کی بنیاد مسلمانوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی مساوات تھی۔ اس لیے انہوں نے کانگرس کے آمر کی حیثیت سے گاندھی کو اور مسلم لیگ کے قائداعظم کی حیثیت سے مسٹر جناح کو مدعو کیا تھا، نیز تمام صوبوں کے سابقہ اور حال وزرائے اعظم کو دعوت بھی دی تھی لیکن مولانا کو بنکورہ جیل سے رہا کر دینے کے باوجود مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ گاندھی جی کے اصرار پر وہ مدعو کیے گئے۔ اس طرح وائسرائے نے آغازِ کار سے پہلے گاندھی جی اور قائداعظم کو ابتدائی بات چیت کے لیے ملاقات کی دعوت دی، لیکن صدر کانگرس مولانا آزاد کو نہیں دی۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندہ متعینہ شملہ کا بیان ہے:۔

"مولانا نے شملہ کانفرنس سے پورا فائدہ اُٹھانے کے لیے کانفرنس سے پیشتر خود ہی وائسرائے سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔"

(۴)

مسلم لیگ کے بارے میں صدر کانگرس کی حیثیت سے مولانا نے وائسرائے سے جو کچھ فرمایا اور وائسرائے نے جو جواب دیا اور بعد میں کانگرس نے جس طرح لارڈ ویول کے سامنے سرِ نیاز خم کیا اور مسلم لیگ نے اور قائداعظم نے جس طرح لارڈ ویول کی ہندو دوستی کا پردہ چاک کیا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اگر حکومت برطانیہ کی "پشت پناہی" کسی کو حاصل تھی تو وہ کانگرس تھی۔ یہی لارڈ ویول تھے جنہوں نے کچھ دن پہلے کلکتہ میں کرسمس کے موقع پر یہ کہہ کر کانگرس کی پیٹھ ٹھونکی اور مسلم لیگ کو دھمکی دی تھی کہ:

"ہندوستان کا جغرافیہ نہیں بدلا جا سکتا۔"

جس وائسرائے نے کانگرس کے عقیدہ وحدتِ ہند کا سرِ بازار اس طرح پروپیگنڈہ کیا تھا اور جس نے یوں مسلم لیگ کو چیلنج دیا تھا، خود اس سے مولانا کا یہ کہنا حکومت مسلم لیگ کی پشت پناہی کرتی ہے ستم ظریفی کی انتہا ہے۔

(۵)

مولانا آزاد، لارڈ ویول اور ان کے پیش کردہ تجاویز سے بہت متاثر تھے زندگی

کی آخری سانس تک ، وہ اپنے اس تاثر کا اعلان کرتے رہے لیکن اس موقع پر پھر یہ بات تازہ کر لینی چاہیے کہ شملہ کانفرنس دراصل لیاقت ڈیسائی سمجھوتہ کا تکملہ تھی۔ حیرت ہے اس موقع پر مولانا نے اس کا ذرا بھی ذکر نہیں کیا۔

۲۶ جون کو جب شملہ میں کانگرس کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہو رہا تھا ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے مسٹر مجارتن نے تمام اخبارات کو یہ اطلاع بھیجی۔

"مسٹر ڈیسائی نے مجلس عاملہ کے سامنے وہ تمام خط و کتابت رکھی جو ان کے اور گاندھی جی کے درمیان ، نیز ان کے اور لیاقت علی خاں کے درمیان اس سلسلہ میں ہوئی تھی۔ لارڈ ویول کے انگلستان روانہ ہونے سے پہلے بھولا بھائی ڈیسائی نے ان سے جو گفتگو کی تھی اسے بھی مجلس عاملہ کے سامنے دہرایا۔ مسٹر ڈیسائی نے مجلس عاملہ کو واضح مشورہ دیا کہ ویول اسکیم خود ان کے فارمولا میں مزید اضافہ ہے اور اسے بے جھجک قبول کر لینا چاہیے۔ مسٹر ڈیسائی نے یہ بھی کہا کہ ڈیسائی لیاقت فارمولا میں مساوات کی جو شرط تھی ویول اسکیم میں اسے زیادہ بہتر شکل میں پیش کیا گیا ہے۔"

یہ دوسری بات ہے کہ پٹیل کی ذاتی پرخاش کی بنا پر ڈیسائی راندۂ درگاہ قرار دیے گئے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شملہ کانفرنس صرف مسٹر ڈیسائی کے "مساعی جمیلہ" کا نتیجہ تھی۔

(۶)

مولانا نے اپنی خود نوشت میں اس خیال کا کئی بار اظہار کیا ہے لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اگر بات واقعی یہی تھی شملہ کانفرنس کی ناکامی برطانیہ اور کانگرس کے اختلاف کا نتیجہ نہیں بلکہ فرقہ وارانہ اختلافات کا نتیجہ تھی تو ان اختلافات کے حل کرنے میں کون سی دشواری حائل تھی؟ وہی تو نہیں جس کی طرف مومن نے اشارہ کیا ہے :

> کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا
> تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

(۷)

"اگر کانگرس صحیح معنی میں قومی تنظیم تھی" تو مولانا نے بتایا ہوتا کہ جس عالی ظرفی کا مظاہرہ

تم ہی کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو کیونکر ہو

(۲)

کانگرس کو تجاویز کرپس سے کوئی اختلاف نہ تھا، اختلاف صرف اس بات پر تھا کہ فوری طور پر نہیں دس سال کے بعد بھی صوبوں کو حق خود اختیاری کیوں دیا گیا تھا؟ جو جماعت عدم تشدد کی پرستار تھی وہ جبراً دوسروں کو اپنے ساتھ رکھنے پر بضد تھی، صوبوں سے حق خود ارادیت چھین لیا جاتا، یعنی ہندوستان کی اقلیتوں پر ہندو اکثریت کو حق خود ارادیت دے دیا جاتا تو پھر،

ہم تمہارے، تم ہمارے ہو گئے

(۳)

سر کرپس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر ہندو مسلم مفاہمت ہو جاتے، اگر کانگرس لیگ کے جائز مطالبات مان لے تو ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ چٹکی بجاتے میں حل ہو سکتا ہے، جنگ کے اس ہولناک دور میں برطانوی حکومت یہ حماقت نہیں کر سکتی کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے بعد مسلمانوں کی دشمنی مول لے لے، لیکن کانگرس کا اصرار یہ تھا کہ اقلیتوں کو ہماری تحویل میں دے دو، اس اصرار کی بنیاد حق و صداقت پر نہیں تھی، اگر حق و صداقت پر ہوتی تو تقسیم ہند وہ کبھی قبول نہ کرتی" (لیکن بعد میں اس نے کی) اس اصرار کی اصل لِم صرف یہ تھی کہ ہندوستان سے سبھاش بابو فرار ہو کر محوریوں سے ساز باز کر کے گرفتار شدہ ہندوستانی سپاہیوں کو لے کر ہندوستان پر حملہ کی تیاریاں کر رہے تھے اور پھر مسٹر منشی (آزاد ہندوستان کے ایجنٹ جنرل حیدرآباد، گورنر صوبہ یوپی، کانگرس سے مستعفی ہو کر مسٹر پٹیل کی پشت پناہی کے بل پر "اکھنڈ ہندوستان" کے لیے برسرپیکار تھے، کانگرس کو یقین تھا کہ اگر ہندوستان سے باہر بوس کی تحریک کامیاب ہو گئی تو انگریز ختم ہو جائیں گے لہٰذا اس فیصلہ کن وقت پر اس نے ہر اصول کو بالائے طاق رکھ کر ہندو امپریلزم کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔

سر کرپس کانگرس کے وفادار تھے وہ واردھا میں گاندھی جی کے مہمان بھی رہ چکے تھے وہ جب تجاویز کا تحفہ لے کر آتے تو کانگرس کے تمام لیڈروں نے گاندھی جی سمیت

دیدہ و دل فرش کر دیے لیکن جب کانگرس کی ضد اور خود غرضی کے باعث کرپس مشن ناکام ہوا تو لندن جاکر کانگرس کے اس دوست اور یارِ غار نے جو بیان دیا اس کا پہلا جملہ یہ تھا:

"کانگرس سب کچھ لے لینا چاہتی تھی اس لیے اس سے سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔"

وہ کھوتے گئے کرتہِ دشمن سے نکل کر

---

(٨)

کابینہ وفد کے سفارشات

نئی کوشش

۱۷ر فروری ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے، ساڑھے نو بجے رات کو ریڈیو میں حکومت برطانیہ کے فیصلے کی رپورٹ سُنی، وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا تھا کہ برطانوی حکومت ایک کابینہ وفد ہندوستان بھیج رہی ہے تاکہ ہندوستان کی آزادی کے مسئلے پر نمائندگان ہند سے گفتگو کی جائے۔ اسی تاریخ کو وائسرائے کی طرف سے بھی یہی اعلان ہوا، وفد لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند، سر اسٹیفرڈ کرپس بورڈ آف ٹریڈ کے صدر، مسٹر اے وی الگزنڈر ایڈمرلٹی کے فرسٹ لارڈ پر مشتمل تھا۔

(ص: ۱۳۸)

وفاقی اسکیم

۶ر اپریل ۱۹۴۶ء کو پہلی دفعہ کابینہ وفد کے ارکان سے میری ملاقات ہوئی۔ بحث و گفتگو کے لیے وفد نے چند سوالات تیار کر لیے جس میں سب سے پہلا نمبر ہندوستان کے فرقہ وارانہ اختلافات کا تھا۔ وفد نے مجھ سے سوال کیا کہ میں فرقہ وارانہ صورتِ حالات سے کس طرح عہدہ برآ ہوں گا۔ جیسے ہی میں نے وفاق سے متعلق اپنی اسکیم پیش کرتے ہوئے کہا مرکز کو کم سے کم اختیارات دینے کی ایک فہرست مرتب ہونی چاہیے۔ نیز ایک مزید فہرست اختیاری ہونی چاہیے، فوراً لارڈ پیتھک لارنس گویا ہوتے۔

"بلاشبہ آپ نے فرقہ وارانہ حل کے سلسلے میں ایک بالکل نئی تجویز پیش کی ہے۔"
سر اسٹیفرڈ کرپس نے خاص طور پر میری تجویز سے دلچسپی لی اور مسئلے کی مزید وضاحت کے لیے بڑی دیر تک جرح کرتے رہے۔ آخر کار وہ بھی میری تجویز سے مطمئن ہو گئے۔

۱۲، اپریل کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا جہاں میں نے کابینہ وفد سے ملاقات کی تفصیل نسبتاً وضاحت کے ساتھ بیان کی، ورکنگ کمیٹی شروع میں تو اس حل کے خلاف معلوم نظر آتی اور ممبروں نے مختلف قسم کے مشکلات و شبہات کا اظہار کیا لیکن میں نے ان کے اعتراضات رفع کر دیے اور ان کے شبہات صاف کر دیے آخر ورکنگ کمیٹی نے میری اس تجویز کی اہمیت کو تسلیم کر لیا اور گاندھی جی نے مکمل طور پر میری تائید کی۔

(ص: ۱۴۱)

پاکستان کے خلاف

کابینہ وفد مطالبۂ پاکستان تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا، وہ کسی حد تک کمی بیشی کے ساتھ میرے مجوزہ (وفاقی) حل کو پسند کرتا تھا۔

(ص: ۱۴۵، ۱۴۶)

سفارشات

۲۷، اپریل کو کابینہ وفد نے بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے اختلافات طے کرنے کے لیے بحث و گفتگو کی خاطر کانگریس اور مسلم لیگ کے صدر سے درخواست کی کہ وہ اپنی ورکنگ کمیٹی کے نمائندے نامزد کر لیں تاکہ شملہ میں گفت و شنید مصالحت جاری رکھی جاتے۔ ورکنگ کمیٹی نے مجھے نمائندے نامزد کرنے کا حق دے دیا، میں نے جواہر لال اور سردار پٹیل کو نامزد کیا۔ وفد نے گاندھی جی کو بھی شملہ آنے کی دعوت دی تھی وہ بھی آ گئے اور مینور ولا میں قیام پذیر ہوتے۔

۲، مئی سے ۱۲، مئی تک شملہ میں رسمی اور غیر رسمی بحث و گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ دو ہفتے کے بعد ہم دہلی واپس آئے، یہاں کابینہ وفد کے ممبروں نے اپنے تجاویز مرتب کر لیے۔ ۱۶، مئی کو دارالعلوم میں مسٹر اٹیلی نے ان کا اعلان کر دیا۔ حکومت نے ایک قرطاس ابیض بھی شائع کیا جس میں کابینہ وفد کے سفارشات درج تھے۔ قرطاس ابیض میں یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ کابینہ وفد اپنے تجاویز کی روشنی میں ہندوستان کے نئے دستور کو جلد از جلد تشکیل پذیر دیکھنا چاہتا ہے۔

(ص: ۱۴۷)

صوبوں کی گروپ بندی کابینہ وفد کی جو اسکیم ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو شائع ہوئی وہ بنیادی طور پر وہی تھی جس کا خاکہ میں نے اپنے ۱۵ اپریل کے بیان میں شائع کیا تھا۔ کابینہ وفد نے اپنی اسکیم میں مرکزی حکومت کے لیے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے محکمے رکھے تھے یہی چیزیں میں نے بھی اپنی سکیم میں رکھیں اور ایک نئی چیز کا اضافہ بھی کیا تھا۔ اس نے ہندوستان کو تین رقبوں میں منقسم کیا تھا۔ اے، بی اور سی۔ کیونکہ ممبران وفد کا یہ خیال تھا کہ اقلیتوں میں زیادہ احساس تحفظ پیدا ہو سکے گا۔

سیکشنوں کی تفصیل سیکشن 'بی' میں یہ صوبے شامل تھے پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان، یہاں مسلمانوں کی خالص اکثریت تھی، سیکشن 'سی' میں بنگال اور آسام شامل تھے۔ اس سیکشن میں مسلمانوں کو خفیف اکثریت حاصل تھی۔ (سیکشن اے ہندو دل پر مشتمل تھا) کابینہ وفد کا خیال تھا کہ یہ انتظام مسلم اقلیت کو پورے طور پر مطمئن کر دے گا اور لیگ کے تمام حقیقی اور واقعی خدشات و خطرات کا ازالہ کر دے گا۔

چونکہ کابینہ وفد نے جو اسکیم ترتیب کی تھی وہ تقریباً وہی تھی، اضافہ صرف اتنا تھا کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں الگ الگ سیکشن قائم کر دیے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ اسکیم ہمیں منظور کر لینی چاہیے۔

(ص: ۱۴۹)

کانگرس کے لیے قابل قبول کانگرس ورکنگ کمیٹی کے سامنے میں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کابینہ وفد کی اسکیم وہی ہے جسے کانگرس منظور کر چکی ہے۔ گرماگرم مباحثے کے بعد ۲۶ جون کو ورکنگ کمیٹی نے کابینہ وفد کی اسکیم منظور کر لی اگرچہ عارضی حکومت کے سلسلے میں وفد کی تجویز سے وہ ہم آہنگ نہ ہو سکی۔

لیگ کانگرس اتفاق کابینہ وفد کی اسکیم کانگرس اور مسلم لیگ، دونوں نے منظور کر لی۔ تاریخ آزادی ہند کا یہ سب سے شاندار واقعہ ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ آزادی ہند کا دشوار ترین مسئلہ گفت و شنید اور مفاہمت سے نہ کہ تشدد اور جنگ سے طے پا گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ فرقہ وارانہ مشکلات کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ (ا)

قبل از وقت خوشی ہم نے خوشی منائی لیکن ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے [illegible]

قبل از وقت ہے اور تلخ ترین مایوسی ہماری راہ دیکھ رہی ہے

(ص: ۱۵۰، ۱۵۱)

پہلے منظور پھر نامنظور (آسام کے وزیر اعلیٰ کابینہ وفد کی تجویز گروپ بندی سے اختلاف کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس طرح بنگال کی مسلم اکثریت آسام پر چھا جائے گی۔ گاندھی جی اس دلیل سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ کابینہ وفد کا پلان منظور کر چکنے کے باوجود اس کی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ باردولی [illegible] مل جاتی ہے وہ کسی کی نہیں سنتے۔)

نیا سوال ہم نے محسوس کیا کہ اب گروپ بندی کا سوال از سر نو زیر بحث نہیں [illegible] کسی حد تک اپنے آسامی رفقا کا اعتراض دور کرنے کے لیے اور زیادہ [illegible] طور پر ہم نے دستور ساز اسمبلی کے الیکشن میں آسام اور بنگال کے یورپین ممبروں کی شرکت کا سوال اٹھایا۔ میں نے وائسرائے کو لکھا کہ کانگرس کابینہ وفد کا سارا پلان مسترد کر دے گی۔ اگر بنگال اور آسام اسمبلی کے سلسلہ میں ووٹ دیا یا امیدوار بننے کی کوشش کی۔ یورپین ممبروں نے اعلان کر دیا کہ وہ دستور ساز اسمبلی میں نمائندگی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ جواہر لال کی بھی یہی رائے تھی کہ آسامی لیڈروں کا خوف بے بنیاد ہے۔ انہوں نے بڑی کوشش کی کہ آسامی لیڈر ضد نہ کریں لیکن انہوں نے نہ جواہر لال کی بات سنی نہ میری۔ (۲) (ص: ۱۴۲)

کابینہ وفد کے سلسلے میں مولانا نے جو باتیں کی ہیں وہ بڑی حد تک درست ہیں، تشریح مزید کے طور پر کچھ عرض کروں گا۔

(۱)

کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے کابینہ وفد کی اسکیم منظور کر لی، لیکن کانگرس نے ذہنی تحفظات کے ساتھ اور مسلم لیگ نے کسی ذہنی تحفظ کے بغیر، کانگرس نے یہ سوچا کہ یہ ہندو امپیریلزم کی فتح ہے کہ پاکستان کا مطالبہ مسترد کر دیا گیا۔ مسلم لیگ نے یہ سوچا کہ پاکستان بے شک نہیں ملا لیکن اس کا مغز مل گیا۔ کچھ عرصہ بعد حق علیحدگی لے لیا، اگر آزاد ہندوستان میں کانگرس نے رواداری کا ثبوت دیا، تو ہندوستان متحد

بیٹھ گا نہ دیا تو مسلم صوبے آزاد ہو جائیں گے۔ مسلم لیگ نے صبر و تحمل کا ثبوت دیا، کانگرس نے کم ظرفی کی، کانگرس نے مسلم لیگ کو بدنام کرنا شروع کر دیا اور یہ بات کانگرس سے پہلے سے وزیر اعظم اور کانگرس کے پرانے یار غار مسٹر اٹیلی شروع کر چکے تھے۔ انہوں نے وفد کی روانگی سے پیشتر بیان دیتے ہوئے فرمایا:

"اس مرتبہ اقلیت کو اکثریت کے سیاسی ارتقا کے راستے میں روڑا نہیں بننے دیا جائے گا۔"

مسٹر پٹیل نے اس بیان کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

"وزیر اعظم برطانیہ کے بیان میں اقلیت سے مراد مسلم لیگ اور اکثریت سے مراد کانگرس ہے۔"

یہی نہیں بلکہ کانگرسی حلقوں میں کابینہ وفد کے اعلان کے بعد جشن نشاط و طرب برپا ہونے لگا۔ جس روز یہ اعلان شائع ہوا، بمبئی میں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا بعض اخبارات کے پاکٹ سائز کے ضمیمے رات کو نو بجے شائع ہوئے۔ قیمت پوسٹ کارڈ سائز کے ضمیمے کی دو روپے، اور ہزارہا کی تعداد میں یہ ضمیمے آناً فاناً فروخت ہو گئے۔

"بادشاہ خان عبد الغفار خاں کے کابینہ وفد کے سفارشات بھی یہی ہوتے۔"

گاندھی جی کے بیٹے اور "ہندوستان ٹائمز" دہلی کے مینجنگ ایڈیٹر دیوداس گاندھی لندن میں تھے۔ انہوں نے رائٹر کے نمائندہ سے کہا:

"۱۶ مئی کا دن ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم اور یادگار دن ہے۔"

۱۷ مئی کو اپنی پرارتھنا کے موقع پر گاندھی جی نے فرمایا:

"کابینہ وفد کے سفارشات اس الم کدۂ ہند کو سرزمین نشاط و طرب میں تبدیل کر دیں گے۔"

(بمبئی کرانیکل ۱۸ مئی ۱۹۴۶ء)

کابینہ وفد کے ایک رکن کانگرس کے بڑے پرانے دوست اور گاندھی جی کے نیاز مند سر کرپس ۱۲ مئی کو ایک معمولی سی علالت کے باعث ولنگڈن ہسپتال میں داخل ہوئے تو گاندھی جی نے اپنے معالج خاص ڈاکٹر ڈنشا مہتہ کو اُن کی مزاج پرسی کے لیے بھیجا، اور بہت سے فروٹ بھی جب تک وہ ہسپتال میں رہے روزانہ بھیجتے رہے۔

یہ سب کیوں تھا؟ ــــــ اس لیے کہ کابینہ وفد نے اپنے سفارشات میں پاکستان کو مسترد کر دیا تھا، کیا عالی ظرف حریفوں کا برتاؤ یہی ہوتا ہے؟

(۲)

لیکن کانگرس کے اس معاندانہ طرزِ عمل کے باوجود قائدِ اعظم نے کابینہ وفد کے سفارشات قبول کر لیے، محض اس لیے کہ ہندوستان خانہ جنگی میں مبتلا نہ ہو جائے۔ امن و امان درہم برہم ہو جائے۔ بی اور سی سیکشن قائم کر کے بنگال کے ساتھ عارضی طور پر آسام کو شریک کر کے وفد نے مسلم لیگ کی اشک شوئی کی تھی مگر کانگرس یہ بھی گوارا نہ کر سکی۔

اس نے کابینہ وفد کے سفارشات کو قبول کر کے خود ہی مسترد کر دیا۔ اس نے صوبوں کی گروپ بندی قبول کرنے کے باوجود آسام کو اس حلقے سے نکال دیا۔ اس کا خیال تھا، مسلم لیگ نے کابینہ وفد کی اسکیم قبول کر کے کمزوری، بزدلی اور شکست کا اعتراف کیا ہے لیکن اس کا یہ خیال غلط تھا۔

کانگرس کی اس دھاندلی کے خلاف قائدِ اعظم میدان میں اُترے۔ انہوں نے سفارشات مسترد کر کے آخری، قطعی اور ناقابلِ مفاہمت طور پر پاکستان کا مطالبہ پیش کیا، اور بہت مختصر مدت کے اندر اسے حاصل بھی کر لیا۔

مسلم لیگ کی اور اپنی قوت کا اندازہ ہمیشہ کانگرس نے غلط کیا، اسی کا نتیجہ پاکستان ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک!

---

(۹)

مرکز میں عارضی حکومت کا قیام

وائسرائے کی پیمان شکنی (پیمان شکن وائسرائے ویول نے مسلم لیگ کو نظر انداز کرکے جواہر لال کو مرکز میں عارضی حکومت قائم کرنے کی دعوت دی اور جواہر لال نے وزارت بنالی)

مسلم لیگ کی مایوسی اس واقعہ نے مسلم لیگ کو نہ صرف مایوس بلکہ برہم کردیا۔ اس نے کوشش کی کہ دہلی میں اور دوسرے مقامات پر زبردست مظاہرہ کیا جائے لیکن اس کے مساعی ناکام ہوئے۔ بہرحال سارے ملک میں تلخی اور شورش کے آثار نمایاں تھے۔ لارڈ ویول نے محسوس کیا کہ انہیں مسلم لیگ کو وزارت میں شریک ہونے پر راغب کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ انہوں نے مسٹر جناح کو بلایا وہ دہلی آئے اور کئی بار وائسرائے سے ملے۔ آخرکار ۱۵ اگست ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ نے عارضی حکومت میں شرکت کا فیصلہ کرلیا۔ (۱)

لیگ کی شرکت اس عرصہ میں مجھے کئی بار لارڈ ویول سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے کہا کہ جب تک لیگ حکومت میں شریک نہیں ہوتی کابینہ وفد کا پلان درہم برہم رہے گا۔ انہوں نے فرمایا کہ فرقہ وارانہ جھگڑے جاری ہیں اور غالباً اس وقت تک جاری رہیں گے جب تک لیگ کیبنٹ میں شریک

نہیں ہو جاتی، میں نے ان سے کہا لیگ کی شرکت پر کانگرس کو کوئی اعتراض نہیں۔ (۲)

(ص: ۱۶۴)

لیگ کی شرکت سے مشکلات میں اضافہ

جب مسلم لیگ عارضی حکومت میں شریک ہو گئی تو ایگزیکٹو کونسل میں نئے مشکلات اُبھرے لہٰذا ایک مرتبہ پھر سوال پیدا ہوا کہ مجھے وزارت قبول کر لینی چاہیے۔ گاندھی جی نے پہلے سے زیادہ اصرار کے ساتھ مجھے وزارت قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ انہوں نے کھلے طور پر کہا کہ خواہ میری رائے کچھ ہو اور میرے ذاتی تاثرات کچھ بھی ہوں ملکی مفاد کے پیش نظر میرا فرض ہے کہ میں وزارت قبول کر لوں۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں وزارت سے باہر رہا تو یہ ایک مضرت رساں چیز ہو گی۔ جواہر لال کی رائے بھی یہی تھی۔

وزارت میں شرکت

گاندھی جی کی تجویز تھی کہ تعلیمات کا محکمہ میرے لیے موزوں ترین ہے گا۔ خود قومی مفاد کا تقاضا بھی یہی ہے۔ انہوں نے کہا مستقبل کا تعلیمی انداز طے کرنا آزاد ہندوستان کا بنیادی سوال ہے۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۴۷ء کو شری راج گوپال اچاری سے میں نے چارج لے لیا جو اب تک وزیرِ تعلیمات چلے آ رہے تھے۔ (۳)

(ص ۱۷۴، ۱۷۵)

مرکز میں عارضی حکومت کے سلسلہ میں مولانا آزاد نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ متعدد اعتبارات سے تشنہ اور نامکمل ہیں ضروری ہے کہ ان کی وضاحت کی جائے

(۱)

مسلم لیگ کی برہمی کا مولانا نے اس طرح ذکر کیا ہے گویا ہندوستان کی حکومت کی وہ دعویدار تھی۔ یہ مطالبہ پورا نہ ہوا کانگرس بازی لے گئی۔ مسلم لیگ مایوس ہو گئی۔ اصل واقعہ یہ نہیں ہے۔

کابینہ وفد نے جو سفارشات پیش کیے تھے ان کے دو حصے تھے۔

(۱)

ا۔ قلیل المیعاد منصوبہ   یعنی عارضی حکومت

(۳)

عارضی حکومت کا قیام، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے باعث عمل میں آیا تھا۔ وائسرائے کو استردادی (VETO) کا حق حاصل تھا۔ ایگزیکٹو کونسل کے ممبران یعنی وزراء مرکزی اسمبلی کے سامنے جواب دہ نہ تھے بلکہ انفرادی طور پر وائسرائے کے سامنے جواب دہ تھے، کوئی وزیر اعظم نہیں تھا اگرچہ ہندو اخبارات اپر ملیسیٹ نہرو، کا لقب وضع کر چکے تھے۔ ہر وزیر خود ہی اپنے محکمہ کا ذمہ دار اور جوابدہ تھا۔ اسمبلی یا ایگزیکٹو کونسل اگر کسی وزیر پر عدم اعتماد کی تحریک منظور کرا دیتی تو بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ مسلم لیگ نے شرکت سے پہلے ہی ان امور کی وائسرائے سے وضاحت کرائی تھی اور اب مسلم لیگی وزراء نہایت اطمینان سے کانگرس کو مات دے رہے تھے جس کے لیے مولانا نے ”مشکلات“ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

یہ سب کچھ نہ ہوتا اگر کانگرس نے مسلم لیگ سے مفاہمت کر لی ہوتی۔ اسے اپنی اکثریت اور قوت پر ناز تھا، مسلم لیگ کو اپنی صداقت اور اصول پروری پر، اس کشمکش میں کانگرس ہر قسم کے ساز و سامان کے باوجود ہار گئی اور مسلم لیگ ہر طرح کی بے سر و سامانی کے باوجود جیت میں رہی۔

(۴)

مرکزی حکومت میں ایک وزیر بھی ایسا نہ تھا جو ایک دن کے لیے بھی کبھی صحافی رہا ہو۔ صرف مولانا آزاد ایسے تھے جو سالہا سال تک صحافی رہے تھے اور جن کی صحافت نے اردو زبان کی صحافت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ ان سے بڑھ کر محکمہ اطلاعات کی وزارت کسے سجتی تھی؟

ساری کابینہ میں صرف مولانا آزاد ایک ایسے شخص تھے جو الفاظ، اصطلاحات اور متبادل مترادفات کے خالق تھے انہوں نے ”البلاغ“ اور ”الہلال“ میں بہت سے نئے الفاظ وضع کیے جو اب تک سکۂ رائج الوقت بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے صحافت اور متعدد علوم و فنون کے انگریزی مصطلحات کا نہایت سبک اور دلکش اردو ترجمہ کیا۔

مولانا ایک اور خصوصیت میں بھی منفرد تھے۔ الہلال اور البلاغ کا مدیر شہیر جس طرح بڑے بڑے عربی الفاظ ”رئیس التحریر“، ”الملتقیٰ“، ”بریدِ فرنگ“، ”مقالہ افتتاحیہ“، ”شذرات“، ”الدواء والدوام“، ”حدیث الغاشیہ“ جیسے الفاظ کو بے تکلف اردو میں

(۲) طویل المیعاد منصوبہ — یعنی صوبوں کی گروپ بندی، پھر آزاد اور خود مختار دستور ساز اسمبلی کا قیام —

کانگرس اور مسلم لیگ کی قبولیت دیانت فکر پر مبنی تھی۔ کانگرس کی فریب کاری پر کانگرس نے یہ سوچ کر حامی بھری کہ اس طرح پاکستان کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب اس نے اپنے پالیسی میں پاکستان کا تصور ختم کر دینے اور مسلم لیگ کو کابینہ وفد کے سفارشات کی منظوری کا پابند بنا لیا تو آسام کے وزیراعظم گوپی ناتھ باردولائی کو اکسا کر گروپ بندی کے خلاف کھڑا کر دیا اور پھر گاندھی جی اور ساری کانگرس نے گروپ بندی کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اس نے سفارشات پہلے قبول کیے پھر مسترد کر دیے۔ مسلم لیگ نے بھی یہی کیا اور برطانیہ سے تعاون سے انکار کر دیا۔ کانگرس نے جب دیکھا کہ مسلم لیگ تعاون سے انکار کر رہی ہے تو فوراً لارڈ ویول سے ساز باز شروع کر کے عارضی حکومت قائم کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ حالانکہ عارضی حکومت کابینہ وفد کے سفارشات کے ماتحت قائم ہو رہی تھی اور یہ سفارشات گروپ بندی سے اختلاف کر کے کانگرس مسترد کر چکی تھی۔ ان حالات میں مسلم لیگ کی برہمی اور ناراضی کا اعتراف کرنے کے بجائے مولانا اور ان کے رفقا کو اس کے اسباب پر غور کرنا چاہیے تھا۔

(۴)

وائسرائے لارڈ ویول نے کانگرس کی قوت اور ہندو اکثریت سے متاثر اور مرعوب ہو کر کانگرس کے ہاتھوں عارضی حکومت یہ سمجھ کر قائم کرائی تھی اور خود کانگرس کو بھی یہ یقین تھا کہ مسلم لیگ جاہ و منصب کی بھوکی ہے۔ عارضی حکومت میں شرکت سے توجہ پر اس کے بن جانے کے بعد قائم نہیں رہ سکے گی۔ لیکن دونوں کا اندازہ غلط نکلا۔ مسلم لیگ کے بائیکاٹ نے ایوان فرنگ میں بھی تہلکہ مچا دیا اور کانگرس کے راج بھون میں بھی زلزلہ پیدا کر دیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ملک کے طول و عرض میں ایسے زبردست اور لرزہ آفریں مظاہرے کیے کہ کانگرس بھی کانپ گئی اور انگریز بھی دہل اٹھے۔ یہی وجہ تھی کہ لارڈ ویول قائداعظم کو منانے پر بے قرار تھے۔ یہ سبب تھا کہ مولانا کو مسلم لیگ کی شرکت پر کوئی "اعتراض" نہیں تھا۔

استعمال کرتا تھا۔ اس طرح اس نے جب زبان کی سادگی کو اپنا شعار بنایا تو رام گڑھ کا خطبۂ صدارت ایسے سادہ اور دلنشیں الفاظ میں لکھا کہ ایک عامی بھی اسے سمجھ لے اور لطف لے، مہر کے بجائے چھاپ، جذبہ کے بجائے لگن دُنیا ئے آب و گل کے بجائے سنسار کے الفاظ اس خوبی سے استعمال کیے ہیں جیسے انگشتری میں نگینہ۔ آل انڈیا ریڈیو کے لیے بڑا دردِ سر آزادی کے بعد یہ تھا کہ اُردو کے چلے ہوئے الفاظ کے بجائے ہندی کے کون سے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ مولانا اگر نشریات کے وزیر بنائے جاتے تو یہ مشکل بڑی خوبی سے آسان کر دیتے۔ پھر ہندوستان کے ہندی ناآشنا ہندوستانیوں کو ریڈیو پاکستان کا رہین منت نہ ہونا پڑتا لیکن پٹیل صاحب جس طرح اس پر بضد تھے کہ وزیر داخلہ رہیں گے اسی طرح اس پر بھی اصرار تھا کہ اطلاعات و نشریات جیسے کلیدی محکمے بھی انہی کے پاس رہیں گے جس طرح مالیات کا محکمہ انہوں نے لیاقت علی کو یہ سمجھ کر سونپا تھا کہ بھاری پتھر ہے وہ چوم کر چھوڑ دیں گے۔ اسی طرح تعلیمات کا محکمہ مولانا آزاد کو اس لیے دیا تھا کہ کوئی انقلابی قدم نہ اُٹھا سکیں گے۔ لیاقت علی خاں کے بارے میں ان کا خیال غلط اور مولانا آزاد کے بارے میں صحیح ثابت ہوا اور سچی بات یہ ہے کہ مولانا کوئی انقلابی قدم اُٹھا بھی نہیں سکتے تھے جب یہ محکمہ راج گوپال آچاری کے پاس تھا تو انہوں نے کہا تھا تعلیم صوبائی سبجکٹ ہے۔ صوبے جو چاہیں سو کریں مرکز کے پاس دلی یونیورسٹی کے کیا ہے۔ میں بیٹھا مکھیاں مارا کرتا ہوں۔ راجہ جی یہی کام مولانا کو سونپ گئے۔

تقسیمِ ہند کا پیش خیمہ

صدارت سے دستبرداری

بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سیاسی مسائل طے ہو چکے تھے۔ اب میں ایک نئے مرحلے کی طرف متوجہ ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں کانگریس کی صدارت مجھے سونپی گئی۔ دستور کی رُو سے میرا یہ عہدہ ایک سال کے لیے تھا۔ عام حالات میں نیا صدر ۱۹۴۰ء میں منتخب ہو جانا چاہیے تھا لیکن ۱۹۴۰ء اور پھر ۱۹۴۲ء میں ہماری گرفتاری عمل میں آئی، کانگریس ایک غیر قانونی جماعت قرار پائی، لہٰذا کسی نئے صدر کے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ اس ساری مدت میں صدارت کے فرائض میں ہی انجام دیتا رہا۔

اب کہ حالات معمول پر آ چکے تھے، قدرتی طور پر نئے صدر کے انتخاب کا سوال پھر اٹھا، عام مطالبہ یہ تھا کہ مجھی کو دوبارہ منتخب ہونا چاہیے کیونکہ کرپس، لارڈ ویول اور اب کابینہ وفد سے گفت و شنید کا مرحلہ میں نے ہی طے کیا تھا۔ کانگرسی اصحاب کا بھی عام رجحان یہی تھا، بنگال، بمبئی، مدراس، بہار اور یوپی کے کانگریسی حلقوں نے علانیہ اس بات کا اظہار کیا تھا کہ کابینہ وفد کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری مجھی کو سونپی جائے۔

لیکن میں نے محسوس کیا کہ کانگریسی ہائی کمان کے اندرونی حلقوں میں میرا انتخاب ایک اختلافی مسئلہ ہے کیونکہ سردار پٹیل اور ان کے رفقاء چاہتے تھے کہ سردار پٹیل

کو صدر منتخب ہونا چاہیے۔ میں نے اس مسئلہ پر احتیاط کے ساتھ غور کیا اور بالآخر میں نے طے کر لیا کہ صدارت کے لیے اپنا نام پیش کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔

جواہر لال اور پٹیل

دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ میرا جانشین کون ہو؟ میں چاہتا تھا ایسا آدمی منتخب ہو، جو میرے خیالات و جذبات کا حامل ہو، اور میری قائم کی ہوئی پالیسی پر عمل پیرا ہو سکے۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جواہر لال سے زیادہ موزوں آدمی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ۲۶، اپریل کو میں نے اس مفہوم کا ایک بیان شائع کیا، اور کانگرسی اصحاب سے اپیل کی کہ وہ بالاتفاق جواہر لال کو منتخب کر لیں، گاندھی جی سردار پٹیل کی طرف مائل تھے لیکن جواہر لال کا نام جب میری طرف سے پیش ہو گیا تو انہوں نے پبلک طور پر پھر اپنے خیالات اس سلسلہ میں ظاہر نہیں کیے۔

میرا فیصلہ غلط تھا

میں نے خوب سمجھ کر اپنے بارے میں دوبارہ امیدوار صدارت نہ بننے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن بعد میں حالات نے جو رُخ اختیار کیا تو پہلے آپ کو میں بر سر غلط سمجھنے لگا اور جو لوگ کم از کم ایک سال کے لیے دوبارہ مجھے صدر رکھنا چاہتے تھے، میں نے محسوس کیا وہ بر سر صواب تھے۔

عوام مجھے صدر رکھنا چاہتے تھے

مسلم لیگ کونسل اور کانگرس ورکنگ کمیٹی نے کابینہ پلان منظور کر لیا تھا، اب ضرورت تھی کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی سے بھی اس فیصلہ کی توثیق کرا لی جائے چنانچہ ۷، جولائی سنہ ۱۹۴۶ء کو اس کا جلسہ بمبئی میں طلب کر لیا گیا، ۴، جولائی کو کلکتہ سے بمبئی روانہ ہوا، اسی ٹرین میں سرجیندر بوس بھی سفر کر رہے تھے۔ ہر اسٹیشن پر لوگوں کا ہجوم غفیر یہ نعرے لگاتا نظر آتا کہ مجھے کانگرس کا صدر رہنا چاہیے۔ ہر بڑے اسٹیشن پر مسرت بابو اپنے کمپارٹمنٹ سے میرے کمپارٹمنٹ میں آتے اور بار بار کہتے۔

"دیکھیے لوگ کیا چاہتے ہیں اور آپ کیا کر رہے ہیں؟"

کابینہ پلان میں نے منظور کرایا

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجتماع میں کابینہ پلان سے متعلق جو تجویز تھی میں نے پیش کی، میری تقریر نے حاضرین پر بڑا اثر کیا، جب رائے شماری ہوئی تو غیر معمولی اکثریت سے کابینہ پلان کو کانگرس نے منظور کر لیا۔

لارنس اور کرپس کی تہنیت

چند روز بعد لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹیفرڈ کرپس کی طرف سے تہنیت۔ کے تار موصول ہوئے اس بات پر انہوں نے مسرت کا اظہار کیا تھا کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے عبوری تجویز منظور کر لی، انہوں نے مجھے مبارکباد دی کہ میں نے کابینہ پلان کو بڑی قابلیت کے ساتھ پیش کیا۔

اب ایسے المناک واقعات رونما ہوئے جنہوں نے تاریخ کا رُخ بدل دیا۔

جواہر لال نے کابینہ پلان درہم برہم کر دیا

۱۰ جولائی کو بمبئی میں جواہر لال نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا، کسی نمائندہ پریس نے دریافت کیا، کیا آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے کابینہ پلان کو بجنسہٖ اور بلفظہٖ منظور کر لیا ہے جس میں عارضی حکومت میں شرکت بھی شامل ہے۔

جواہر لال نہرو نے جواب دیا کانگرس دستور ساز اسمبلی میں بغیر کسی پابندی کے شریک ہوگی اور ہر صورت حال سے نمٹنے اور ہر سوال کو حل کرنے میں بالکل آزاد ہوگی۔

نمائندہ پریس نے ایک اور سوال کیا کہ آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کابینہ پلان میں ترمیم و تغیر ممکن ہے؟

جواہر لال نے جواب دیا، کانگرس نے دستور ساز اسمبلی میں شرکت منظور کی ہے، وہ اپنے آپ کو اس بارے میں بالکل آزاد سمجھتی ہے کہ اپنی صواب دید پر کابینہ پلان میں جس طرح کی تبدیلی یا ترمیم چاہے کرے۔ (ا)

جواہر لال کا بیان غلط تھا

میں اس جگہ یہ بات ریکارڈ میں لے آنا چاہتا ہوں کہ جواہر لال کا یہ بیان غلط تھا، یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں تھا کہ کانگرس حسب مرضی پلان میں تبدیلی اور ترمیم کرنے میں مختار تھی۔ ہم نے اس امر پر اتفاق کر لیا تھا کہ مرکزی حکومت وفاقی ہوگی، مرکزی حکومت کے پاس تین لازمی محکمے ہوں گے باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو حاصل رہیں گے، ہم نے اس امر پر بھی اتفاق کر لیا تھا کہ از روئے پلان ہندوستان تین حلقوں میں تقسیم ہو جائے گا اے، بی اور سی یہی حلقے صوبائی گروپ کی صورت اختیار کر لیں گے ان شرائط میں یکطرفہ طور پر کانگرس کوئی تبدیلی، شریک معاہدہ جماعتوں کے کامل اتفاق اور رضامندی کے بغیر نہیں کر سکتی۔

لیگ کونسل کی منظوری مسلم لیگ نے کابینہ وفد کا پلان منظور کر لیا تھا کیونکہ اس کی رو سے وہ زیادہ سے زیادہ اس نے پا لیا تھا جو برطانوی حکومت دے سکتی تھی، لیگ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر جناح نے صاف طور پر اقرار کیا تھا کہ وہ پلان منظور کرنے کی سفارش اس لیے کر رہے ہیں کہ اس سے بہتر اور زیادہ کچھ نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ (۳)

بم کا گولہ جواہر لال کا بیان مسٹر جناح کے لیے بم کا گولہ ثابت ہوا، انہوں نے فوراً ایک بیان شائع کیا کہ صدر کانگرس (جواہر لال) کا یہ بیان ساری صورت حالات پر از سر نو غور و فکر کا محتاج ہے انہوں نے لیاقت علی خاں سے کہا کہ لیگ کونسل کی میٹنگ بلائیں، اپنے بیان میں مسٹر جناح نے یہ بھی کہا کہ لیگ کونسل نے اس واضح یقین دہانی پر کابینہ پلان قبول کیا تھا کہ کانگرس بھی اس اسکیم کو منظور کر چکی ہے اور یہ کہ ہندوستان کے آئندہ دستور کی بنیاد یہی پلان ہوگا، لیکن اب صدر کانگرس یہ اعلان کر رہے ہیں کہ دستور ساز اسمبلی میں کانگرس اپنی اکثریت کے بل پر اس میں ترمیم اور تبدیلی کر سکتی ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ اقلیتیں، اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی ہیں، مسٹر جناح نے کہا کہ جواہر لال نہرو کے بیان کا مدعا یہ ہے کہ کانگرس نے کابینہ پلان مسترد کر دیا ہے۔ (۴)

مسلم لیگ نے پلان مسترد کر دیا بمبئی میں ۲۷ر جولائی کو مسلم لیگ کونسل کا جلسہ ہوا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں مسٹر جناح نے مطالبہ پاکستان کا پھر اعادہ کیا کیونکہ اب مسلم لیگ کے لیے یہی چارۂ کار رہ گیا تھا، کئی دن کے سخت مباحثہ کے بعد کونسل نے ایک تجویز منظور کر کے کابینہ پلان کو مسترد کر دیا، نیز حصول پاکستان کے لیے راست اقدام کا فیصلہ بھی کر لیا۔ (۵)

میری پریشانی اس نئی صورت حالات نے مجھے زیادہ پریشان اور دل گرفتہ کر دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے میں نے اتنی سخت جد و جہد کی تھی خود ہمارے ہی ہاتھوں برباد ہوئی جا رہی ہے، میں نے محسوس کیا کہ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس صورت حالات پر غور و خوض کے لیے جلد از جلد منعقد ہونا چاہیے ۸ر اگست کو

ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا جس میں یہ زور دیا کہ اگر ہم صورت حالات کو قابو میں لانا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ بات صاف کر دینی چاہیے کہ کانگرس کے خیالات اس باب میں وہی ہیں جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی تجویز میں درج ہیں اور کوئی شخص خواہ وہ صدر کانگرس ہی کیوں نہ ہو، ان میں تبدیلی کا مجاز نہیں۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی کا تذبذب

ورکنگ کمیٹی تو مگو کے عالم میں گرفتار تھی۔ ایک طرف صدر کانگرس کا وقار مجروح ہوتا نظر آتا تھا دوسری طرف وہ مفاہمت خطرہ میں تھی جو اتنی کاوشوں کے بعد حاصل ہوئی تھی صدر کے بیان کی اگر تردید کی جاتی ہے تو اس طرح خود کانگرس کی ساکھ جاتی رہے گی۔ کابینہ پلان کو اگر ترک کر دیا جاتا ہے تو سارا ملک برباد ہو جائے گا۔ (۶)

نئی تجویز

آخر کار ہم نے ایک تجویز کا مسودہ تیار کر لیا جس میں صدر کانگرس (جواہر لال) کی پریس کانفرنس کا کوئی حوالہ نہیں تھا لیکن آل انڈیا کانگرس کمیٹی سے منظور کردہ ریزولیشن کی توثیق مزید کی گئی تھی۔

مسٹر جناح کا بیان

ہمارا خیال تھا کہ ورکنگ کمیٹی کا ریزولیشن صورتِ حالات کو ابتر ہونے سے بچالے گا لیکن مسٹر جناح نے ہماری یہ پوزیشن تسلیم نہیں کی، انہوں نے کہا جواہر لال کا بیان کانگرس کی حقیقی ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر کانگرس اس طرح بار بار اپنے فیصلوں میں تبدیلی کر سکتی ہے حالانکہ ابھی انگریز موجود ہیں اور اختیارِ حکومت کانگرس کے ہاتھوں میں نہیں آیا ہے، پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب انگریز چلے جائیں گے (اور اختیارِ حکومت کانگرس کے ہاتھ میں ہوگا)، تو کانگرس اس پوزیشن پر واپس نہیں آ جائے گی جس کی جھلک جواہر لال کے بیان میں نظر آ رہی ہے؟ (۷)

وائسرائے کا رویہ

کانگرس ورکنگ کمیٹی کی (اس نئی) تجویز کا وائسرائے کی طرف سے فوری جواب ملا، ۱۲ر اگست کو جواہر لال کو عارضی مرکزی حکومت کی تشکیل کی دعوت دی گئی۔ (۸)

جواہر لال کی جناح سے ناکام ملاقات

۱۲ اگست ہی کو مسٹر جناح نے ایک بیان میں کہا کہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کا نیا ریزولیشن جو ۱۰ اگست کو واردھا میں منظور ہوا ہے، الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ کانگرس کے سابقہ موقف کا ترجمان ہے۔ انہوں نے عارضی حکومت کے قیام کے سلسلہ میں جواہر لال کی دعوت تعاون مسترد کر دی۔ ۱۵ اگست کو جواہر لال، مسٹر جناح کے گھر پر ان سے ملے۔ لیکن بحث و گفتگو کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور صورت حالات تیزی کے ساتھ انحطاط پذیر ہوتی چلی گئی۔ (۹)

لیگ کا یوم راست اقدام

جب جولائی کے آخر میں، لیگ کونسل نے راست اقدام کا فیصلہ کیا تو اس نے مسٹر جناح کو اختیار دے دیا کہ وہ اس اقدام کو کامیاب بنانے کے لیے جو طریقہ چاہیں اختیار کریں۔ مسٹر جناح نے "یوم راست اقدام" کے لیے ۱۶ اگست کی تاریخ مقرر کر دی لیکن یہ واضح نہیں کیا کہ پروگرام کیا ہو گا؟ کلکتہ میں عام احساس میں نے یہ دیکھا کہ اس دن مسلم لیگی کانگرسی کارکنوں پر حملے کریں گے اور کانگرسی پراپرٹی کو لوٹیں گے اور نقصان پہنچائیں گے، مزید براں اس وقت پیدا ہوا جب بنگال گورنمنٹ نے ۱۶ اگست کو عام تعطیل کا اعلان کر دیا، بنگال اسمبلی کی کانگرس پارٹی نے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا اور جب یہ احتجاج ناکام ہوا تو اظہار ناراضگی کے طور پر واک آؤٹ کر گئی۔ کلکتہ میں عام طور پر اضطراب و تشویش کا عالم طاری تھا، اس لیے اور زیادہ کہ حکومت مسلم لیگ کی تھی اور مسٹر حسین شہید سہروردی وزیر اعلیٰ تھے۔ (۱۰)

یوم سیاہ

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۶ اگست یوم سیاہ کی حیثیت رکھتا ہے بپھرے ہوئے بلوائیوں نے سارے کلکتہ شہر میں قتل و غارت اور دہشت کا بازار گرم کر دیا، سینکڑوں آدمی ہلاک ہو گئے، ہزاروں مجروح ہوئے کروڑوں روپیہ کی املاک و جائداد غارت کر دی گئی، لیگ کی طرف سے جلوس نکلے شرکائے جلوس نے لوٹ مار اور مار دھاڑ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے سارا

شہر ہندو مسلم غنڈوں کی گرفت میں آگیا۔ سارے شہر میں ملٹری اور پولیس تیار کھڑی تھی؛ لیکن غیر متحرک جامد جس کی آنکھوں کے سامنے معصوم مردوں اور عورتوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ (۱۱)

تاریخ ہند کا سب سے بڑا المیہ

۱۶ راگست ۱۹۴۶ء کا دن، صرف کلکتہ ہی کے لیے نہیں سارے ہندوستان کے لیے یوم سیاہ تھا۔ واقعات کا موڑ ایسے مرحلہ پر پہنچ گیا تھا کہ اب کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین پُر امن مصالحت ناممکن ہو گئی تھی، یہ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ (۱۲)

جواہر لال کی جذباتیت

جواہر لال میرے محبوب ترین دوست ہیں، ہندوستان کی قومی زندگی میں انہوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ کسی دوسرے فرد سے کم نہیں ہیں، انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کیا تھا، مصائب برداشت کیے تھے اور آزادیٔ ہند کے بعد سے تو وہ ہماری قومی زندگی اور ارتقا کا نشان بن گئے ہیں لیکن اس کے باوجود افسوس کے ساتھ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بعض اوقات وہ جذبات کی رَو میں بہہ جاتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ نظریاتی افکار سے اس درجہ متاثر ہو جاتے ہیں کہ صورتِ حالات کی اہمیت اور نزاکت کا اندازہ لگانے میں غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ (۱۳)

جواہر لال کو تجریدی نظریات سے جو شغف ہے اس کا نتیجہ دستور ساز اسمبلی سے متعلق ان کا یہ تازہ بیان تھا۔

(ص ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲)

جس درد و سوز، قلبی تعصب اور صدمہ نیز انتہائی قلق اور افسردگی کے ساتھ مولانا نے یہ باب قلم بند کیا ہے، اس کا ایک ایک حرف ان کے اثرات و احساسات کی منہ بولتی تصویر ہے ساری کتاب میں پہلی مرتبہ انہوں نے جواہر لال کے ایک اقدام کو صاف اور الفاظ میں غلط اور مہلک قرار دیا ہے۔ اپنی اس کتاب میں انہوں نے گاندھی جی،

سردار پٹیل اور دوسرے کانگرسی رہنماؤں پر دھڑلے سے نکتہ چینی کی ہے لیکن جواہر لال کا جب ذکر آیا ہے تو

یار کا پاس نزاکت دل ناشاد رہے
نالہ رکتا ہوا، تھمتی ہوئی فریاد رہے

کے مصداق بن گئے ہیں، لیکن یہ مرحلہ ایسا آیا کہ خاموش نہ رہ سکے، دبی زبان میں گفتگو نہ کر سکے، دل کی بات زبان پر لانا ہی پڑی۔

اس باب میں مولانا نے کئی باتیں ایسی فرمائی ہیں جن پر الگ الگ نسبتاً تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

جواہر لال کا یہ بیان ان کی آمرانہ ذہنیت، بے اصولی اور موقع پرستی کا شاہد ہے۔ جب تک کابینہ پلان بنتا رہا، وہ خاموش رہے، جب یہ پلان بن گیا، انہوں نے آمنا و صدقنا کا نعرہ بلند کیا۔ جب کانگرس نے اس پلان پر مہر تصدیق ثبت کی تو منظور کا نعرہ لگانے والوں میں وہ پیش پیش تھے۔ جب قائد اعظم اور مسلم لیگ نے استرداد پاکستان کے باوجود اسے منظور کر لیا انہوں نے نطق گوہر بار کو جنبش نہ دی جب کابینہ پلان کی توثیق حکومت اور حکومت برطانیہ نے کی تو وہ مہر بلب رہے، جب تمام پارٹیاں کانگرس، حکومت برطانیہ اور خاص طور پر مسلم لیگ، پابند ہو کر بظاہر اپنے ہاتھ کٹا بیٹھیں تو انہوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا کہ صرف دستور ساز اسمبلی جو قائم ہو رہی تھی، اسے مسترد کرنے، اس میں تبدیلی کرنے، اس میں کمی اور اضافہ کرنے کا حق حاصل ہے دوسرے الفاظ میں دستور ساز اسمبلی کی ہندو اکثریت اپنی کثرت آرا کے بل پر جب چاہے کابینہ پلان کو درہم برہم کر سکتی تھی، اقلیتوں کو اور خاص طور پر وہ بادل نخواستہ پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے، یہ سارے حقوق دستور ساز اسمبلی کے ہندو ممبر ہاتھ اٹھا کر منسوخ، معطل، ناکارہ اور رد کی قرار دے سکتے تھے اور چونکہ حقوق شاہی دستور ساز اسمبلی کو حاصل ہوتے لہذا اس کے ان ظالمانہ اور سفاکانہ فیصلوں کی اصلاح و تدارک، دنیا کی کوئی طاقت حتی کہ حکومت برطانیہ تک نہیں کر سکتی تھی۔ عام طور پر سیاست کی دنیا دجل و فریب کی دنیا ہے تاریخ میں اس سے بڑھ کر بھی کوئی مثال دجل و فریب کی مل سکتی ہے

اگر بات وہی تھی جو جواہر لال کہہ رہے تھے تو پھر اتنے تکلفات کی شملہ اور دہلی کی نشستوں کی اس پلان کی ایک ایک دفعہ پر غور کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ کابینہ وفد سے کہا جاتا ، دستور ساز اسمبلی بنا کر رخصت ہو جائیے ۔

نقصہ کوتہ گشت ورنہ دردِ سر بسیار بود

لیکن کابینہ اسکیم کو من وعن قبول کر لینا اور قبول کر لینے کے بعد ایسا فتنہ انگیز قدم اٹھانا، اتنا رکیک و سخیف اقدام تھا کہ مولانا جیسا جواہر لال کا محب صادق بھی اظہارِ ملامت کیے بغیر نہ رہ سکا۔

(۲)

اصل اور بنیادی چیز تو یہی تھی کہ صرف اکثریت کے بل پر کوئی معاہدہ، کوئی سمجھوتہ کوئی اصول بھی نہیں بدلا جا سکتا ، ہاں تمام متعلقہ پارٹیاں متفق ہوں تو سب کچھ ممکن ہے ۔ جواہر لال نے اگر اپنے خیالات سے مسلم لیگ کو متفق کر لیا ہوتا اور پھر ایسا بیان دیتے تو نہ مسلم لیگ کو اختلاف ہوتا ، نہ کابینہ وفد کو ، لیکن انہوں نے جلد بازی سے کام لیا اور قبل از وقت اپنے عزائم فاش کر دیے ۔ دستور ساز اسمبلی میں جاتے ، اور انگریزوں سے اختیاراتِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد یہ کہا اور کیا ہوتا تو واقعی پھر نہ قائد اعظم کچھ کر سکتے تھے ، نہ مسلم لیگ ، پھر قائد اعظم کو اور مسلم لیگ کو ایک مستحکم حکومت کی باغی رعایا کی حیثیت حاصل ہوتی اور یہ دشمن حکومت اپنی باغی رعایا کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ ہولناک اور لرزہ خیز بدسلوکی کرتی جو اس نے آزادی کے بعد وفادار ، پُر امن اور نہتے مسلمانوں کے ساتھ کی تھی ۔

(۳)

ٹھیک ہے اس پلان کی رُو سے پاکستان نام کی کوئی حکومت تو فی الحال نہ قائم ہوتی لیکن مسلمانوں کا قومی تشخص محفوظ ہو جاتا اور اندرونی طور پر اکثریت کی بالادستی سے محفوظ ہو کر وہ اپنے فروغ و ارتقا کی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتے تھے ۔

(۴)

جواہر لال نے یہ بیان صدر کانگریس کی حیثیت سے اپنی پہلی پریس کانفرنس میں دیا تھا، اس کے صاف معنی یہ تھے کہ کانگریس نے عملی طور پر پلان مسترد کر دیا ، ظاہر ہے

اب مسلم لیگ کو بھی اس نئی فضا اور ماحول میں اپنی راہ عمل متعین کرنی تھی۔

(۵)

اگر کانگرس اپنے ناجائز اور نادرست مطالبات منوانے کے لیے بار بار راست اقدام (سول نافرمانی) کر سکتی تھی تو مسلم لیگ اپنے جائز اور تسلیم شدہ حقوق کی بحالی اور بازیابی کے لیے راست اقدام کا پروگرام نہ بناتی تو کیا کرتی؟

(۶)

کیا صداقت کے پرستاروں کا رویہ یہی ہونا چاہیے تھا؟ اگر کانگرس کے صدر نے کوئی غلطی کی تھی کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی تھی تو انصاف، اصول اور صداقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے خلاف تجویز ملامت منظور کی جاتی اسے صدارت سے برطرف کر دیا جاتا، اسے کچھ عرصہ کے لیے ہر ذمہ دار منصب سے محروم کر دیا جاتا۔ اگر کانگرس یہ کرتی تو اس کی ساکھ ختم نہ ہوتی، اس کا وقار بڑھ جاتا، ملک کے مفاد اور وقار کے سامنے شخص کا وقار کیا چیز ہے؟

(۷)

"قائداعظم کا یہ اعتراض حد درجہ مبنی بر حقیقت تھا کہ اسے صحیح معنے میں 'فراست مومن' کا شاہکار کہنا چاہیے۔

آزادیٔ ہند کے بعد کانگرس نے اپنے بہت سے کیے ہوئے وعدے، معاہدے سمجھوتے، بیک جنبش لب اور بیک جنبش قلم مسترد کر دیئے، حتیٰ کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست حیدرآباد کا وجود تک ختم کر دیا جس کا از روئے معاہدہ اسے کوئی حق حاصل نہ تھا۔

(۸)

وائسرائے نے یہ دعوت مسٹر ایٹلی وزیراعظم برطانیہ کے ایما سے دی!

مسٹر ایٹلی کانگرس کی اس نیم دلانہ اور ناقابل یقین لیس پوت پر اعتبار کرنے پر مجبور تھے وہ جلد از جلد زمام اختیارات کانگرس کو سونپ دینے کے لیے بے تاب تھے قائداعظم اور مسلم لیگ کے بارے میں وہ کیسے گھناؤنے اور پست خیالات رکھتے تھے، اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے جیلی وغیرہ پر گزشتہ

سال کی تھی اور جس کی تلخ یاد اب تک پاکستانیوں کے دلوں میں موجود ہے۔

(۹)

جواہر لال قائد اعظم کے بنگلہ پر جا کر بے شک ان سے ملے لیکن ایک دوست کی حیثیت سے نہیں، ایک ہمسفر کی حیثیت سے نہیں، ایک فاتح کی حیثیت ۔ وہ قائد اعظم کو منانے نہیں گئے تھے چیلنج کرنے گئے تھے، انہوں نے کانگرس کی نئی تجویز کے باوجود اپنے پریس کانفرنس والے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی، اس پر وہ اب تک قائم تھے ان کا خیال تھا جاہ و منصب کی رشوت قائد اعظم کو ان کے جادہ سے ہٹا دے گی۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا، وہ فاتح کی حیثیت سے گئے تھے لیکن شکست کھا کر واپس آئے ہے

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم!

قائد اعظم پر یہ اعتراض کہ انہوں نے راست اقدام کا کوئی پروگرام واضح نہیں کیا بالکل بودا ہے، راست اقدام ابھی نہیں شروع ہو رہا تھا، اس دن صرف اس کا اعلان مقصود تھا۔

بنگال میں مسلم لیگ کی وزارت یا یوم راست اقدام پر پبلک تعطیل کا اعلان یا مسٹر حسین شہید سہروردی کی وزارت عظمیٰ ان میں سے کون سی چیز نئی یا تشویش انگیز تھی؟ اس طرح کے سیاسی اور احتجاجی مظاہرے ہندوستان کے طول و عرض میں گزشتہ بیس سال سے برابر ہوتے چلے آ رہے تھے پھر مسلم لیگ کے اس اقدام پر سراسیمگی کیوں تھی؟ جواب ایک ہے مجرم ضمیر کی خلش۔

کلکتہ کے بلوے کا آغاز و انجام کا ذمہ دار مولانا نے مسلم لیگ کو ٹھہرایا ہے حیرت ہے کہ کلکتہ میں رہتے ہوتے مولانا نے ایسی بات کہہ دی جسے حقیقت اور واقعہ سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

یوم راست اقدام کے سلسلہ میں جب کلکتہ کشت و خون کا مرکز بنا تو ان حوادث میں مسلم لیگ کے بدترین دشمن قائد اعظم کے سخت ترین مخالف، مسٹر سہروردی کے زبردست نکتہ چین کانگرس کے والا و شیدا، وحدت ہند کے علمبردار اور مولانا آزاد کے دست راست اور راحت قلب و روح اور نفس ناطقہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

نے اپنے روزنامہ ہند میں واقعات کا جو نقشہ کھینچا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ کشت و خون اور قتل و غارت کا آغاز ہندوؤں کی طرف سے ہوا، اس لیے کہ وہ عرصہ سے تیاریاں کرتے چلے آتے تھے۔

۲۔ مسلمانوں کی طرف سے یہ ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ کلکتہ میں مسلمانوں کی اقلیت تھی اور ہندوؤں کی اکثریت۔

(۳)

ہسپتالوں میں زخمیوں اور ہلاک شدگان کی جو پہلی کھیپ پہنچی وہ اگر تمام تر نہیں تو زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل تھی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ظالم نہیں مظلوم تھے، ابتداء ان کی طرف سے نہیں ہوئی انہوں نے صرف مدافعت کی تھی۔

(۴)

ہندوؤں نے منظم طور پر ہر طرح کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مسلمان محلوں میں حملے کیے، یہ دوسری بات ہے کہ مسلمانوں نے کم تعداد ہونے کے باوجود جس تہور سے مقابلہ کیا اس کا انجام یہ ہوا کہ حملہ آوروں کو سر بازار سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا۔

(۵)

دور افتادہ علاقوں کے مسلمان مچھیرے اور ماہی گیر تک ہندوؤں کی قاتلانہ یورش اور یلغار سے نہ بچ سکے۔ ان بچاروں کو اچانک گھیرے میں لے لیا گیا، اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا گیا۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر اپنے ہندو بن جانے کا اعلان کیا، لیکن ہندو کی جبلت سے انہیں زندہ رکھنا نہ گوارا کیا گیا۔

ان واقعات و حقائق کو نظر انداز کر کے مسلم لیگیوں کے سر پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالنا مولانا کی شان سے بعید تھا اگر وہ اسی روز کلکتہ سے دہلی چلے گئے تھے تو انہیں فون پر مولانا ملیح آبادی سے حقیقت حال معلوم کر لینی چاہیے تھی، یا کلکتہ واپس آنے کے بعد امرت بازار پتریکا وغیرہ کے علاوہ "ہند" کا فائل بھی منگا کر پڑھ لینا چاہیے تھا۔

(۶)

ملٹری پر "غیر متحرک" ہونے کا الزام مسلم لیگ کے بجائے حکومت ہند پر عائد

کرنا چاہیے تھا۔

اور پھر ملٹری کا یہ انداز عمل کیا صرف کلکتہ تک محدود تھا؟
کیا بہار میں گڑھ مکتیسر میں، مشرقی پنجاب میں کہیں بھی یہ غیر متحرک ملٹری متحرک نظر آئی، عالم بالا سے شاید ایسے احکام ہی یہ ملے تھے کہ غیر جانبدار تماشائی بنی رہے۔

(۱۲)

بے شک پرامن مصالحت کا امکان ختم ہو جانا ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا لیکن اس کی ذمہ داری کس پر تھی؟ کیا جواہر لال کے علاوہ کسی اور پر؟

(۱۳)

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ کانگرس کے حلقہ میں اور ہندو قوم میں جواہر لال اپنے علم، مطالعہ، تاریخ دانی، سیاست میں مہارت، رواداری، وسعت قلب و نظر اور بے تعصبی کے اعتبار سے عدیم النظیر مانے جاتے ہیں، لیکن ہندو مسلم مفاہمت کی ہر کوشش جس چٹان سے ٹکرا کر ختم ہوتی وہ نہ مالوی جی تھے، نہ ڈاکٹر مونجے، نہ ٹنڈن جی، نہ گرو گوا مکر نہ شردھانند اور نہ لالہ ہر دیال ——— وہ جواہر لال تھے ——— یا ان کے والد محترم موتی لال!

میں ثبوت بھی پیش کرتا ہوں!

۱۔ ۱۹۲۸ء میں "نہرو رپورٹ" کا شاہکار موتی لال نے پیش کیا۔ تمام مسلم جماعتوں نے خاص طور پر مجلس مرکزیہ خلافت ہند نے اس کی مسلم آزار دفعات کے خلاف سخت احتجاج کیا، لیکن قائد اعظم اختلاف کے باوجود خاموش رہے، وہ چاہتے تھے اختلافات باہمی گفت و شنید سے ختم کر لیا جاتے، اسے منظر عام پر لا کر فضا خراب نہ کی جائے۔

مسلم لیگ کی صدارت کے لیے مولانا محمد علی کا نام پیش ہوا لیکن مسٹر جناح نے جواب تک قائد اعظم نہیں بنے تھے، مولانا محمد علی کی بجائے راجہ سر محمد علی خاں مرحوم مہاراجہ محمود آباد کو صدر منتخب کرایا کیونکہ مولانا محمد علی نہرو رپورٹ کے مخالف تھے اور موتی لال سے ان کے ذاتی تعلقات تلخ تھے اور مہاراجہ محمود آباد، موتی لال کے ذاتی دوست تھے اور نہرو رپورٹ کے حامی تھے۔

مسٹر غلام محمد چھاگلا جو بمبئی کے نامور ایڈووکیٹ تھے اور جو بعد میں بمبئی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس بنے اور اب امریکہ میں بھارت کے سفیر ہیں، مسٹر جناح کے معتمد ترین

شخص تھے اور کانگرس سے حد درجہ متاثر۔ مسٹر جناح نے مسٹر چھاگلا کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ مسلم مفاد، اور قومیت ہند کے درمیان سفیر صلح کے فرائض انجام دیں اور نہرو رپورٹ میں ان کی تجویز کردہ ترمیمیں منظور کرانے کی کوشش کریں کیونکہ یہ ایک طرف موتی لال کے لیے قابل قبول ہیں دوسری طرف مسلمانوں کے مفاد کی ضامن۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کانگرس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ میں پیش ہوتی لیکن اس سے چند روز پہلے "نیشنل کنونشن" کا انعقاد کانگرس کی طرف سے ہوا۔ کنونشن میں مسٹر جناح، مسٹر چھاگلا، مہاراجہ محمود آباد اور دوسرے رفقا کے ساتھ پہنچے اور اپنی ترمیمیں پیش کیں۔ کنونشن میں سر تیج بہادر سپرو وہ واحد قابل ذکر شخص تھے جنہوں نے تجاویز جناح کی (مسٹر جناح کے مشہور چودہ نکات) تائید کی لیکن موتی لال نے ایک تجویز بھی نہ مانی۔ وہ اس پر اڑے ہوئے تھے کہ نہرو رپورٹ بجنسہٖ منظور کی جائے۔

کنونشن نے پھر کانگرس نے یہ رپورٹ منظور کر لی، مسٹر جناح ناکام ہوئے لیکن مایوس نہیں ہوئے۔ خود ان کے بھی موتی لال سے ذاتی مراسم تھے، اب تک ان کی کوشش یہی تھی کہ باہمی گفت و شنید سے معاملہ طے ہو جائے۔

مرکزی اسمبلی کے ممبر موتی لال بھی تھے اور مسٹر جناح بھی موتی لال نے اسمبلی میں ایک تقریر کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ "نہرو رپورٹ" کو ہندوستان کے متفقہ دستور کی حیثیت سے منظور کرے، اب مسٹر جناح سے ضبط نہ ہو سکا، وہ اٹھے اور انہوں نے ایک زبردست تقریر میں نہرو رپورٹ کی دھجیاں بکھیر دیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم مفاہمت کا بہترین موقع ضائع ہو گیا اور ایک سال بعد دسمبر ۱۹۲۹ء میں نہرو رپورٹ غرق دریائے راوی ہو گئی۔

(۲)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد مسٹر جناح کی کوشش یہ تھی کہ کانگرس اور مسلم لیگ میں مفاہمت ہو جائے تاکہ یہ دونوں قومیں مل کر اتحاد، تعاون اور اشتراک کے ساتھ صوبائی اصلاحات پر عمل کریں۔

لیکن دفعتہً کلکتہ میں ایک تقریر کرتے ہوئے جواہر لال نے اعلان کر دیا۔

"ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں ایک انگریز، دوسری کانگرس"

مسٹر جناح کو جواب دینا پڑا۔

"جی نہیں ایک تیسری طاقت بھی ہے ——— مسلم قوم!"

یہاں سے تلخی بڑھی اور لیگ اور کانگرس میں اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

(۳)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد یوپی مسلم لیگ نے دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں، لیگ اب بھی کانگرس سے تعاون پر تیار تھی۔ مولانا آزاد نے خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کو وزارت کی پیش کش کی۔ جو دونوں نے منظور کر لی لیکن جواہر لال نے مداخلت کی اور یہ پیش کش واپس لے لی۔ اور فرمایا ان دونوں کو وزیر نہیں بنایا جا سکتا۔ ان میں سے جس ایک کو چاہے لیگ نامزد کر دے وزیر بنا لیا جائے گا۔ خلیق الزماں اور اسماعیل خاں نے جواہر لال کی پیش کش مسترد کر دی اور تعاون کا ایک بہترین موقع ضائع ہو گیا جس کا اعتراف خود مولانا نے بھی اس خود نوشت میں کیا ہے۔

(۴)

سب سے آخر میں جب لیگ پاکستان کے مطالبہ تک سے دستبردار ہو گئی تھی اور کابینہ پلان قبول کر کے اس نے وحدت ہند کے لیے بہت بڑی قربانی اور ایثار کا ثبوت دیا تھا، جواہر لال نے کابینہ پلان مسترد کر دیا۔

(۱۴)

دستور ساز اسمبلی سے متعلق جواہر لال کا یہ بیان ہی دراصل تقسیم ہند پیش خیمہ تھا، جس کا کریڈٹ انہیں قیامت تک ملتا رہے گا۔

---

(۱۱)

مسلم لیگ کی سیاست اور پاکستان کی تحریک

شملہ کانفرنس "۲۵ جون ۱۹۴۵ء لارڈ ویول وائسرائے ہند کی طلب کردہ "شملہ کانفرنس" کا آغاز ہو چکا ہے، مسلم لیگ اور کانگرس کے نمائندے موجود ہیں اور پیش کردہ سفارشات اور مباحث میں حصہ لے رہے ہیں۔ کانفرنس کے شروع ہوتے ہی مسلم لیگ اور کانگرس کے اختلافات نمایاں تر نظر آنے لگے)

"دوسرے روز کے اجلاس میں کانفرنس متعدد بنیادی امور پر متفق ہو گئی۔ مثلاً اقلیتوں کا مناسب نمائندگی، مساعی جنگ، مکمل تعاون، اختتام جنگ تک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل وغیرہ۔

مسٹر جناح کا مطالبہ اصل اختلاف کانگرس اور مسلم لیگ میں ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل پر پیدا ہوا، مسٹر جناح کا مطالبہ یہ تھا کہ کانگرس صرف ہندو ممبروں کو نامزد کرے، مسلمان ممبروں کی نامزدگی مسلم لیگ کرے گی، ہیں نے کہا کانگرس ایسے مطالبے کو ہرگز قبول نہیں کر سکتی وہ کسی حالت میں بھی اپنا وجود ایک ہندو تنظیم کی حیثیت سے گوارا نہیں کر سکتی۔ کانگرس کو حق ہوگا کہ جس ہندوستانی کو چاہے نامزد کر دے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا پارسی یا سکھ، کانگرس ایگزیکٹو کونسل میں ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر شرکت کرے گی ورنہ نہیں کرے گی۔ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے یہ اسے خود طے کرنا چاہیے کہ وہ کن لوگوں کو

نامزد کرے گی۔ (۱) (ص ۱۰۹، ۱۱۰)

پنت جناح گفتگو

۲۶ جون کو مسٹر جناح نے کانگریس سے گفت و شنید کی خواہش ظاہر کی، اس مقصد کے لیے میں نے مسٹر گوبند بلبھ پنت کو نامزد کیا میرے خیال میں مسٹر جناح سے گفت و شنید کے لیے وہ موزوں ترین آدمی تھے۔ ان دونوں کی گفتگو کئی روز تک جاری رہی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ (۲) (ص ۱۱۰)

مسلم لیگ کے تین دور

مسلم لیگ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی تاریخ ماضی پر ایک نظر ڈالیں، سیاسی مسائل کے سلسلہ میں مسلم لیگ حسب ذیل تین ادوار سے گزری۔

مسلم لیگ کا پہلا دور

(۱) ۱۹۰۶ء میں نواب مشتاق حسین (وقار الملک) کی کوشش سے بمقام ڈھاکہ مسلم لیگ کی بنیاد پڑی، میں اس موقع پر موجود تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے قیام کے دو سبب بتائے گئے تھے۔ ایک تو یہ کہ حکومت برطانیہ سے وفاداری کا رشتہ استوار رہے، دوسرے ہندوؤں اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں سرکاری ملازمتوں کے اندر مسلمانوں کے مفادات و حقوق محفوظ رہیں۔ اس دور میں برطانوی حکومت کانگریسی مطالبات کے سلسلہ میں مسلم لیگ کو جواب کے طور پر استعمال کرتی رہی۔ (۳)

مسلم لیگ کا دوسرا دور

(۲) جب مسلم لیگ نے محسوس کیا کہ کانگریس کے دباؤ سے متاثر ہو کر حکومت سیاسی اصلاحات کے نفاذ پر مجبور ہو رہی ہے تو وہ حواس باختہ ہو گئی۔

مسلم لیگ سیاسی جنگ سے ہمیشہ کنارہ کش رہی لیکن جب ہندوستان نے کوئی قدم آگے بڑھایا تو وہ مسلمانوں کے مطالبات لے کر کھڑی ہو گئی۔ لیگ کا یہ پروگرام حکومت کے حسب دلخواہ تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لیگ برطانیہ کے چشم و ابرو پر رقص

کر رہی تھی ۔۔۔ "مارلے منٹو"، اصلاحات اور "ماؤنٹ فورڈ" اسکیم کے زمانہ میں بھی ان کا رویہ یہی تھا ۔ (۴)

مسلم لیگ کا تیسرا دور

دوسری جنگ عظیم سے تیسرا دور شروع ہوتا ہے کانگرس نے نمایاں طور پر قوت و شوکت حاصل کر لی تھی، یہ بات روز بروز واضح ہوتی جا رہی تھی کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو آزاد کر دے گی، مسٹر جناح مسلم لیگ کے مسلمہ لیڈر تھے، انہوں نے محسوس کیا کہ کانگرس اور حکومت کے اختلافات سے انہیں پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے ۔ انتقال اختیارات کے سلسلہ میں جب بھی حکومت اور کانگرس کے مابین گفت و شنید شروع ہوتی، مسٹر جناح نے سکوت اختیار کر لیا ۔ اگر گفتگو ناکام ہوتی تو انہوں نے جھٹ ایک بیان شائع کر کے دونوں پارٹیوں کو ملامت شروع کر دی اور فرمایا کہ چونکہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا لہٰذا برطانوی پیش کش پر مسلم لیگ کو اظہار رائے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اگست سنہ ۱۹۴۰ء کی پیش کش اور سنہ ۱۹۴۲ء کی کرپس پیش کش کے زمانہ میں مسٹر جناح نے یہی کیا لیکن شملہ کانفرنس نے ایسی صورت حال پیدا کر دی جس سے اب تک مسٹر جناح دو چار نہیں ہوئے تھے ۔ (۵)

(ص : ۱۱۰، ۱۱۱)

مسٹر جناح کا غیر مصالحانہ رویہ

(جون سنہ ۱۹۴۵ء شملہ کانفرنس)

ہم مسلم لیگ کو زیادہ سے زیادہ رعایت دینے کو تیار تھے لیکن مسٹر جناح نے یکسر غیر مصالحانہ رویہ اختیار کر لیا، حد یہ ہے کہ انہوں نے مجوزہ ایگزیکٹو کونسل کے لیے اس وقت تک نام پیش کرنے سے بھی انکار کر دیا ۔ جب تک ان کا نقطۂ نظر تسلیم نہ کر لیا جائے ۔ (۶)

(ص : ۱۱۵)

مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ نہیں

(جون ۱۹۴۵ء شملہ کانفرنس)

میں نے نمائندگان اخبار سے کہا جہاں تک ہم سے ممکن تھا، ہم نے مسٹر جناح کی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کی لیکن ہم ان کا یہ دعویٰ کسی طرح بھی تسلیم نہیں کر سکتے "کہ مسلم لیگ ہی مسلمانان ہند کی تنہا نمائندہ اور با اختیار تنظیم ہے جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں مسلم لیگ کی وزارت نہیں ہے، صوبہ سرحد میں کانگریسی وزارت ہے۔ بنگال میں گورنر راج ہے، پنجاب میں یونینسٹ کام کر رہی ہے۔ سندھ میں سر غلام حسین کانگریس کی تائید کے بھروسہ پر جی رہے ہیں، یہی صورت آسام میں ہے لہٰذا یہ دعویٰ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ مسلم لیگ ہی مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ (۷)

(ص: ۱۱۴)

نئے انتخابات کے نتائج

(۱۹۴۶ء ہندوستان کے عام انتخابات ہو چکے ہیں)

جیسا کہ عام طور پر متوقع تھا، کانگریس نے بنگال، پنجاب اور سندھ کے علاوہ ہر صوبے میں کامیابی حاصل کی، بس ان تینوں صوبوں میں پوزیشن پیچیدہ تھی۔

بنگال میں مسلم لیگ سب سے بڑی واحد پارٹی تھی، اس نے تقریباً نصف نشستوں پر قبضہ کر لیا، پنجاب میں یونینسٹ پارٹی اور لیگ کا پلہ تقریباً برابر تھا، سندھ میں مسلم لیگ نے نشستوں کی بڑی تعداد جیت لی، لیکن اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ ان تینوں صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے اور مسلم لیگ کے پروپیگنڈہ نے مذہبی دیوانگی اور فرقہ وارانہ منافرت کے جذبات پیدا کر دیے تھے۔ اس صورت حال نے سیاسی مسائل کو اتنا زیادہ دشوار بنا دیا کہ جو مسلمان کانگریس یا کسی دوسری جماعت کے

ٹکٹ پر کھڑے ہوتے ان کے لیے ناممکن تھا کہ لوگوں کے سامنے اظہارِ خیال کر سکیں، صوبہ سرحد میں جہاں مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت تھی۔ لیگ کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں اور تشکیلِ وزارت کا کام کانگرس نے کیا۔ (۸)

(ص : ۱۲۴)

پاکستان سے نئے مسائل پیدا ہو جائیں گے

(اپریل ۱۹۴۶ء کابینہ وفد آچکا ہے مولانا آزاد کا خیال ہے کہ ہندوستان کے لیے وفاقی دستور موزوں ترین دستور ہوگا۔)

۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو میں نے ایک بیان شائع کیا تھا اور اب کہ تقسیم ہند ایک حقیقت بن چکی ہے اور یہ حقیقت دس سال پرانی بھی ہو چکی ہے، آج بھی میں وہی کہتا ہوں جو میں نے اس روز کہا تھا، میں نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

ہر ممکن نقطۂ نظر سے میں نے مسلم لیگ کی تجویز پاکستان پر غور کیا، اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ نہ صرف مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے لیے بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بھی مضر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تجویز سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ بہت سے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ (۹)

لفظِ پاکستان سے اختلاف

میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کا لفظ ہی میری طبیعت قبول نہیں کرتی اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا ایک حصہ تو پاک ہے اور باقی ناپاک، پاک اور ناپاک کی بنیاد پر کسی قطعۂ ارض کی تقسیم قطعاً غیر اسلامی اور رُوحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام اس طرح کی کوئی تقسیم قبول نہیں کرتا، آنحضرتؐ کا قول ہے کہ خدا نے ساری دُنیا کو میرے لیے مسجد بنایا ہے، علاوہ ازیں میں تو محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کی اسکیم شکست خوردگی کی ایک واضح علامت ہے۔ اس کی تعمیر جس بنیاد پر رکھی گئی ہے وہ ہے یہودیوں کے قومی وطن کی مثال۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان کو بحیثیت مجموعی اپنا وطن نہیں بنا سکتے، وہ صرف اس ٹکڑے پر قناعت کریں گے

جو ان کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہو۔ (۱۰)

وطن الیہود اور پاکستان

جہاں تک یہودیوں کے قومی وطن کا مطالبہ ہے اس سے ہمدردی کی جا سکتی ہے کیونکہ وہ ساری دُنیا میں بکھرے ہوتے ہیں اور کسی علاقہ میں بھی نظم و انصرام پر کوئی اثر نہیں رکھتے لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی تعداد نوّے ملین سے زیادہ ہے وہ کمیت اور کیفیت ہر لحاظ سے ہندوستانی زندگی کا ایک اہم عنصر ہیں۔ وہ انتظام اور پالیسی کے ہر مسئلہ پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ قدرت نے ان کی مزید مدد اس طرح کی ہے کہ بعض رقبوں میں ان کی اکثریت بھی ہے، اس سے بڑھ کر بزدلانہ بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ میں پورے آبائی ترکہ سے دستبردار ہو کر اس کے صرف ایک ٹکڑے پر قناعت کر لوں! (۱۱)

دو قومی نظریہ

جیسا کہ سب جانتے ہیں مسٹر جناح کے پاکستان کی اسکیم دو قومی نظریہ پر مبنی ہے، ان کی تحقیق یہ ہے کہ ہندوستان بہت سی قومیتوں پر مشتمل ہے جن کی بنیاد مذہبی اختلافات پر ہے، ہندوستان میں دو بڑی قومیں ہیں، ہندو اور مسلمان۔

ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے انہیں جداگانہ حکومتوں کا مالک ہونا چاہیے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے ان نتائج پر غور کرنا چاہیے جو پاکستان بن جانے کے بعد رُونما ہوں گے، ہندوستان دو حکومتوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی، دوسری میں ہندوؤں کی حکومت ہندوستان کے پاس ساڑھے تین کروڑ مسلمان ہوں گے جو ایک معمولی اقلیت کی حیثیت سے سارے ملک میں بکھرے پڑے ہوں گے۔ یعنی سترہ[۱۷] فی صد یو پی میں، بارہ[۱۲] فی صد بہار میں، نو[۹] فی صد مدراس میں۔

آج ہندو اکثریت کے صوبوں میں ان کی جو حالت ہے پھر اس سے بھی زیادہ ابتر ہو جائے گی، یہ علاقے ایک ہزار سال سے ان کا وطن چلے آ رہے ہیں یہیں مسلم ثقافت اور تہذیب کے مراکز قائم ہیں۔ (۱۲)

پاکستان بن جانے کے بعد لیکن پاکستان بن جانے کے فوراً بعد ان پر بنگشت ہر گا کہ ان کی حیثیت ایک غیر ملکی کی ہے۔ صنعتی تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے پس ماندہ وہ ہندو راج کے رحم وکرم پر چھوڑ دیئے جائیں گے۔ (۱۳)

پاکستان مسلمانوں کے لیے بھی مضر ہے خود پاکستان میں بھی ان کی حالت کمزور رہوگی، ان کی اکثریت اتنی خفیف ہوگی کہ پاکستان کے غیر مسلموں کی تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی بیداری انھیں ناکارہ بنا دے گی لیکن اگر پاکستان غیر معمولی مسلم اکثریت پر مشتمل ہو تو بھی وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مدد نہ کر سکے گی۔ (۱۴)

ہندوؤں سے شکایت بحث کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستان خود مسلمانوں کے مفاد کے پیش نظر اتنی مضر چیز ہے تو اس طلسم میں مسلمانوں کی غیر معمولی تعداد کیوں گرفتار ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہندوؤں کے انتہا پسند فرقہ پرستوں کا طرز عمل اس کا موجب ہے۔ (۱۵)

وفاق کا فارمولا جو فارمولا میں نے کانگرس سے منظور کرایا ہے اس میں پاکستان کی اسکیم کی تمام خوبیاں رکھ لی گئی ہیں اور نقائص دور کر دیئے گئے ہیں، پاکستان کی بنیاد وہ خوف ہے جو مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہندو اکثریت والے مرکز کی مداخلت کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ کانگرس نے اس خوف کو صوبائی خود مختاری تسلیم کر کے دور کر دیا ہے، لہٰذا کانگرس کی اسکیم کی رو سے مسلم اکثریت کے صوبوں کو اس بات کی ضمانت مل جاتی ہے کہ وہ اندرونی طور پر آزاد ہوں گے۔ ساتھ ہی ساتھ مرکز کے ان فیصلوں پر بھی اثر انداز ہو سکیں گے جن کا تعلق سارے ہندوستان سے ہوگا۔ (۱۶)

فرقہ وارانہ تلخی عارضی ہے میں ان لوگوں میں ہوں جن کا خیال ہے کہ فرقہ وارانہ تلخی اور اختلافات کا یہ دور عارضی ہے۔ میں مضبوطی کے ساتھ اس یقین پر قائم ہوں کہ جب ہندوستان آزاد ہو گیا اور اپنی قسمت کی ذمہ داریوں کو خود انجام دینے لگا تو یہ تلخیاں دُور ہو جائیں گی، جب ہندوستان اپنی قسمت کا مالک ہو گا تو فرقہ وارانہ تنازعات اور شبہات کو یکسر فراموش کر دے گا۔ بلاشبہ اختلافات موجود رہیں گے لیکن یہ اقتصادی ہوں گے نہ کہ فرقہ وارانہ سیاسی مسائل ہوں گے، طبقات نہ کہ فرقے مستقبل کی صف آرائی کی بنیاد ہوں گے اور اسی بنیاد پر پالیسیوں کی تشکیل کی جاتی گی، اگر یہ کہا جائے کہ یہ صرف خوش خیالی ہے جو واقعات اور حقائق سے دُور ہے تو میں جواب دوں گا کہ ہر حالت میں نو کروڑ مسلمان ایک ایسا عنصر ہیں جسے دُنیا کی کوئی طاقت نظر انداز نہیں کر سکتی خواہ حالات کچھ بھی ہوں وہ اپنے مستقبل کی حفاظت خود کر سکتے ہیں (۱۷)

(ص: ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵)

کابینہ وفد پاکستان کا مخالف کابینہ وفد نے اپنے بیان میں بالفاظ واضح یہ کہہ دیا تھا کہ وہ تقسیم ہند اور ایک آزاد مسلم حکومت کے قیام کی سفارش نہیں کر سکتا۔ لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹیفرڈ کرپس نے بار بار کہا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلم لیگ نے جس پاکستان کا خاکہ پیش کیا ہے وہ ایک مستحکم حکومت کی صورت میں عمل پذیر ہو سکتا ہے؟ (۲۰)

وفاق ہی بہترین حل ہے لارڈ پیتھک لارنس نے ایک سے زائد بار یہ بات کہی کہ ہمارے اس فارمولے کو قبول کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ شروع میں مسلم اکثریت کے صوبے مرکزی حکومت کو صرف تین محکمے دیں گے، باقی ماندہ اختیارات اپنے پاس رکھ کر مکمل صوبائی آزادی سے بہرہ مند ہوں گے، ہندو اکثریت کے صوبے رضاکارانہ طور پر مرکزی حکومت کو اور بھی جتنے محکمے چاہیں دے سکتے ہیں۔ ایک صحیح قسم کے وفاق میں وفاقی واحدوں کو اس بات کی پوری آزادی ہونی چاہیے کہ وہ خود یہ فیصلہ کریں کہ کتنے اور کس نوعیت کے محکمے مرکزی حکومت

کے حوالے کیسے جائیں؟ (۱۹)

مسلم لیگ نے کابینہ پلان تسلیم کرلیا

مسلم لیگ کونسل کا جلسہ تین روز تک ہوتا رہا آخری روز مسٹر جناح کو اعتراف کرنا پڑا کہ کابینہ وفد کی اسکیم سے بہتر اقلیتوں کے مسائل کا کوئی اور حل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کونسل کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کابینہ وفد کی اسکیم نے وہ زیادہ سے زیادہ دے دیا ہے جو حاصل کیا جا سکتا تھا، انہوں نے مسلم لیگ کو مشورہ دیا کہ یہ اسکیم قبول کرے اور کونسل نے بالاتفاق اسے منظور کر لیا۔ (۲۰)

(ص : ۱۵۰)

جواہر لال کا شکوہ

(کابینہ پلان کے سلسلہ میں صوبوں کی گروہ بندی سے متعلق نئے صدر کانگرس کی حیثیت سے جواہر لال کا ہنگامہ خیز بیان ہنگامہ بیان۔ مولانا آزاد نے اس بیان کو تقسیم ہند کا پیش خیمہ قرار دیا۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں)

۱۹۳۷ء میں بھی جواہر لال کی تخیل پسندی سے اس طرح کی ایک بہت بڑی غلطی کا صدور ہوا تھا، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ماتحت ہونے انتخابات ہندوستان میں ہوتے ان میں یوپی اور بمبئی کے سوا ہر جگہ مسلم لیگ کو شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ بنگال کا گورنر ذہنی طور پر لیگ کی وزارت بنا ہی چکا تھا لیکن کرشک پرجا پارٹی نے اس کے اندازے سے غلط کر دیے۔ مسلم اکثریت کے دوسرے صوبوں پنجاب، سندھ اور سرحد میں بھی مسلم لیگ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، بمبئی میں مسلم لیگ نے کافی نشستیں لی تھیں، لیکن وہ یوپی ہی کا صوبہ تھا جہاں لیگ نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔

یوپی لیگ سے میرا سمجھوتہ

چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں یوپی لیگ کے قائد تھے، تشکیل حکومت کے سلسلہ میں جب میرا لکھنؤ جانا ہوا تو میں نے ان دونوں اصحاب سے گفتگو کی، انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ

وہ نہ صرف کانگرس سے تعاون کریں گے بلکہ کانگرسی پروگرام کی تائید بھی کریں گے۔ قدرتاً ان کی خواہش تھی کہ نئی حکومت میں مسلم لیگ کو حصہ ملنا چاہیے، پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ دونوں میں سے کوئی ایک شریک وزارت نہیں ہو سکتا تھا یا دونوں ہو سکتے، ورنہ کوئی نہ ہوتا، میں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ دونوں حکومت میں شریک کر لیے جائیں گے مجھ سے گفتگو کے بعد ایک تحریر مرتب ہوئی کہ مسلم لیگ پارٹی کانگرس سے تعاون کرے گی اور اس کے پروگرام پر عمل کرے گی، نواب اسماعیل خاں اور چوہدری خلیق الزماں نے اس دستاویز پر دستخط کر دیے، میں لکھنؤ سے پٹنہ چلا گیا جہاں وزارت سازی کے سلسلہ میں میری موجودگی ضروری تھی۔ (۲۱)

جواہر لال نے میرا فیصلہ بدل دیا

چند روز بعد میں الٰہ آباد واپس آیا اور یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ جواہر لال نے چوہدری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کو تحریر کیا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک ہی شریک وزارت کیا جا سکتا ہے، انہوں نے لکھا تھا کہ مسلم لیگ پارٹی دونوں میں سے جسے چاہے نامزد کر دے لیکن جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں دونوں میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہ تھا کہ تنہا شریک وزارت ہو جاتے چنانچہ انہوں نے جواہر لال کی پیشکش مسترد کر دی۔ (۲۲)

مسلم لیگ میں نئی زندگی

جواہر لال کے اس اقدام نے مسلم لیگ کو یوپی میں ایک نئی زندگی عطا کر دی۔ سیاسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ وہ یوپی ہی کا صوبہ ہے جہاں لیگ کا احیا ہوا، مسٹر جناح نے بھی اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور جارحانہ مہم شروع کر دی جو پاکستان پر ختم ہوئی۔ (۲۳)

ٹنڈن نے بھی جواہر لال کو متاثر کیا

میرا خیال ہے کہ پرشوتم داس ٹنڈن اس معاملہ میں پس پردہ کام کر رہے تھے، جواہر لال کے فیصلہ پر وہی اثر انداز ہوئے، ٹنڈن کے افکار و آراء میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے، میں نے جواہر لال کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر لیں، میں نے ان سے کہا کہ مسلم لیگ کو

شریکِ وزارت نہ کر کے انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے، میں نے انہیں متنبہ کیا کہ اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلم لیگ میں ایک نئی زندگی پیدا ہو جائے گی اور اس طرح آزادیٔ ہند کے راستہ میں نئی دشواریاں حائل ہو جائیں گی۔ جواہر لال نے میری بات نہیں مانی ان کا خیال تھا کہ ان کا فیصلہ صحیح ہے انہوں نے بحث کرتے ہوئے کہا کہ چھبیس[۲۶] نشستیں حاصل کرنے کے بعد مسلم لیگیوں کو وزارت میں ایک سے زیادہ نشست نہیں مل سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یوپی میں کوئی مفاہمت نہ ہو سکی۔ مسٹر جناح نے ساری لیگ کو کانگرس کے خلاف کھڑا کر دیا۔ (۲۴) (ص: ۱۶۱، ۱۶۲)

قائدِاعظم کی فہرست پر اعتراض

(اکتوبر ۱۹۴۶ء، وائسرائے کی یقین دہانی پر مسلم لیگ عارضی حکومت میں شریک ہو چکی ہے)

چند الفاظ میں ان لوگوں کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں جنہیں مسٹر جناح نے نامزد کر کے ایگزیکٹو کونسل میں بھیجا تھا۔

لیاقت علی خاں کے علاوہ مسلم لیگ کے سب سے زیادہ اہم اور تجربہ کار لیڈر بنگال کے خواجہ ناظم الدین اور یوپی کے نواب اسماعیل خاں تھے۔ یہ بات طے شدہ سمجھی جاتی تھی کہ اگر لیگ نے کبھی وزارت قبول کی تو یہ تینوں اس میں ضرور شریک ہوں گے۔ شملہ کانفرنس کے دوران میں یہی تین نام تھے جو بار بار زبان پر آتے تھے لیکن اب کے لیگ نے ایگزیکٹو کونسل میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر جناح نے عجیب و غریب رویہ اختیار کیا۔ خواجہ ناظم الدین اور نواب اسماعیل خاں نے لیگ اور کانگرس کے مناقشہ میں کبھی بھی انتہا پسندانہ رویہ اختیار نہیں کیا، مسٹر جناح اس بات پر برہم تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ ان کے ہاں میں ہاں نہیں ملائیں گے، چنانچہ ان کے نام انہوں نے فہرست سے خارج کر دیے۔ لیگ کونسل میں ہنگامہ آرائی شروع ہو جاتی اگر مسٹر جناح کا انتخاب پہلے سے معلوم ہو گیا ہوتا لہذا انہوں نے کونسل کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک تجویز منظور کر کے نامزدگی کا اختیار انہیں دے دے۔

مسٹر جناح نے جب اپنی فہرست لارڈ ویول کو دی تو اس میں لیاقت علی خاں،

آئی آئی چندریگر، عبدالرب نشتر، غضنفر علی اور جگندر ناتھ منڈل کے نام تھے۔

ناظم الدین اور اسماعیل خاں کا ذکر

میں چند الفاظ منڈل کے بارے میں الگ سے کہوں گا۔ لیگ کے باقی تینوں نامزد ممبر قطعاً غیر معروف تھے۔ ان لوگوں کے بارے میں خود لیگ کے ممبروں کو بہت کم واقفیت تھی یہ صحیح ہے کہ لیگ نے سیاسی جدوجہد میں کوئی حصہ نہیں لیا اس لیے اس کی صف میں چند ہی لیڈر ایسے تھے جو قوم میں کچھ اہمیت رکھتے تھے لیکن بہرحال اس کے ممبروں میں خواجہ ناظم الدین اور نواب اسماعیل کے سے آزمودہ کار موجود تھے لیکن مسٹر جناح نے اپنے تینوں جی حضوریوں کے مقابلہ میں انہیں نظر انداز کر دیا۔ (۲۵)

ناظم الدین اور اسماعیل خاں کی مایوسی

۲۵، اکتوبر کو عارضی حکومت کے مسلم لیگی ممبروں کا نام مشتہر ہوا۔ خواجہ ناظم الدین اور نواب اسماعیل خاں دوسرے مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ امپیریل ہوٹل میں اعلان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے انہیں اپنی شرکت کا یقین تھا، اسی طرح ان کے حامی بھی یہی یقین رکھتے تھے، چنانچہ مسلم لیگی ممبروں کی ایک بڑی تعداد ہار اور طرے لیے ہوئے موجود تھی۔ جب ناموں کا اعلان ہوا اور فہرست میں ان میں سے کسی کا نام بھی نہیں پایا گیا تو ان کی مایوسی اور برہمی کا انداز ہر شخص کر سکتا ہے مسٹر جناح نے ان کی اُمیدوں پر یخ بستہ پانی انڈیل دیا تھا۔ (۲۶)

جگندر ناتھ منڈل

مسلم لیگ نے سب سے زیادہ مضحکہ خیز حرکت یہ کی کہ اپنی فہرست میں جگندر ناتھ منڈل کا نام بھی شامل کر لیا۔ مسٹر جناح نے پوری کوشش کی کہ کانگرس صرف ہندوؤں کو نامزد کرے، لیکن ان کی کوششوں کے باوجود کانگرس نے ہندو، مسلم، سکھ، پارسی، اچھوت اور عیسائی ممبر ایگزیکٹو کونسل کے لیے نامزد کیے مسٹر جناح نے محسوس کیا کہ انہیں بھی یہ نمائش کرنی چاہیے کہ لیگ دوسرے فرقوں کی نمائندگی بھی کرتی ہے چنانچہ اپنے نامزدگان میں انہوں نے ایک غیر مسلم کو بھی شریک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نگاہِ انتخاب جگندر ناتھ منڈل پر پڑی۔ مسٹر جناح نے یہ غور نہیں کیا کہ ان کا یہ اقدام ان کے پچھلے دعوے سے کتنا مختلف ہے؟ وہ یہی تو کہا

کرتے تھے کہ کانگریس ہندو ممبر نامزد کرے اور مسلم لیگ مسلمان ممبر، مسٹر جنادرناتھ کا انتخاب دلچسپ بھی تھا اور اشتعال انگیز بھی۔ مسٹر سہروردی نے بنگال میں جب مسلم لیگی وزارت قائم کی تو اس کے واحد غیر مسلم ممبر بھی مسٹر جگندر ناتھ منڈل تھے، وہ بنگال سے باہر بالکل غیر معروف تھے اور ہندوستان گیر سیاست میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی، چونکہ وہ مسلم لیگ کے نامزد شدہ ممبر تھے لہٰذا انہیں کوئی پورٹ فولیو بھی ملنا چاہیے تھا چنانچہ وہ لاء ممبر مقرر کیے گئے، گورنمنٹ آف انڈیا کے اکثر سیکرٹری انگریز تھے، مسٹر منڈل کا سیکرٹری بھی انگریز تھا جو روزانہ یہ شکایت کیا کرتا تھا کہ مسٹر منڈل جیسے وزیر کے ساتھ کام کرنا سخت مشکل ہے۔ (۲۷)

رفیع احمد قدوائی کا لطیفہ

اب کہ مسلم لیگ حکومت میں شریک ہونے کے لیے تیار ہو گئی تھی کانگریس کو وزارت کی از سر نو تشکیل کرنا تھی تاکہ مسلم لیگ کے نمائندے بھی کھپ سکیں۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کن لوگوں کو وزارت سے الگ کیا جائے۔ ہم نے یہ محسوس کیا کہ مسٹر سرت چندر بوس، سر شفاعت احمد خان اور سید علی ظہیر استعفیٰ دے کر مسلم لیگی ممبروں کے لیے جگہ خالی کر دیں۔ پورٹ فولیو کے بارے میں لارڈ ویول نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک اہم پورٹ فولیو مسلم لیگ کے حق میں دستبردار ہو جانا چاہیے لیکن سردار پٹیل جو وزیر داخلہ تھے اس تجویز پر رضامند نہ ہوئے، میں لارڈ ویول کی تجویز کے حق میں تھا لیکن سردار پٹیل اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے، انہوں نے کہا کہ اگر ہم نے دوسرے متبادل پہلو پر غور کیا۔ رفیع احمد قدوائی نے تجویز پیش کی کہ وزارت مالیات مسلم لیگ کو سونپ دینی چاہیے، کوئی شبہ نہیں یہ بہت اہم محکمہ ہے لیکن اتنا ہی ٹیکنیکل بھی، اور لیگ کے پاس ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جو اسے چلا سکے۔ قدوائی کا خیال تھا کہ چونکہ یہ محکمہ ٹیکنیکل نوعیت کا ہے لیگ اس پیش کش کو مسترد کر دے گی اگر ایسا ہوا تو کانگریس کا کیا جائے گا اور اگر لیگی ممبر نے یہ محکمہ قبول کر لیا تو وہ بہت جلد اپنے آپ کو گرداب حماقت میں مبتلا پائے گا، رفیع احمد کا خیال تھا دونوں صورتیں کانگریس کے لیے مفید ہیں۔ (۲۸)

مسٹر پٹیل بہت خوش ہوئے

مسٹر پٹیل تو یہ تجویز سن کر اچھل پڑے اس کی انہوں نے بڑی پُر زور تائید کی میں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مالیات کا محکمہ حکومت کی کنجی ہے یہ اگر مسلم لیگ کے پاس چلا گیا تو ہمیں غیر معمولی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مسٹر پٹیل نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ لیگ اس محکمہ کو نہیں سنبھال پائے گی، وہ ہماری پیش کش مسترد کرنے پر مجبور ہے بہر حال یہ فیصلہ مجھے کچھ پسند نہ آیا لیکن چونکہ دوسرے تمام لوگ متفق تھے میں خاموش ہو رہا۔ وائسرائے نے اطلاع بھیج دی کہ کانگریس مسلم لیگ کے کسی نامزد ممبر کو محکمہ مالیات کی پیش کش کرتی ہے۔

چودھری محمد علی کا ذکر

جب لارڈ ویول نے یہ اطلاع مسٹر جناح کو بھیجی تو انہوں نے کہا وہ اپنا جواب کل بھیجیں گے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ پہلے پہل مسٹر جناح اس پیش کش کے بارے میں متردد تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے سینئر نمائندے کی حیثیت سے لیاقت علی کو کابینہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن انہیں شبہ تھا کہ لیاقت علی خاں اس محکمہ کو خوبی کے ساتھ سنبھال سکیں گے، چودھری محمد علی جو فنانس ڈیپارٹمنٹ میں ایک ممتاز منصب پر فائز تھے، یہ خبر سن کر مسٹر جناح کے پاس پہنچے انہوں نے مسٹر جناح سے کہا کہ کانگریس کی یہ پیش کش ایک نعمت غیر مترقبہ ہے اور لیگ کی بہت بڑی فتح۔ انہیں یہ ہرگز توقع نہیں تھی کہ کانگریس محکمہ مالیات مسلم لیگ کے حوالہ کر دے گی، اس محکمہ پر قبضہ کرنے کے بعد لیگ گورنمنٹ کے ہر محکمہ پر تسلط حاصل کر لے گی، وہ مسٹر لیاقت علی خاں کی ہر طرح مدد کریں گے انہوں نے یقین دلایا کہ ان کی مدد سے لیاقت علی خاں بڑی خوبی سے اپنے فرائض انجام دے سکیں گے۔ مسٹر جناح نے یہ پیش کش منظور کر لی اور لیاقت علی خاں وزیر مالیات ہو گئے۔ بہت جلد کانگریس نے محسوس کر لیا کہ محکمہ مالیات مسلم لیگ کی تحویل میں دے کر اس سے بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔

(ص: ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴)

مسٹر اٹیلی کی ہندوستان سے دلچسپی

مسٹر اٹیلی ہندوستان کی سیاسی رفتار سے ذاتی طور پر دلچسپی لے رہے تھے۔ ۲۶ نومبر

سنہ ۴۶ء کو انھوں نے ایک مرتبہ پھر تعطل دُور کرنے کے لیے لارڈ ویول اور نمائندگان لیگ و کانگرس کو لندن آنے کی دعوت دی۔ جواہر لال نے لارڈ ویول سے کہا "لندن جا کر بحث مباحثہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، معاملات کو از سرِ نو زیرِ بحث لانا اتنا مفید نہیں ہو گا جتنا مُضر!" (ص ۱۴۱)

لارڈ ویول کی نصیحت

لارڈ ویول نے جواہر لال سے اتفاق نہیں کیا اور مجھ سے اس مسئلہ پر زیادہ تفصیل سے گفتگو کرتے ہوتے انھوں نے کہا کہ اگر مسلم لیگ کا موجودہ رویّہ جاری رہتا ہے تو اس سے نہ صرف نظمِ حکومت پر برا اثر پڑے گا بلکہ ہندوستانی مسائل کا پُر امن حل بھی دشوار تر ہوتا چلا جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ لندن کی گفت و شنید رہنمایانِ ہند کو معروضی طور پر زیادہ ٹھنڈے دل سے حالات پر غور کرنے کا موقع دے گی وہ مقامی دباؤ، اور اپنے متبعین کے مسلسل دباؤ سے آزاد ہوں گے، لارڈ ویول نے یہ بھی کہا کہ مسٹر اٹیلی ہندوستانی کے دوست ہیں اور اس گفتگو میں ان کی یہ شرکت یقیناً مفید نتائج پیدا کرے گی۔

اٹیلی بھی ناکام ہوتے

میں نے لارڈ ویول کی گفتگو میں وزن محسوس کیا اور اپنے رفقا کو راغب کیا کہ وہ اپنی رائے تبدیل کر لیں، آخر یہ طے پایا کہ جواہر لال کانگرس کی، مسٹر جناح اور لیاقت علی خاں مسلم لیگ کی اور بلدیو سنگھ سکھوں کی ترجمانی کریں، ۳ دسمبر سے ۶ دسمبر تک گفت گو جاری رہی مگر بے نتیجہ!

(ص: ۱۴۳، ۱۴۴)

لیگی وزراء دردِ سر بن گئے

کانگرس اور لیگ کے اختلافات کے باعث مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، مسلم لیگی ممبر شریکِ حکومت تھے لیکن حکومت کے خلاف بھی تھے، درحقیقت ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہماری ہر تجویز کو تباہ کر کے رکھ دیں، وزیرِ مالیات کے غیر معمولی اختیارات کچھ کم دردِ سر کا باعث نہ تھے لیکن ابھی ایک اور جھٹکا ہمارا انتظار کر رہا تھا جو لیاقت علی کے پیش کردہ میزانیہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ (ص: ۱۴۵)

تقسیم کے حالاتِ مابعد پر تبصرہ

اب ایسی صورتِ حالات پیدا ہو گئی تھی جو المیہ اور طربیہ کو ساتھ ساتھ لیے چل رہی تھی تقسیم کے

بعد سب سے زیادہ مضحکہ خیز پوزیشن مسلم لیگی لیڈروں کی تھی جو ہندوستان میں رہ گئے تھے، مسٹر جناح کراچی تشریف لے گئے اور اپنے متبعین کے لیے یہ پیغام چھوڑ گئے کہ چونکہ ملک اب تقسیم ہو چکا ہے، انہیں ہندوستان کا وفادار شہری بن کر رہنا چاہیے۔ اس الوداعی پیغام نے ان بیچاروں کو ضعف و سرگشتگی کے عالم میں چھوڑ دیا۔ ۱۴ اگست کے بعد ان میں سے کئی حضرات میرے پاس آئے، ان میں سے ہر ایک نے گہرے قلق اور غضب کے عالم میں کہا کہ مسٹر جناح نے انہیں دھوکا دیا۔ (۲۲۲)

غلط فہمی کس کی تھی؟ پہلی مرتبہ تو میں یہ سمجھ نہ سکا کہ مسٹر جناح کی فریب کاری سے ان کا مطلب کیا ہے؟ مسٹر جناح نے تقسیم ملک کا مطالبہ علانیہ طور پر مسلم اکثریت کے صوبوں کے لیے کیا تھا؟ پاکستان اب ایک حقیقت تھا اور مغربی اور مشرقی علاقوں کی مسلم اکثریت کا مجموعہ، پاکستان بن چکا تھا پھر مسلم لیگ کے یہ ترجمان کیوں کہہ رہے ہیں کہ انہیں دھوکا دیا گیا؟ یہ اتنی واضح بات ہے کہ ان کی غم انگیز حالت دیکھ کر مشکل ہی سے ان پر ترس آ سکتا تھا، میں نے انہیں یاد دلایا کہ کابینہ وفد کے زمانہ میں ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو بیان دیتے ہوئے میں نے مسلمانانِ ہند کو خبردار کر دیا تھا کہ اگر تقسیم نے کبھی حقیقت کی صورت اختیار کی تو وہ محسوس کریں گے کہ مسلم اکثریت پاکستان بن گئی لیکن وہ ہندوستان میں رہنے پر مجبور ہوں گے، ایک چھوٹی اور حقیر اقلیت کی حیثیت سے! (ص ۲۰۸، ۲۰۹)

اب مولانا کے ارشادات پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔

۱۔ بعد میں خود واقعات نے ثابت کر دیا کہ قائداعظم کا موقف کتنا درست اور مولانا کا نقطۂ نظر کتنا غلط تھا!

۲۔ قائداعظم کا خود گفت و شنید کے لیے پیش قدمی کرنا، ان کے مخلص ہونے کی دلیل ہے، جس در سے انہیں ناکامی کے سوا کبھی کچھ نہ ملا تھا، اب بھی امید کا دامن پکڑے وہ دستک دے رہے تھے نتیجہ اب بھی وہی نکلا جو پہلے نکلا کرتا تھا لیکن قائداعظم نے پیشقدمی کر کے ثابت کر دیا کہ وہ ہندو مسلم مفاہمت کے لیے اپنا وقار اور رکھ رکھاؤ بھی قربان کر سکتے تھے۔

۳۔ مسلم لیگ کے جو تین دور مولانا نے قائم کیے انہیں اگر مبنی بر واقعہ بھی مان لیا جائے تو کیا وہ عملی سیاست میں غلط تھے؟

کیا مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں کے اندر اپنے حقوق اور مفادات کی حفاظت کی جدوجہد نہیں کرنی چاہیے تھی؟ کانگرس میں اور ہندو اکثریت میں اگر عقل ہوتی تو مسلمانوں کے اس جائز مطالبہ کو خود ہی تسلیم کر لینا چاہیے تھا کیا پھر بھی انگریز مسلم لیگ کو "جواب ا[illegible] غزل" کے طور پر استعمال کر سکتے تھے؟

مولانا سے زیادہ اس حقیقت کا شناسا کون ہو سکتا ہے کہ اس پہلے دور کا جہاں تک تعلق ہے قائداعظم کا اس سے کوئی تعلق نہیں، اس زمانہ میں وہ بڑے پکے کانگر[illegible] اور نیشنلسٹ تھے، مسلم لیگ میں شرکت کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔

۴۔ اس دوسرے دور کا تعلق بھی کم از کم قائداعظم سے ذرا بھی نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اقلیتوں کو مطمئن کیے بغیر اکثریت کے لیے آگے قدم بڑھانا جائز تھا تو اس قدم کو روکنے کے لیے اقلیتوں کا میدان میں آنا کیوں ناجائز ہو گیا۔

۵۔ افسوس ہے مولانا نے یہاں بھی ارادۃً یا سہواً میرے خیال میں سہواً، غلط فرمایا ہے اگست سنہ ۱۹۴۰ء کی پیش کش لارڈ لن لتھگو نے کی تھی، قائداعظم نے گاندھی جی سے اور وائسرائے سے صاف اور واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر مسلمانوں کی انفرادیت او[illegible] حق خود ارادیت کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ ساتھ دینے کو ہر طرح سے تیار ہیں۔ کانگرس تسلیم کرے تو اس کا برطانوی حکومت تسلیم کرے تو اس کا دونوں نے تسلیم نہیں کیا۔ قائداعظم اور مسلم لیگ نے کسی کا ساتھ نہیں دیا بلکہ مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے انگریز ہوم ممبر سے صاف کہہ دیا۔

"تم مجھے نازیوں کی سفاکی اور درندگی سے کیا ڈراتے ہو، اگر نازی غالب آتے تو ہمارے صرف آقا بدل لیں گے، تم غلام ہو جاؤ گے!"

کیا یہ بات اتنی صفائی سے کوئی اور بھی کہہ سکا تھا؟

۶۔ "خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد!" ——— قائداعظم کے جس دوربینی [illegible] مولانا آزاد وغیرہ مصالحانہ قرار دے رہے ہیں، دنیا کے ہر اصول سیاست کے اعتبا[illegible]

سے وہی بہترین طرزِ عمل تھا۔

کانگرس نے یہ حماقت کی اپنی فہرست وائسرائے کے سامنے پیش کردی۔ قائدِاعظم نے نہیں کی، کانگرس نے اپنے پتے میز پر رکھ دیے اور ناکام ہوگئی، قائدِاعظم نے اصول منوائے بغیر نہ فہرست پیش کی نہ پتے میز پر رکھے، اقبال نے ایک زمانہ میں بڑے درد سے کہا۔

ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ!

وہ قائدِاعظم ہی تھے جنہوں نے ملتِ اسلامیہ کی کلاہِ لالہ رنگ کا کھویا ہوا وقار پھر سے حاصل کیا، محض اپنی فہم و فراست اور تدبر سے۔

۶۔ بظاہر مولانا آزاد کا یہ دعویٰ بالکل صحیح تھا، لیکن درحقیقت غلط تھا۔ صوبوں میں جو مجالس آئین ساز کام کر رہی تھیں، ان کے ممبر مسلم لیگ کے دورِ اقتدار سے پہلے منتخب ہوتے تھے لہٰذا بے شک یہ مسلم لیگ کے مخالف بھی تھے اور اس کے دائرہ اقتدار سے باہر بھی، لیکن مسلم لیگ جب صحیح معنے میں عوامی جماعت بن گئی حالت یہ تھی کہ کانگرس پارلیمنٹری بورڈ کی طرف سے روپیہ پانی کی طرح بہانے کے باوجود سارے ہندوستان کے جملہ ضمنی انتخابات میں ایک کے سوا تمام مسلم لیگی اُمیدوار کامیاب ہوئے تھے مولانا آزاد کے بظاہر صحیح دعوے کا بھرم ان حقائق کی روشنی میں کھل جاتا ہے۔

پھر مولانا آزاد کے اس ارشاد کے کچھ دنوں بعد جب نئے انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ کی عدیم النظیر کامیابی نے مولانا آزاد کے سوا دُنیا کی آنکھیں کھول دیں، حتیٰ کہ اسی بنیاد پر پاکستان بن گیا۔

۷۔ مولانا نے نئے انتخاب کے سلسلہ میں جو اعداد و شمار دیے ہیں وہ تمامتر مغالطہ آمیز غلط اور گمراہ کن ہیں۔ مولانا کو حق تھا کہ وحدتِ ہند کی حمایت اور تقسیمِ ہند کی مخالفت کرتے رہتے۔ گاندھی کی شان میں قصیدے پڑھتے رہتے اور قائدِاعظم کی ہجو کرتے لیکن انہیں یہ حق ہرگز نہیں تھا کہ واقعات کو مسخ کر کے پیش کرتے ایسا کر کے انہوں نے بڑی افسوسناک مثال پیش کی ہے۔

سب سے پہلے میں مرکزی اسمبلی کا نتیجہ انتخاب پیش کرتا ہوں خدا اس بدگمانی پر مجھے معاف فرمائے شاید مولانا نے عمداً اس کا ذکر نہیں کیا۔

مرکزی اسمبلی کے انتخابات کا نقشہ یہ ہے ،

نام صوبہ	تعداد نشست	نام اُمیدوار مع تعدادِ ووٹ
یو پی	۶	۱۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں ۶۳۰۰۰ ووٹ ملے (مخالف) کی ضمانت ضبط ہو گئی ۲۔ راجہ امیر احمد خاں آف محمود آباد، ۳۱۵۴ ووٹ ملے۔ مخالف کی ضمانت ضبط۔ ۳۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں ۵۴۲۳۰ ووٹ ملے) ۴۔ ڈاکٹر ضیاء الدین، ۳۲۸۰۰ ووٹ ملے۔ مخالف کی ضمانت ضبط۔ ۵۔ خان بہادر غضنفر علی خاں، ۲۴۱۰۰ ووٹ ملے۔ ۶۔ سر یامین خاں، ۱۷۹۶۰ ووٹ ملے، مخالف کی ضمانت ضبط سب مسلم لیگی اُمیدوار کامیاب
پنجاب	۶	۱۔ میر غلام بھیک نیرنگ، بلا مقابلہ کامیاب ۲۔ نواب سر مہر شاہ ، " " " ۳۔ حاجی شیر شاہ " " " ۴۔ کیپٹن عابد حسین ، ۲۳۲۵۰ ووٹ ملے ، مخالف کی ضمانت ضبط ۵۔ مولانا ظفر علی خاں ، ۴۰۹۶۰ ووٹ ملے ، مخالف کی ضمانت ضبط ، ۶۔ حافظ محمد عبد اللہ ۲۱۴۹ ووٹ ملے ۔ کوئی مسلم لیگی اُمیدوار ناکام نہیں ہوا۔

نام صوبہ	تعداد نشست	نام امیدوار مع تعداد ووٹ
بنگال	۶	۱۔ عبدالرحمٰن صدیقی ۴۵۸۰ ووٹ ملے۔ مخالف کی ضمانت ضبط ۲۔ سر حسین سہروردی، ۲۰۳۶۹ ووٹ ملے، مخالف کی ضمانت ضبط ۳۔ شیخ رفیع الدین صدیقی، ۱۹۰۲۷ ووٹ ملے مخالف کی ضمانت ضبط ۴۔ مسٹر تمیز الدین، ۱۲۰۲۴ ووٹ ملے، مخالف سر عبدالحلیم غزنوی کی ضمانت ضبط جن کے لیے سرت چندر بوس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، ۵۔ عبدالحمید خاں ۲۳۲۶۴ ووٹ ملے مخالف کی ضمانت ضبط
بمبئی اور سندھ	۴	۱۔ محمد موسیٰ قلعدار، بلا مقابلہ کامیاب ۲۔ قائداعظم، ۳۶۰۰ ووٹ ملے، مخالف مسٹر حسین بھائی دل جی کی ضمانت جنہوں نے شیعہ سنی اور خوجہ مسلم، سوال پیدا کر کے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ۳۔ احمد ای، ایچ جعفر، ۱۹۰۱ ووٹ ملے مخالف کی ضمانت ضبط ۴۔ یوسف ہارون (سندھ) ۱۷۱۶۵ ووٹ ملے، مخالف کی ضمانت ضبط سب نشستیں مسلم لیگ کے قبضہ میں۔

نام صوبہ	تعداد نشست	نام اُمیدوار مع تعدادِ ووٹ
مدراس	۳	۱۔ ایم ۔ جے جمیل محی الدین، بلامقابلہ کامیاب ۲۔ حاجی عبدالستار اسحاق سیٹھ ۹۳۰۰ ووٹ ملے، مخالف کی ضمانت ضبط
بہار اڑیسہ	۳	۱۔ محمد زمان ، بلامقابلہ کامیاب ۲۔ چودھری عابد حسین، بلامقابلہ کامیاب ۳۔ حبیب الرحمٰن، ۲۳۵۰ ووٹ ملے مخالف کی ضمانت ضبط
سی پی و برار	۱	۱۔ نواب صدیق علی خاں، بلامقابلہ کامیاب
آسام	۱	۱۔ اصغر علی خاں، ۴۹۶۷ ووٹ ملے، مخالف کی ضمانت ضبط ہوگئی ۔

اب ذیل میں وہ نقشہ پیش کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ہر بڑی سیاسی جماعت نے کس صوبہ سے مرکزی اسمبلی کے لیے کتنے نمائندے نامزد کیے اور کامیابی کا تناسب کیا رہا۔

۱	بنگال	یوپی	بمبئی و سندھ	مدراس	پنجاب	بہار و اڑیسہ	سی پی برار	آسام	دہلی	سرحد	اجمیر	میزان
کانگریس	۷	۸	۹	۱۲	۵	۸	۵	۴	۱	۱	۱	۶۱
کامیاب	۳	۸	۹	۱۲	۵	۸	۵	۲	۱	۱	۱	۵۵
مسلم لیگ	۶	۶	۴	۳	۶	۳	۱	۱	X	X	X	۳۰
کامیاب	۴	۶	۴	۳	۶	۳	۱	۱	X	X	X	۳۰

۱	بنگال	یوپی	بمبئی و سندھ	مدراس	پنجاب	بہار اڑیسہ	سی پی برار	آسام	دہلی	سرحد	اجمیر	میزان
مہاسبھا	۵	۳	۲	۲	۲	۱	۳	۲	۱	×	×	۱۸
کامیاب	صفر	صفر	صفر	صفر	صفر	صفر	صفر	صفر	صفر	×	×	صفر
سکھ اکالی	×	×	×	×	۲	×	×	×	×	×	×	۲
کامیاب	×	×	×	×	۲	×	×	×	×	×	×	۲

اس نقشہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ:
۱۔ مسلم لیگ کا کوئی اُمیدوار ناکام نہیں ہوا۔
۲۔ مہاسبھا کا کوئی اُمیدوار کامیاب نہیں ہوا۔
۳۔ کانگرس کے بہت سے اُمیدوار کامیاب ہوئے کچھ ناکام۔

مسلم لیگ کی اس عدیم النظیر کامیابی پر بیان دیتے ہوئے ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء کو قائدِ اعظم نے فرمایا:

"دُنیا کے کسی ملک یا کسی قوم کی تاریخ میں ایسی سو فی صد کامیابی کی مثال نہیں ملتی، مسلمان قوم نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے وہ ان تمام نتائج اور مشکلات کا مقابلہ کرے گی اور ہر وہ قربانی دے گی جس کے حالات متقاضی ہوں۔ ہمارا مطلب وہی ہے جو ہماری زبان سے نکلتا ہے۔"

اسی تاریخ کو مسلمانانِ ہند نے یوم فتح منایا، دہلی کے پچاس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا۔

"مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ کی سو فی صد کامیابی کی مثال کسی ملک اور قوم میں نہیں ملتی، ہٹلر اور مسولینی جیسے ڈکٹیٹر بھی ایسی شاندار فتح حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں، جیسی ہمیں نصیب ہوتی ہے، جو لوگ ہم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ مسلم لیگ خان بہادروں کی جماعت ہے انہیں آنکھ کھول کر اس مجمع کو دیکھنا چاہیے، اس مجمع میں کتنے

خاں بہادر ہیں۔ !''

مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ کی صدفی صد کامیابی نے کانگرس کی آنکھیں کھول دیں، صوبائی مجالس آئین ساز کے الیکشن میں حصہ لینے کے لیے اپنے تمام وسائل و ذرائع بروئے کار لاکر ــــ اگرچہ مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں بھی کوئی دقیقہ اس نے فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ میدان میں اتر آئی۔

احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے (۱۴ جنوری ۱۹۴۶ء) سردار پٹیل نے فرمایا:

''مرکزی اسمبلی کے لیے حق رائے دہندگی محدود تھا لیکن صوبائی انتخابات وسیع حق رائے دہندگی کی بنیاد پر لڑے جائیں گے، کانگرس فیصلہ کر چکی ہے کہ وہ ہر غیر مسلم نشست کا مقابلہ کرے گی اور زیادہ سے زیادہ مسلم نشستوں کے لیے بھی اپنے نمائندے کھڑے کرے گی!''

۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو لکھنؤ کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا:-

''ہم انتخابات کی پوری تیاری کریں گے، جو کوئی ہماری مخالفت کرے گا اسے کچل دیں گے، ہم اپنے بنیادی اصولوں کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے، ہم لڑنا جانتے ہیں، ہم نے حکومت برطانیہ سے بھی لڑائی کی ہے!''

شملہ کانفرنس کے ناکام ہونے اور نئے انتخابات کا اعلان ہونے کے بعد بمبئی میں ۲۲ ستمبر ۱۹۴۵ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ اس میں پنجاب کے ایک رکن کانگرس نیکی رام شرما نے سوقیانہ انداز میں لیگ پر حملے کرنے کے بعد کہا۔

''چاروں اکثریتی صوبوں میں لیگ چاروں شانے چت کرے گی مسلمان بھوکے ہیں وہ اسی کو ووٹ دیں گے جو انہیں روٹی دے گا!''

صوبائی مجالس آئین ساز کے انتخابات سے کچھ پہلے پہلے مولانا آزاد نے بڑے پرامید لہجہ میں فرمایا تھا:

''صوبائی مجالس آئین ساز کے انتخاب میں ہر مسلم نشست کا ہم مقابلہ کریں گے اور غیر معمولی کامیابی حاصل کریں گے!''

اس کے بعد مولانا نے مجلسِ احرار اور دوسری مخالف مسلم لیگ جماعتوں سے اپیل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

"وہ منظم ہو کر ایک وجود بن جائیں اور ڈٹ کر مسلم لیگ کا مقابلہ کریں۔" (احرار)

اور بلاشبہ مولانا کی اپیل کارگر ہوئی اور خاکسار، جمعیتہ علماء اور دیگر جماعتوں نے مسلم لیگ کے خلاف ایک محاذ بنا لیا، انہوں نے مسلم لیگ کے راستے میں کانٹے بچھائے پتھر پھینکے، چاقو اور خنجر سے وار کیے، جلسے درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔

کانگرس نے اور کانگرس کے ان حلیفوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ مجلس احرار کے واعظانِ آتش مقال اور علماءِ شیوا بیان دورے پر نکل پڑے، مجھے بمبئی کا وہ جلسہ یاد ہے جس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور شورش کاشمیری کی خطابت نے رنگ باندھ دیا تھا۔ لیکن بُری طرح پٹے، دیوبند کے طلبہ کی ایک جماعت مولانا حسین احمد مدنی مغفور کی سربراہی میں شہر شہر اور قریہ قریہ کا گشت کر رہی تھی جہاں موقع ملتا، مولانا آزاد بھی پرواز پیدا کر کے یعنی طیارہ پر اُڑ کر پہنچ جاتے، غرض تفریق بین المسلمین اور تضعیف شوکت مومنین میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔

احرار و خاکسار میدانِ انتخاب میں زورِ زبان اور قوتِ استدلال سے زیادہ دست و بازو کی طاقت کے بل پر اُترے، ہنگامہ آرائی کی، شورش اور بدامنی کے مظاہرے کیے، ان کا کوئی "عظیم الشان جلسہ" ایسا نہیں ہوا جس میں مسلم لیگ کو اور قائداعظم کو ایک ایک منہ میں سو سو گالیاں نہ دی گئی ہوں۔ قائداعظم کی ذات پر گفتنی اور ناگفتنی الزامات نہ لگاتے ہوں۔ مسلم لیگ کی قیادت کے خلاف کفر و فسق کے فتوے نہ دیے گئے ہوں مولانا مظہر علی اظہر نے زندگی میں شاید پہلی مرتبہ ایک شعر کہا جو کافی مشہور ہوا۔

اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا
یہ قائداعظم ہے کہ کافرِ اعظم!

کافرہ سے مراد قائداعظم کی مرحوم بیوی تھی جو گو ایک پارسی کروڑ پتی کی لڑکی تھی لیکن شریف دیوجی کانجی کے سامنے ایک شیعہ مجتہد کے ہاتھ پر باقاعدہ مشرف بہ اسلام

ہو چکی تھیں اور بمبئی کے مسلم قبرستان میں ابدی نیند سو رہی تھیں اور ان کے قبولِ اسلام کی خبر کوئی راز نہ تھی۔ اس وقت بمبئی کے اخبارات کے علاوہ لاہور کے سول اینڈ ملٹری گزٹ تک میں شائع ہو چکی تھی۔ لیکن اظہر صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب کو اصرار تھا کہ وہ کافرہ تھی اور خود کانگرس کے اندر جن زعماء نے سول میرج کر کے غیر مسلم بیویوں کو زینتِ پہلو بنا رکھا تھا لیکن ڈاکٹر خاں صاحب، مسٹر آصف علی، مسٹر ہمایوں کبیر وغیرہ ان کے خلاف یہ زعمائے کرام اور علمائے دین بالکل خاموش تھے بلکہ الیکشن میں انہیں کامیاب بنانے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔

غرض یہ تھا وہ ماحول جس میں صوبائی مجالس آئین ساز کا انتخاب ہوا۔ ان حالات میں ہونا تو وہی چاہیے تھا جو مولانا آزاد نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے:

لیکن واقعتہً ایسا نہیں تھا۔

سب سے پہلے صوبائی مجالس آئین ساز میں مختلف اقوامِ ہند کے تناسب کا نقشہ پیش کرتا ہوں جس سے ہر قوم کی قوت اور تعداد کا صحیح اندازہ ہو جائے گا اور پھر مولانا کی پیش کردہ ریاضی پر گفتگو کروں گا۔

نام صوبہ	کل نشستیں	غیر مسلم	مسلم	متفرق غیر مسلم یا مشترک حلقے
بنگال	۲۵۰	۷۸	۱۱۹	۵۳
آسام	۱۰۸	۲۷	۳۴	۴۷
سرحد	۵۰	۹	۳۶	۵
سندھ	۶۰	۱۸	۳۴	۸
مدراس	۲۱۵	۱۴۶	۲۹	۴۰
بمبئی	۱۷۵	۱۱۴	۳۰	۴
یوپی	۲۲۸	۱۴۰	۶۶	۲۲
بہار	۱۵۲	۸۶	۴۰	۲۶
سی پی	۱۱۲	۸۴	۱۴	۱۴
اڑیسہ	۶۰	۴۴	۴	۱۲

صوبائی مجالس آئین ساز کے نتائج انتخابات کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں۔

"بنگال میں مسلم لیگ سب سے بڑی واحد پارٹی تھی۔ اس نے تقریباً نصف نشستوں پر قبضہ کر لیا۔"

بنگال میں کل مسلم نشستیں ۱۱۹ تھیں جن میں سے ۱۱۲ پر مسلم لیگ نے قبضہ کر کے ۹۵ فی صد کامیابی حاصل کی لیکن مولانا خبر دیتے ہیں کہ تقریباً نصف نشستوں پر مسلم لیگ نے قبضہ کر لیا۔ اس "تقریباً" کی بلاغت کی داد نہیں دی جا سکتی کہ اس نے ۹۵ فی صد کامیابی کو ۵۰ فی صد کر دیا۔

اگر "تقریباً نصف" سے مولانا کی مراد کل مسلم اور غیر مسلم نشستوں کا نصف ہے اور غالباً یہی مراد ہے تو یہ کھلا ہوا مغالطہ ہے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے سوا کسی قوم یا فرقہ کی نمائندگی کا دعویٰ نہ کیا، نہ اپنا کوئی اُمیدوار کھڑا کیا، یہ انتخاب پاکستان کے سوال پر ہوا تھا لہٰذا مسلم لیگ کی کامیابی کا اندازہ مسلم نشستوں ہی کو سامنے رکھ کر لگایا جا سکتا تھا۔

پنجاب کے بارے میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"یونینسٹ پارٹی اور لیگ کا معاملہ تقریباً برابر تھا۔"

یہاں بھی مولانا نے صریح طور پر مغالطہ دینے کی "تقریباً" کوشش فرمائی ہے۔ اگر لیگ اور یونینسٹ پارٹی کا پلہ تقریباً برابر ہوتا تو ہرگز پاکستان نہ بن سکتا!

صورتِ حالات یہ تھی کہ پنجاب میں مسلم نشستوں کی کل تعداد ۸۶ تھی لیکن خضر حیات اور انگریز کے استبداد، احرار، خاکسار، یونینسٹ اور کانگرس کے اتحاد و رابطہ کے باوجود مسلم لیگ نے ۸۶ میں سے ۸۱ نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ صرف پانچ نشستیں یونینسٹ پارٹی جیت سکی۔

احرار نے ہر مسلم نشست کے لیے اپنے اُمیدوار کھڑے کیے تھے لیکن کوئی کامیاب نہ ہوا، اکثر کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔

خاکسار جماعت نے دو درجن سے زیادہ اُمیدوار کھڑے کیے تھے ایک بھی کامیاب نہ ہو سکا تقریباً سب کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔

پنجاب کانگرس کسی مسلمان کو اپنے ٹکٹ پر کھڑا کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ احرار

نمائندگی کی حیثیت سے وہ ہر نشست پناہی کرتی رہی۔

یونینسٹ پارٹی نے ہر مسلم نشست جیتنی لینا چاہی تھی مگر پانچ امیدوار بدقت کامیاب ہوسکے۔

پنجاب کانگرس کے صدر مولانا داؤد غزنوی کامیاب ہوئے لیکن غیر مسلم مزدور حلقہ سے اور وہ بھی اپنے کمیونسٹ حریف سے صرف چند ووٹ زیادہ حاصل کرکے۔

ان اعداد و شمار کی موجودگی میں بھی اگر مولانا لیگ اور یونینسٹ پارٹی کو تقریباً برابر قرار دے رہے ہیں تو گویا ان کی فیاضی کی انتہا ہے لیکن بے موقع ہے۔

سندھ کے متعلق مولانا فرماتے ہیں:

سندھ میں مسلم لیگ نے مسلم نشستوں کی بڑی تعداد جیت لی لیکن اکثریت حاصل نہ کرسکی۔"

لیکن کیا واقعہ بھی یہی تھا؟

بے شک سندھ کے حالات نازک تھے، مسٹر سید اور ان کی پارٹی مسلم لیگ کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑی ہوئی تھی لیکن عین اس وقت جب کاغذات امیدواری داخل کرنے کا وقت گزر گیا، مسٹر سید نے بعض ذاتی شکایتوں اور رقابتوں کی وجہ سے مسلم لیگ سے اپنے چند رفقائے کے ساتھ قطع تعلق کرلیا اور "ترقی پسند" مسلم لیگ قائم کرلی۔

سردار پٹیل اور مولانا آزاد، مسٹر سید کو خیر و برکت دینے کے لیے سندھ پہنچے۔

یہ مسٹر سید وہی تھے جو تین سال سے پہلے سندھ میں ہندوؤں کے بائیکاٹ کی تحریک شروع کرکے کانگرس کے معتوب بن چکے تھے جنہوں نے اعلان کیا تھا۔

"یہ ہندو یورپ کے یہودیوں سے مشابہ ہیں، ان کا مکمل اقتصادی بائیکاٹ کرنا چاہیے!"

جنہوں نے دو سال پہلے سندھ اسمبلی میں تجویز پاکستان پیش کرکے اور اسے منظور کراکے سارے ہندوستان میں ایک شاندار اور عدیم النظیر مثال و روایت قائم کی تھی۔

انہی مسٹر سید نے اب مولانا آزاد کے دامن اور سردار پٹیل کی جیب میں پہنچ کر

اعلان کیا کہ:

"پاکستان ٹھیک ہے لیکن ابھی نہیں ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے بعد ہم پہلے ہندوستان کو آزاد کرائیں گے پھر پاکستان کا نعرہ بلند کریں گے۔"

سردار پٹیل کا خیال تھا کہ سندھ میں مسٹر سید کی ہر دلعزیزی مسلم لیگ کی نہیں مسٹر سید کے ذاتی کمالات کی مرہونِ منت ہے۔ انہوں نے جوشِ طرب سے بے قابو ہو کر نعرہ لگایا:

"سندھ کو ہم نے فتح کر لیا۔"

شاید اس جوشِ مسرت کا سبب یہ تھا کہ سندھ سستے داموں خام اشیاء فراہم کرے گا اور بمبئی و احمد آباد کے مالکان مِل گراں داموں پر اس خام مال کے مصنوعات فروخت کریں گے۔

لیکن سردار پٹیل اور مولانا آزاد کی یہ تمنا بر نہ آئی۔

سندھ کی ۳۴ مسلم نشستوں پر ان نامساعد حالات میں بھی مسلم لیگ نے قبضہ کر لیا صرف ۴ نشستیں سید صاحب کی "ترقی پسند مسلم لیگ"، حاصل کر سکی۔ اب سرحد کو لیجیے مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"صوبہ سرحد میں جہاں مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت تھی۔ لیگ کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور تشکیل وزارت کا کام کانگریس نے کیا۔"

بلاشبہ کانگریس نے سرحد میں وزارت بنائی، پنجاب میں بھی اس نے خضر حیات کو سامنے رکھ کر تشکیلِ وزارت کر لی، سندھ میں مسٹر سید کو آگے بڑھا کر اس نے وزارت قائم کرنے کی پوری کوشش کی۔

لیکن واقعات کا واقعات کی حیثیت سے مطالعہ کرنا چاہیے۔

سچ پوچھیے تو پاکستان کا مطالبہ ایک بڑا سبب کانگریس کی یہ وزارت سازی، ہی تھی، مسلمان یہ دیکھ کر جلتے اور کڑھتے تھے کہ ہم اکثریت میں ہیں، لیکن حلقہ ہائے انتخاب حکومت نے کچھ اس طرح بنائے ہیں کہ ہماری اکثریت بے کار ہو جاتی ہے۔ چند غدار مسلمانوں کو ساتھ ملا کر کانگریس وزارت بنا لیتی ہے

یہی سرحد میں ہوا، یہی پنجاب میں، یہی سندھ میں کرنے کی کوشش کی گئی۔
سرحد کے حالات یہ ہیں کہ "ہندوستان خالی کردو!" کی تحریک میں ڈاکٹر خاں صاحب نے حصہ نہیں لیا، سرحد کے گورنر سر جارج کننگھم سے ان کے ویسے ہی تعلقات تھے جیسے پاکستان بننے کے بعد مرحوم مسٹر غلام محمد سے!

سردار عبدالرب نشتر مرحوم نے ایک بیان میں فرمایا کہ:

"شکر، کپڑے اور اناج کا راشن بڑی دریا دلی سے خدائی خدمتگار حلقوں میں تقسیم کیا گیا اور مسلم لیگیوں کو محروم رکھا گیا۔ نئے رائے دہندوں کی جو فہرست مسلم لیگ نے پیش کی اس میں کافی قطع و برید کی گئی اور کانگرس یا خدائی خدمتگار کی طرف سے جو نئی فہرست ہزارہا افراد کی پیش ہوئی وہ فوراً منظور کر لی گئی۔"

لیکن اس کے باوجود نتیجۂ انتخاب کیا نکلا؟

ڈاکٹر خاں صاحب وزیر اعلیٰ سرحد نے اعلان کیا تھا:

"مسلم لیگ اور کہیں ہو تو ہو، مگر سرحد میں نہیں ہے۔"

مسلم لیگ نے ثابت کر دیا کہ جس طرح وہ اور کہیں ہے اسی طرح سرحد میں بھی ہے۔

سرحد میں کل مسلم نشستیں ۳۸ تھیں، مسلم لیگ نے انتہائی دھاندلی اور سرکاری حکام کی جانب داری کے باوجود، ۱۷ نشستیں حاصل کر لیں۔

تفصیل یہ ہے:-

مسلم لیگ	۱۷	نشستیں
کانگرس	۱۶	″
جمعیۃ علماء	۲	″
آزاد امیدوار	۱	″
مشترک حلقے	۵	″

گویا جہاں تک کانگرس اور مسلم لیگ کا تعلق تھا، فتح یہاں بھی مسلم لیگ کو

ہوئی۔

رہا سرحد میں کانگرس وزارت کا قیام، سو اس کا راز یہ تھا کہ کانگرس نے مختلف طریقے بروئے کار لاکر ہر غیر مسلم لیگی ممبر کو توڑ کر اپنی مصنوعی اکثریت پیدا کر لی۔ اور وزارت بنالی لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد دنیا نے دیکھ لیا کانگرس اور کہیں ہو تو ہو مگر سرحد میں نہیں رہ گئی۔

مولانا نے مسلم لیگ پر مذہبی دیوانگی کا الزام بھی لگایا ہے اور فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے کا بھی، فرماتے ہیں:

"جو مسلمان کانگرس یا کسی دوسری جماعت کے ٹکٹ پر کھڑے ہوتے ان کے لیے ناممکن تھا کہ لوگوں (مسلم عوام) کے سامنے اظہار خیال کر سکیں۔"

افسوس ہے مولانا کا یہ ارشاد بھی نہ ان کے شایان شان ہے نہ حقیقت واقعہ کا ترجمان مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کسی کے خلاف فتوائے کفر نہیں صادر ہوا۔

لیکن قائداعظم کو نہ صرف قائداعظم کو بلکہ ان کی مرحومہ اور مومنہ بیوی تک کو کافر اور کافرہ تک کہا گیا اور یہ معمولی لوگ نہ تھے۔ احرار کے مولانا مظہر علی اظہر صاحب اور دیوبند کے مولانا حسین احمد جیسے جلیل القدر اکابر تھے۔

بمبئی میں قائداعظم کے مقابلہ پر مسٹر حسین بھائی لال جی "تین کروڑ شیعان ہند کے قائداعظم بن کر کھڑے ہوتے" انہوں نے جلسے کیے تقریریں کرائیں، جلوس نکالے لیکن نہ کوئی زخمی ہوا نہ ہلاک، اس کے برعکس لدھیانہ میں اور کانپور میں لیگ کے حامیوں پر قاتلانہ حملے ہوتے اور دو مسلمان ہلاک کر دیے گئے۔

مولانا نے الزام تو لگا دیا لیکن یہ نہ سوچا کہ یہ قبا کس کے بدن پر چست ہوتی ہے؟ میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا!

(۱۰)

مولانا کا یہ استقلال یقیناً قابل داد ہے کہ انہوں نے خواہ کتنی خلاف واقعہ رائے قائم کی ہو مگر زندگی کی آخری سانس تک اس پر قائم رہے لیکن ظاہر ہے "اس طرح مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ بہت سے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔"

(۱۱)

پاکستان کا جو مفہوم مولانا نے مراد لیا ہے وہ جہاں ان کی ذہانت کا شاہکار ہے وہاں اس ملایانہ کج بحثی کا بھی جس سے خود مولانا ہمیشہ گریزاں اور نفور رہے ہے!
پاکستان کا جو مفہوم مولانا نے بنایا ہے وہ آج تک نہ قائد اعظم نے مسلم لیگ کے کسی لیڈر نے مراد لیا ہے۔

یہ اعتراض ایسا ہی ہے جیسا حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی پر مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا فتویٰ کفر!۔

مولانا بریلوی نے مولانا فرنگی محلی کے خلاف ۴۲ وجوہ پر مشتمل کفر کا فتویٰ صادر فرمایا جس میں ایک وجہ یہ تھی کہ ان کا نام "عبد الباری" ہے لوگ انہیں "باری میاں" کہتے ہیں۔ اگر ان کا نام "عبد اللہ" ہوتا تو لوگ انہیں "اللہ میاں" کہتے، لہذا کافر!

(۱۲)

پاکستان کو یہودیوں کے وطن سے تشبیہہ دینا، ایسی جرأت ہے جس میں یقیناً مولانا منفرد ہیں۔

مسلمانانِ ہند کے بارے میں یہ ارشاد فرمانا کہ

"وہ انتظام اور پالیسی کے ہر مسئلہ پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہو سکتے تھے، ایسا حسن ظن ہے جو اگر مبنی بر واقعہ ہوتا تو ہرگز مسلمان پاکستان کا نام نہ لیتے۔

(۱۳)

لیکن ان میں سے کوئی وجہ بھی ایسی نہیں ہے جو پاکستان کے خلاف کوئی وزنی دلیل کی حیثیت رکھتی ہو۔

اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے لیے اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کا بھی غلام بنا رہنا، دونوں میں سے کسی کے لیے بھی فائدہ مند نہ ہوتا۔

(۱۴)

یہ پہلے سے معلوم تھا۔ اور ہمیشہ سے ہوتا چلا آرہا تھا اسی سبب سے پاکستان کی تحریک عالم وجود میں آئی۔

(۱۵)

اس کا جواب مستقبل دے گا!

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا؟
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا؟

(۱۶)

بالکل درست ۔ خود قائد اعظم بھی یہی فرمایا کرتے تھے ۔

(۱۷)

مسلم لیگ نے تو یہ تجویز بہرحال منظور کر لی تھی منظور کر کے مسترد کرنے کا شرف تو کانگرس ہی کو حاصل ہوا ۔

(۱۸)

مولانا کا یہ خیال ہندوستان کی آزادی کے بارہ سال بعد بھی پورا نہ ہوا ۔ اور نہ مستقبل ، قریب یا بعید میں اس کے پورا ہونے کا امکان ہے ۔ آج بھی وہاں اقتصادی پارٹیوں کو کوئی منہ نہیں لگاتا ، متعصب قسم کی مذہبی پارٹیاں (جن میں کانگرس بھی شامل ہے) برسر اقتدار ہیں اور مذہبی بنیاد پر بے گناہ مسلمانوں کو آج بھی اسی طرح ہدف قتل و غارت بنائے ہوتے ہیں جیسا تقسیم ہند سے پہلے بنا رکھا تھا ۔ بھوپال اور سیتا مڑہی میں مئی ۱۹۵۹ء میں جو ظلم مسلمانوں پر توڑے گئے ، صرف اس لیے کہ وہ مسلمان تھے ۔

(۱۹)

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انگریزوں کی پشت پناہی کانگرس کو حاصل تھی نہ کہ مسلم لیگ کو !

(۲۰)

مسلم لیگ کو اس پر اعتراض نہ تھا ۔

(۲۱)

مسلم لیگ کی امن پسندی کا یہ بہترین ثبوت ہے

(۲۲)

آپ ہی اپنی جفاؤں پر ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی ۔

(۲۳)

خوددارانہ طرز عمل اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا؛

(۲۴)

جواہر لال پر طنز ہے جس کا جواب وہی دے سکتے ہیں!

(۲۵)

خلقت بہ منت یک طرف
آں شوخ تنہا یک طرف

(۲۶)

چندریگر، نشتر اور غضنفر علی خاں کے بارے میں مولانا کا یہ فرمانا کہ

"ان لوگوں کے بارے میں خود لیگ کے ممبروں کو بہت کم واقفیت تھی!"

غلط ہے، نشتر صاحب سرحد کے سابق وزیر تھے۔ چندریگر صاحب صوبہ بمبئی مسلم لیگ کے کئی سال سے صدر چلے آرہے تھے، غضنفر علی خاں، ملک برکت علی کے علاوہ مسلم لیگ کے سب سے پرانے اور پرجوش رکن تھے، مولانا ان اصحاب کو نہ جاننا چاہیں تو دوسری بات ہے ورنہ پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے۔

خواجہ ناظم الدین سے اگر قائد اعظم خفا ہوتے تو انہیں مشرقی بنگال کا وزیر اعظم بناتے، یوپی سے وہ صرف ایک ہی آدمی کو لے سکتے تھے، لہٰذا لیاقت علی پر نواب اسماعیل خاں کو ترجیح دینا ممکن نہ ہوا، ورنہ وہ یقیناً سراپا محاسن شخصیت کے مالک تھے ہر مسلم لیگی، حتیٰ کہ قائد اعظم تک ان کا احترام کرتے تھے۔

(۲۸)

منڈل کے بارے میں مولانا کے یہ معلومات صحیح ہوں گے لیکن

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

سردار بلدیو سنگھ، وزیر دفاع حکومت ہند کے بطیفے، بہرحال منڈل کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

۲۸- ہاتے وہ اُمیدیں جو پوری نہ ہوئیں۔

۲۹- خود کردہ را علاجے نیست!

۳۰- ہر کہ بعد از جنگ یاد آید، بر کلہ خود می باید زد

۳۱- اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صلح کا جویا کون تھا اور صلح سے بیزار اور متنفر کون تھا؟

۳۲- کیا مولانا، چاہتے تھے کہ قائد اعظم پاکستان روانہ ہوتے وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو تلقین کرتے کہ وہ حکومت کی وفادار رعایا بن کر نہ رہیں بلکہ ماؤ ماؤ قسم کی کوئی دہشت انگیز تحریک شروع کر دیں۔

مولانا نے جن مایوس اور ناقابل رحم مسلم لیگیوں کا ذکر کیا ہے، کاش ان کے اسمائے گرامی بھی لکھ دیے ہوتے تاکہ ان کے بارے میں آسانی سے رائے قائم کی جا سکتی۔

---

(۱۲)

منقسم ہندوستان

بغاوت کی چیخیں ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو مملکتِ پاکستان عالمِ وجود میں آگئی۔ ۱۵راگست کو نصف شب گزرنے کے بعد ہندوستان آزاد ہوگیا، کانگرس اور مسلم لیگ نے تقسیم قبول کر لی اس کا مطلب یہ تھا کہ سارے ملک نے تقسیم قبول کر لی، لیکن حقیقی صورت بالکل مختلف تھی، ہم نے محسوس کیا کہ قبولیت صرف آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ریزولیوشن اور مسلم لیگ کے رجسٹر پر نظر آتی تھی، ہندوستان کے لوگوں نے اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تصور کے خلاف ان کی روح اور قلب کی گہرائی سے بغاوت کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ہمیشہ سے تقسیم کی مخالفت چلی آ رہی تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں میں ایک آدمی بھی تقسیم کا حامی نہیں تھا۔ کانگرس کے تقسیم قبول کر لینے کے باوجود ان لوگوں کا مخالفانہ جذبہ ذرا بھی کمزور نہیں پڑا تھا چنانچہ جب تقسیم ایک حقیقت بن گئی تو مسلم لیگ کے متبعین تک گھبرا اُٹھے، اور کھلے بندوں کہنے لگے کہ تقسیم سے ان کی مراد یہ تو نہیں تھی۔ (۱) (ص ۲۰۶)

کانگرس نے تقسیم نہیں قبول کی میرا اختر وع سے یہ خیال تھا کہ کھلے اور آزاد دماغ کے ساتھ کانگرسی لیڈروں نے تقسیم قبول نہیں

کی۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے غیظ و غضب کے عالم میں اور کچھ نے مایوسی کے باعث تقسیم قبول کی۔ آدمی غصہ اور خوف کے عالم میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا جو کانگرسی لیڈر تقسیم کے مبلغ بن گئے تھے اور جنہوں نے تبلیغ کا یہ فریضہ جذبات کے دھارے میں بہہ کر ادا کیا تھا۔ وہ بیچارے بھلا اپنے فکر و عمل کے نتائج کا صحیح اندازہ کس طرح کر سکتے تھے (۲)

(ص: ۲۰۶، ۲۰۷)

یوم نشاط و ماتم

۱۴ اگست کا دن مسلمانان پاکستان کے لیے یوم نشاط و طرب تھا، لیکن ہندوؤں اور سکھوں کے لیے یوم ماتم، یہ کیفیت صرف عام لوگوں کی نہیں بلکہ مخصوص کانگرسی لیڈروں تک کی بھی تھی۔ اچاریہ کرپلانی اس زمانے میں صدر کانگرس تھے۔ وہ سندھ کے رہنے والے تھے انہوں نے ایک بیان شائع کیا کہ آج کا دن ہندوستان کی تباہی اور غم کا دن ہے۔ انہی جذبات کا اظہار پاکستان کے ہر ہندو اور سکھ نے علانیہ کیا یہ کیسی صورتِ حالات تھی؟ ہماری سب سے بڑی قومی تنظیم نے تقسیم کے حق میں فیصلہ کیا۔ لیکن ساری قوم اس فیصلہ سے رنجیدہ اور ملول تھی۔ (۳)

(ص: ۲۰۷)

ہلاکت اور بربادی کا دور

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادیٔ ہند کا سورج طلوع ہو رہا تھا، اس تقریبِ سعید کے لیے بڑے بڑے اہتمامات کیے جا رہے تھے، تمازتِ آفتاب کے باوجود پرچم کشائی کے موقع پر بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا، اتنا زیادہ کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی کار سے نہیں اُتر سکے۔ انہیں اپنی تقریر بیٹھے بیٹھے کرنی پڑی۔

لیکن وحدت و سرور کی یہ مدت مشکل سے دو دن قائم رہی، دوسرے ہی دن سے فرقہ وارانہ خونریزیوں کی اطلاعات آنے لگیں۔ یہ خبریں تھیں قتل کی، ہلاکت کی، درندگی کی۔ مشرقی پنجاب میں ہندو اور سکھ مجمع مسلم دیہاتیوں پر حملہ کر رہا تھا۔ یہ لوگ گھر بار کو جلا دیتے پھر بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیتے۔ اسی طرح کی اطلاعیں مغربی پنجاب سے بھی آ رہی تھیں۔ مغربی اور مشرقی پنجاب کا علاقہ ہلاکت اور بربادی کا مقبرہ بن گیا تھا، حالات تیزی سے پلٹا کھا رہے تھے۔ مشرقی پنجاب کے وزیر

ایک ایک کر کے دہلی آئے ہوئے تھے ۔ ان کے ساتھ مقامی کانگرس کے لیڈر بھی ہوتے تھے یہ سب پیش آمدہ حالات سے گھبرائے ہوتے تھے ، قتلِ عام اور ہلاکت و بربادی کی یورش نے انہیں حواس باختہ کر دیا تھا ، مایوسی کے عالم میں کہتے ہیں یہ مصیبت کسی کے روکے نہ رکے گی ، ہم نے ان سے کہا کہ وہ فوج کو کیوں نہیں بلا لیتے ؟ مایوسی کے عالم میں انہوں نے کہا کہ اس پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ، نہ اس سے کسی خاص مدد کی توقع کی جا سکتی ہے ۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ دہلی سے دوسری فوج بھیجی جائے

(۴) (ص : ۲۱۰ ، ۲۱۱)

---

(۱)

اس حقیقت سے واقعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو اور سکھ تقسیم کے خلاف تھے ہندو اس لیے کہ سرزمین ہند کا چوتھائی سے زیادہ رقبہ اور نو کروڑ آدمی ان کے قبضہ اور دامِ تزویر سے نکلے جا رہے تھے سکھ اس لیے کہ ایک طرف تو ان کے مقامات مقدسہ اور آثارِ متبرکہ پاکستان میں رہ گئے ، دوسری طرف " پنجابی صوبہ " یعنی سکھ صوبہ بھی عالمِ وجود میں نہیں آیا اور بظاہر اب اس کا کوئی امکان نہیں رہ گیا تھا تیسری طرف جو سکھ پاکستان سے ترکِ وطن کر کے آئے ان کی بڑی تعداد مشرقی پنجاب کی بجائے ہندوستان کے دور دست علاقوں حتیٰ کہ انڈیمان تک میں بکھر کر رہ گئی ، لہٰذا ان دونوں کا غصہ اور صدمہ تو بالکل قدرتی اور فطری تھا لیکن مولانا کا یہ ارشاد کہ " مسلمانوں کی بڑی جماعت ہمیشہ سے تقسیم کی مخالف چلی آ رہی ہے " واقعہ کے بالکل خلاف ہے ۔

نیا الیکشن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں پاکستان کی بنیاد پر لڑایا گیا تھا ۔ اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں نے اسے جس طرح کامیاب بنایا وہ تفصیلات اعداد و شمار کی روشنی میں درج کی جا چکی ہیں ۔ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے اس سلسلہ میں کیا کیا ؟ یہ بھی سن لیجیے :

یو پی اسمبلی میں کل مسلم نشستیں ۶۶ تھیں
۵۴ پر مسلم لیگ نے قبضہ کر لیا ۔

بہار اسمبلی کل مسلم نشستوں کی تعداد ۴۰ تھی،
۳۶ پر مسلم لیگ قابض ہو گئی۔
مدراس میں جملہ نشستوں کی تعداد ۲۹ تھی ان ساری ۲۹ مسلم نشستوں پر مسلم لیگ نے قبضہ کر لیا۔
اڑیسہ اسمبلی میں جملہ نشستوں پر مسلم لیگ کامیاب ہوئی۔
ر بمبئی میں ۳۰ کی ۳۰ مسلم نشستوں پر مسلم لیگ نے قبضہ کر لیا۔
حالانکہ بمبئی وہ صوبہ تھا جہاں کانگرس نے مسلم لیگ کو زک دینے کے لیے پوری قوت اور دولت صرف کر دی تھی۔
مسٹر یسلین نوری کانگرس کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے ہوتے تھے، یہ میرا چشم دید واقعہ ہے کہ پولنگ کے دن سردار پٹیل بہ نفس نفیس متعدد پولنگ بوتھ پر تشریف لے گئے اور مسٹر نوری کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔
تسارہ (پونہ) میں کانگرس کی ساختہ پرداختہ "پتری سرکار" ایک دہشت انگیز جماعت برسرکار تھی، یہ کئی مخالفین کانگرس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر عبرتناک سزائیں دے چکی تھی اور عقوبت واذیت کی ہولناک مثالیں قائم کر چکی تھی۔ یہ جماعت کانگرس کی دمساز اور حلیف، مسلم لیگ کی مخالف اور دشمن تھی۔ اس کی دھمکیاں اور لرزہ خیز عقوبتیں غریب اور مفلوک الحال مسلمانوں کے لیے چیلنج تھیں لیکن انہوں نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور کانگرس امیدوار کو شکست دے کر مسلم لیگ کے امیدوار کو کامیاب کیا۔
آخر وہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت جو تقسیم کی مخالف چلی آ رہی تھی، جس کا مولانا نے اس زور شور سے ذکر کیا ہے انتخابات کے وقت کہاں روپوش تھی؟ نہ وہ مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں کہیں دکھائی دی، نہ اقلیتی صوبوں میں۔
یہ حقیقت ہے کہ تقسیم کے بعد مسلم لیگ کے متبعین گھبرا اٹھے، لیکن تقسیم کی وجہ سے نہیں، اس لیے کہ ریڈکلف نے تقسیم کو ناکارہ بنا دینے کی پوری کوشش کی تھی اور اس لیے کہ ہندو اکثریت سے بدترین خطروں اور اندیشوں کے باوجود اس تنگ نظری کی توقع وہ ہرگز نہیں رکھتے تھے۔ جس کا مظاہرہ اس نے تقسیم کے بعد کیا۔ بحرانی دور گزر جانے کے بعد پاکستان کے کسی صوبہ میں ہندوؤں پر زیادتی

نہیں ہوئی لیکن بھارت میں مسلمانوں کا قتل اب تک جاری ہے۔ سیتامڑھی کے قتل و غارت کو تو ابھی چند دن ہی ہوئے ہیں۔

(۲)

کانگرسی لیڈروں نے جذبات کے دھارے میں بہہ کر برہمی اور مایوسی کے عالم میں تقسیم ہرگز منظور نہیں کی تھی بلکہ اس کی صحیح وجہ وہی تھی جو مولانا نے اپنی خود نوشت میں متعدد جگہ تحریر فرمائی ہے۔ یعنی تقسیم کی اسکیم اس لیے منظور کی گئی کہ انہیں یقین تھا کہ پاکستان "قائم" نہیں رہ سکے گا وہ خود الحاق کی التجا لے کر آئے گا۔

پاکستان کی کمزور معیشت کو بالکل مفلوج کر دینے کے لیے سندھ کے ہندوؤں سے ترک وطن کرایا گیا جہاں کسی ہندو کی نکسیر تک نہیں پھوٹی تھی اور کوئی شبہ نہیں اگر سردار پٹیل نے جونا گڑھ اور بانٹوا کے میمنوں کو ہدفِ ستم نہ بنایا ہوتا تو ان کی یہ اسکیم کامیاب بھی ہو جاتی لیکن میمن ہدفِ ستم بن کر پاکستان میں آ گئے اور انہوں نے پاکستان کی معیشت کا سارا بوجھ اُٹھا لیا۔

(۳)

کرپلانی صاحب کی دلچسپ شخصیت کی طرف مولانا نے اشارہ کر کے ایک دلچسپ آدمی کی یاد دلا دی۔

کانگرس کے سالانہ اجلاس ۱۹۴۶ء میں انہوں نے خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فخر سے اپنے خاندان کے یک جدّی عزیزوں کا تذکرہ کیا تھا جو ہندو سے مسلمان ہو گئے تھے اور جو پاکستان کے حامی اور کانگرس کے مخالف تھے لیکن ان سے کرپلانی جی کے عزیزانہ تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن رواداری کی اس نمائش کے باوجود اور کانگرس کے سابق سیکرٹری اور صدر ہونے کے باوجود یہ ہمیشہ ایک کٹر اور متعصب ہندو رہے۔

بہار کے ہولناک فساد اور مسلمانوں کے بے دردانہ قتل عام کی ساری ذمہ داری کرپلانی کے سر ہے۔ یہ حضرات نواکھالی تشریف لے گئے اور وہاں کے ہندوؤں کے قتل عام کی ایسی جگر شگاف اور زہرہ گداز داستانیں اپنے بیانات میں شائع کیں جو فسادِ بہار اور مسلمانوں کے قتل عام کا سبب بنیں، حالانکہ کرپلانی کی یہ رپورٹیں محض کارگاہِ ذہن و دماغ کی مصنوعات تھیں، حقیقت اور واقعہ سے انہیں دُور کا بھی تعلق

نہیں تھا۔

کرپلانی صاحب نے ایک بڑے ہندو زمیندار کے متعلق نہایت غیر ذمہ دارانہ طور پر پوری ذمہ داری سے یہ افسانہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلایا کہ وہ اپنے بچوں پر جا رہا تھا مسلمانوں نے اسے ہلاک کر دیا، اس کے خاندان کی عورتوں کو اغوا کر لیا، اس کا گھر لوٹ لیا اور اس کی جائداد و املاک تباہ کر دی لیکن خود اس ہندو زمیندار نے مولانا ملیح آبادی کے ایڈیٹر ہند حسبِ روایت تردید کی اور بتایا کہ میں زندہ ہوں، بخیریت ہوں، مسلمانوں نے فساد کے دوران میری مدد کی، نہ کسی کو اغوا کیا، نہ میرا مکان لوٹا نہ میری جائداد و املاک تباہ کی، اس دروغ بے فروغ پر اصول کا تقاضا تو یہ تھا کہ کرپلانی صاحب کانگرس سے نکال دیے جاتے لیکن ہوا یہ کہ وہ اور زیادہ سر آنکھوں پر بٹھائے جانے لگے۔

تقسیمِ ہند کے وقت کرپلانی صاحب سے سوال کیا گیا، اب ہندوستان کا نام کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا:

"ہند"

لیکن بھارت کا لفظ اتنا دلکش نظر آیا کہ وہ "ہند" کو بھول گئے۔

تقسیمِ ہند کے وقت کرپلانی صاحب اپنے وطن سندھ کا دورہ کر رہے تھے انہوں نے کراچی کے ایک جلسہ عام منعقدہ آرام باغ میں، ہندوؤں کے ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کی:

"اگر پاکستان نے ہندوستانیوں کے لیے پرمٹ یا پاسپورٹ سسٹم رائج کیا تو میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان کی قربانی دے کر بھی اس کی خلاف ورزی کرے گا۔"

لیکن جب چند روز بعد پاکستان نے نہیں ہندوستان کی کانگرسی حکومت نے یک طرفہ ٹریفک روکنے کے لیے پہلے پرمٹ کا پھر پاسپورٹ کا سسٹم نافذ کیا تو کرپلانی صاحب نے ایسی چپ سادھی کہ آج تک ... سے کچھ ایسی ہی بات ...

ہیں !

(۴)

ان ارشادات پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ کہیں جسے

؎ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

دلّی کا قتلِ عام

ہولناک کُشت و خُون

دلّی میں کسی طرح کی گڑبڑ نہ تھی لیکن جب ملک میں ہر طرف قتل و غارت کے شعلے بھڑکنے لگے تو یہ ممکن نہ تھا کہ دلی میں جو تھوڑی سی فوج تھی اسے باہر بھیج دیا جائے ہم نے فیصلہ کیا کہ مشرقی پنجاب میں کسی دوسرے مقام سے فوج منگا کر بھیجی جائے لیکن قبل اس کے کہ وہ پہنچ سکتی قتل و غارت کے شعلے دلّی کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ مغربی پنجاب سے آتے ہوئے غیر مسلم پناہ گزینوں کی داستانِ درد نے دہلی میں بھی قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا اور تشدد کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ تشدد کی یہ گرم بازاری صرف پناہ گزینوں یا عام لوگوں تک محدود نہیں تھی وہ علاقے بھی متاثر تھے جہاں صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ سرکاری ملازمین رہتے تھے۔ مغربی پنجاب کے قتل عام کی داستان جب دہلی پہنچی تو یہاں کے مسلمانوں پر مشتعل گروہوں نے حملہ شروع کر دیا۔ بعض سکھوں نے دہلی کے ان قاتلانہ حملوں کی تنظیم میں قائدانہ حصہ لیا۔ میں پہلے کہیں کہہ چکا ہوں کہ کانگرسی رہنماؤں کی زبان سے جب انتقال دیرغمال کا فلسفہ میرے سننے میں آیا تو اس پست ذہنیت پر مجھے کتنا دکھ ہوا تھا؟ اب دہلی میں اسی شرمناک یرغمال و انتقام کے فلسفہ پر عمل کیا جا رہا تھا۔ اگر مغربی پنجاب کے مسلمان، ہندوؤں اور سکھوں کے قتل کے مجرم تھے تو کیا وجہ تھی کہ دلّی کے بے گناہ مسلمانوں کو ہدفِ انتقام بنایا جائے؟ انتقامی ارادہ

یرغمال کا برتاؤ اتنا مکروہ تھا کہ کوئی دانش مند اور شریف انسان اس کی تائید میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا۔

ہندو فوج بھی فسادیوں کے ساتھ تھی

فوج کا طرزِ عمل بھی ایک نازک مسئلہ بن گیا تھا۔ تقسیم سے پہلے فرقہ وارانہ منافرت سے فوج بالکل پاک تھی۔ لیکن جب ملک کی تقسیم فرقہ وارانہ بنیاد پر عمل میں آئی تو یہ زہر فوج میں بھی سرایت کر گیا، دہلی میں جو فوج متعین تھی اس کی اکثریت ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی۔

جنوبی ہند سے فوج کی طلبی

چند ہی روز میں یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ مسئلہ بہت بڑے دردِ سر کا سبب بن جائے گا۔ اگر نظم و قانون کی بحالی کے لیے کوئی سخت اقدام اس کے ذریعہ سے کیا گیا۔ چنانچہ ہم نے طے کیا کہ جنوبی ہند سے کچھ فوجی دستے طلب کر لیں۔ جنوبی ہند کے فوجیوں پر تقسیم ہند کا کوئی زہریلا اثر نہیں ہوا تھا۔ یہ اپنے سپاہیانہ نظم پر قائم تھے۔ جنوبی ہند کے سپاہیوں نے دہلی میں امن کی بحالی اور حالات کو رو براہ کرنے میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔

مسلمانوں کا حالِ زار

خاص شہر سے قطع نظر دلی کے مضافاتی علاقے مثلاً قرول باغ، لودھی کالونی، سبزی منڈی اور صدر بازار میں مسلمانوں کی کافی آبادی تھی۔ ان تمام علاقوں میں زندگی اور جائداد کی سلامتی نابود ہو چکی تھی۔ موجودہ حالات میں یہ بھی ناممکن تھا کہ یہاں کے مسلمان باشندوں کو مکمل طور پر فوجی حفاظت میں لیا جاتا، ایک مرحلہ پر ان علاقوں کی حالت اتنی نازک اور بدتر ہو گئی کہ رات کو سوتے وقت کسی مسلمان کو یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ صبح وہ زندہ اٹھے گا۔

دولت مند مسلمانوں کی بربادی

فساد اور قتل و غارت کے ان دنوں میں فوجی افسروں کے ساتھ دلی کے مختلف علاقوں کا میں نے دورہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مسلمان بالکل ہمت ہار چکے ہیں اور اپنے آپ کو بجز بے بس محسوس کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے میرے گھر میں پناہ چاہی۔ شہر کے دولت مند اور مشہور مسلمان خاندانوں کے لوگ فقر و فاقہ کے عالم میں میرے پاس آتے۔ اب ان کے پاس کچھ نہ تھا سوا ان کپڑوں کے جو ان کے بدن

پڑتے، کچھ لوگ روز روشن میں آنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے ایسے لوگ فوج کی حفاظت میں پچھلے پہر لائے جاتے تھے۔ بہت جلد میرے گھر میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ میں نے گھر کے احاطہ میں خیمے نصب کرا دیے۔ مرد اور عورت، غریب اور امیر، جوان اور بوڑھے افراتفری کے عالم میں موت سے دہشت زدہ اور سراسیمہ جمع ہو رہے تھے۔

زبردستی مسلمان گھروں سے نکالے گئے

یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ نظم و امن بحال کرنے میں کچھ وقت لگے گا یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ شہر کے دور دراز علاقوں میں مسلمان مکانوں کی حفاظت کی جا سکے۔ اگر ہم ایک علاقے میں گارڈ کا انتظام کرتے تھے تو حملہ دوسرے علاقے میں شروع ہو جاتا تھا۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو جمع کر کے حفاظتی کیمپوں میں پہنچا دیا جائے، ایسا ہی ایک کیمپ پرانے قلعہ میں قائم کر دیا گیا۔ یہاں کوئی عمارت نہیں تھی صرف فصیل تھی، اسی گھیرے میں ان لوگوں کو رہنا پڑا بہت جلد یہ کیمپ بھی بھر گئے۔ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد پرانے قلعہ میں جمع ہو گئی اور فصیل کی چہار دیواری میں کھلے آسمان کے نیچے سردی کا سارا موسم اسے گزارنا پڑا۔ امن بحال کرنے اور نظم و قانون قائم کرنے کے لیے گڑبڑ کے اس زمانہ میں کئی اسپیشل مجسٹریٹ مقرر کر دیے گئے۔ مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اکثر حالات میں ان کا انتخاب ناخوشگوار ثابت ہوا۔ ان میں سے متعدد مجسٹریٹ اپنے فرائض انجام دینے میں ناکام رہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مجسٹریٹ سے کہا کہ ایک مسلم علاقہ پر حملہ کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور چند مسلمان خاندان موت سے سہمے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں، یہ مجسٹریٹ بجائے اس کے کہ کوئی مناسب قدم اٹھاتا الٹا اس کانگرسی ہندو کو ملامت کرنے لگا۔ اس نے کہا اسے تعجب ہے کہ ایک ہندو اس لیے اس کے پاس آتا ہے کہ مسلمانوں کی مدد کی جائے۔

(ص: ۲۱۱، ۲۱۰)

ڈاکٹر ذاکر حسین کا دردناک بیان

مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد پرانے قلعہ میں کھلے آسمان کے نیچے موسم سرما گزار رہی

تھی ہزاروں آدمی نزلہ زکام اور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ ان لوگوں کے لیے نہ غذا کا کوئی انتظام تھا نہ پانی کا، فضلہ کی صفائی کا انتظام یا تو بالکل نہیں تھا یا اگر تھا تو نہ ہونے کے برابر۔ ایک روز ڈاکٹر حسین خاں نے امیر جنسی بورڈ کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ پرانے قلعہ کے حالات بے انتہا دہشت خیز ہیں، انھوں نے کہا ان بے چارے مردوں اور عورتوں کو فوری موت سے بچانے کے لیے ایک کھلی قبر میں دفن کر دیا گیا ہے۔ بورڈ نے مجھے ہدایت کی کہ وہاں کا معائنہ کرنے کے بعد ضروری انتظامات سے متعلق اپنی رپورٹ پیش کر دوں۔ (ص، ۲۱۵)

مولانا آزاد کے یہ الفاظ واقعات و حوادث، خونچکاں واقعات اور زہرہ گداز حوادث کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

محمود غزنوی کے پاس ایک مرتبہ ایک بڑھیا حاضر ہوئی اس نے کہا۔ فلاں دور دراز شہر میں ڈاکوؤں نے مجھ دکھیاری کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا۔ محمود نے جواب دیا، "بھلا اتنے دور دست علاقہ کا انتظام میں کس طرح کر سکتا ہوں؟" بڑھیا نے تڑ سے جواب دیا۔

"اگر انتظام نہیں کر سکتا تو وہاں حکومت کرنے کی ہوس کیوں رکھتا ہے؟"

یہ جواب سن کر وقت کے سب سے بڑا فاتح اور کشور کشا کا سر ندامت سے جھک گیا۔ اس کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں، اس نے بڑھیا سے معذرت کی، اس کے نقصان کی تلافی کی اور اس دور دست علاقہ میں اپنی فوج ظفر موج بھیج کر ایسا انتظام کیا کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پینے لگے!

جواہر لال کے سامنے کسی تباہ حال بڑھیا کی نہیں پوری ایک قوم کی دور دست علاقہ میں نہیں خاص راجدھانی میں، پرانی دلی کے دور دراز کار علاقہ ہی میں نہیں، نئی دلی کے کوچہ و بازار میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا، عورتیں بلک رہی تھیں، مرد تڑپ رہے تھے، بچے تلملا رہے تھے۔ شوہروں سے ان کی بیویاں باپوں سے ان کی بیٹیاں، بھائیوں سے ان کی بہنیں چھینی جا رہی تھیں اور کھلے عام ان کی متاع ناموس لوٹی جا رہی تھی، مگر یہ بہادر، یہ نڈر، یہ دلیر، یہ بے باک

ہر دلعزیز و محبوب لیڈر سوا کف افسوس ملنے کے کچھ نہ کر سکا۔ کیا تاریخ کی یہ عجیب غریب ٹریجڈی نہیں ہے؟

بہت دنوں کی بات ہے۔ ہزار سال سے بھی پہلے کی، لنکا میں کچھ عرب تاجر آباد تھے، وہ مر گئے، راجہ نے ان کی بیواؤں کو ایک کشتی میں بٹھا کر اظہار خیر سگالی کے طور پر عراق روانہ کر دیا، یہ کشتی جب کراچی کے پاس پہنچی تو چند بحری قزاقوں نے اسے لوٹ لیا اور عورتوں کو باندی بنا لیا۔ ایک بڑھیا کی آواز فضا میں گونجی۔

"حجاج تو کہاں ہے؟"

دوش ہوا پر سوار ہو کر یہ آواز حجاج کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اس نے بے قرار ہو کر جواب دیا۔

"میں آیا"

پھر محمد بن قاسم کی سرکردگی میں مٹھی بھر عرب سپاہی ایک ان جانے دیس میں اپنی قوم کی متاع ناموس کا انتقام لینے پہنچ گئے۔ ایک طرف راجہ داہر کا مور و ملخ سا لشکر تھا۔ دوسری طرف غیور اور خوددار عربوں کی مختصر سی جماعت تھی۔ داہر کی فوج مغرور، عیاش، بے پروا، اور فرض ناشناس تھی، عرب سپاہی اُس جذبے سے سرشار تھے۔

جس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیاد زمین

نتیجہ جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

"دو قومی" نظریہ کے سب سے بڑے دشمن اور "ایک قومی" نظریہ کے سب سے بڑے علمبردار۔ جواہر لال نے اس موقعہ پر اپنی "قوم" کو یوں لٹتے، مٹتے، مرتے، قتل ہوتے، خاک و خون میں تڑپتے کس طرح، کس دل سے دیکھ لیا؟ وہ تاریخ کے بہت بڑے عالم ہیں۔ انھوں نے تاریخ ہند اور تاریخ عالم پر کئی قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ کیا انھیں تاریخ نے بھی نہیں بتایا کہ اس طرح کے واقعات کا انجام کیا ہوتا ہے؟ انھوں نے مٹی ہوئی اور برباد قوموں کے اسباب ہلاکت پر کیوں غور نہیں کیا؟ ان سے سبق کیوں نہیں لیا؟

تاریخ ہند کا ہر طالب علم "مرہٹہ گردی" کے بحرانی دور سے اچھی طرح واقف ہے یہ وہ زمانہ تھا کہ مرہٹے پونہ سے اٹھے اور سارے ہندوستان کو اپنی تاخت و تاراج سے

انھوں نے زیر وزبر کر کے رکھ دیا۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ دلی تک ان کی تحویل میں آگئی۔ مرہٹوں کی دہشت، درندگی، خون آشامی، ذوقِ قتل و غارت، خوئے سفاکی و شقاوت اصول موضوعہ کی طرح ایک ناقابلِ بحث اور بالکل تسلیم شدہ واقعہ ہے۔ یہی دور تھا جب دلی کا شاعر یگانہ، میر تقی میرؔ کبھی بھرت پور کے راجہ سورج مل جاٹ کا مہمان بنتا تھا، کبھی لکھنؤ کا رُخ کرتا تھا، اسی زمانہ میں اس کی زبان سے آہِ جگر دوز نے الفاظ کا یہ لباس پہنا تھا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

لیکن کیا مرہٹہ گردی کے طوفانی دور قتل و غارت میں بھی دلی کے مسلمانوں کو اپنے گھر سے ساری پونجی، سارا زر نقد، سارا اثاثہ، کپڑے زیور، برتن تک چھوڑ کر بے سر وسامانی کے عالم میں یونہی نکلنا پڑا تھا؟ کیا سفاک درندہ خو بے رحم اور خون آشام مرہٹوں نے بھی سارے شہر کے مسلمانوں کو کرید کرید کر ان کے گھروں سے نکالا اور پرانے قلعہ میں پہنچا دیا تھا جہاں نہ پانی تھا نہ کھانا، نہ چھت نہ سائبان نانہ سینٹری کا انتظام نہ حفاظت کا بندوبست؟

یہ سچ ہے کہ مرہٹوں نے ایک دفعہ لال قلعہ کے دیوان خاص اور دیوان عام کی نقرئی اور طلائی چھت تک اکھاڑ ڈالی تھی اور اس کے سکے ڈھال لیے تھے۔ لیکن کیا مرہٹوں نے بھی مسلمانوں کو گھر سے بے گھر کر کے عورتوں اور لڑکیوں کے طلائی زیور جو گلے یا ہاتھ میں پڑے رہ گئے تھے جب سونا ۱۲۵ روپے تولہ بک رہا تھا ۲۰۰ روپے تولہ کے حساب سے خرید لیے تھے تاکہ وہ اپنا پیٹ بھر سکیں؟ کیا جواہر لال کے پاس اس کا جواب ہے؟

مولانا آزاد نے اس تاریخی واقعہ کے علاوہ اور بھی کئی تاریخی واقعات نظرانداز کر دیے ہیں۔

دلی میونسپلٹی کے ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر عثمانی گاندھی جی کی اپیل سے متاثر ہو کر شہر کے

ہندوؤں کو تعفن، گندگی اور متوقع وبا سے بچانے کے لیے اپنا عملہ لے کر نکلے تاکہ مسلمانوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگا دیں۔ گلیوں، کوچوں اور سڑکوں کو غلاظت کے انبار سے پاک کر دیں اور عین اس مصروفیت کے عالم میں بیچ سڑک چھرا گھونپ کر انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ بہت سی سڑی بسی اور متعفن لاشوں کے ہجوم میں ایک تازہ لاش کا اضافہ کر دیا گیا۔ کیا جواہر لال کچھ کر سکے؟

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تقدیر کو رو آئے

ملک شام پر تاتاریوں نے یورش کی اور ایک مرتبہ تو قرامطہ کی سازش کامیاب ہو گئی اور تاتاریوں نے ایک وسیع علاقہ پر قبضہ بھی کر لیا اور بہت سے شہریوں کو گرفتار کر لیا۔ شاہِ تاتار کے پاس علامہ ابن تیمیہ پہنچے۔ وہ ان کی جلالت شان سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے فوراً مسلمان اسیروں کی رہائی کا فرمان صادر کر دیا۔ علامہ ابن تیمیہ نے کہا۔ عیسائی اور یہودی قیدیوں کو بھی رہا کیجئے اس نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کو عیسائیوں اور یہودیوں سے کیا مطلب؟ یہ تو اسلام کے دشمن اور مخالف ہیں۔" ابن تیمیہ نے کہا۔

"ہاں! لیکن ہمارے ذمّی ہیں، ہماری امان ہیں، سیاسی طور پر ان میں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں، وہ رہا نہیں ہوتے تو مسلمانوں کی رہائی بھی بے کار ہے۔" آخر کار یہودی اور عیسائی بھی رہا کر دیے گئے۔ دلی کے قتل عام سے صرف بیس دن پہلے جواہر لال نے، ماونٹ بیٹن نے، حکومت ہند نے اور کانگرس نے مسلمانوں کو "امان" دی تھی، ان کی حفاظت جان و مال کا "ذمہ" لیا تھا کیا یہ ذمہ پورا کیا گیا؟

قریب ہے یارو روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

وزیرِ داخلہ اور وزیر اطلاعات و نشریات کی حیثیت سے اپنی سخت طبعی اور درشت مزاجی کے باعث پٹیل نے اتنی دہشت حاصل کر لی تھی کہ کمزور فطرت کے سرکاری ملازمین نے اپنا ظاہر بدل لیا تھا، مجھے آل انڈیا ریڈیو کے بمبئی اسٹیشن کے ڈائرکٹر مسٹر ذوالفقار علی بخاری کا واقعہ نہیں بھولتا، تقسیم ہند سے ذرا پہلے عارضی

حکومت کے دوران میں جو پہلی عید ہوئی اس موقعہ پر صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں حسبِ معمول اجتماعِ عید ہوا۔ جس میں شہر کے معززین شریک ہوئے ان میں ذوالفقار علی بخاری بھی تھے۔ اتنے موٹے کھدر کے سوٹ میں ملبوس گر گوان کی پیشانی عرقِ ندامت سے خالی تھی، لیکن دیکھنے والوں میں سے کئی ایک کو پسینہ آگیا۔

پردہ گرتا ہے

چند آنسو

گاندھی جی کا حادثۂ قتل ایک دَور کا اختتام ہے۔ آج بھی میں اسے فراموش نہیں کر سکتا کہ کتنے افسوسناک طریقہ پر ہندوستان کی سب سے بڑی شخصیت کی جان بچانے میں ہم ناکام رہے۔ حادثۂ بم کے بعد قدرتاً یہ توقع تھی کہ دہلی کی پولیس اور سی آئی ڈی ان کی حفاظت کا خاص حفاظتی بندوبست کرتی ہے، بلکہ اگر کسی کو دھمکی کے خطوط وصول ہوں، تو بھی پولیس ہوشیار ہو جاتی ہے۔ گاندھی جی کے پاس نہ صرف خطوط اور پمفلٹ آتے، نہ صرف انہیں علانیہ قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں بلکہ ایک بم بھی پھینکا گیا۔ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی شخصیت کی موت و زندگی کا سوال تھا لیکن موثر قدم نہیں اٹھایا گیا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس طرح کا احتیاطی اقدام مشکل تھا۔ گاندھی جی کی ارتھنا کی مجلسیں کھلے میدان میں نہیں بلکہ برلا ہاؤس کے لان میں ہوتی تھیں، یہ ایسا مقام ہے جسے تمام اطراف سے بلند و بالا دیواریں گھیرے ہوئے ہیں، دروازے کے علاوہ داخلہ کا کوئی راستہ نہیں، پولیس کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ آنے جانے والوں کی نگہداشت رکھتی۔

گاندھی جی کا قتل

اس المیہ کے واقع ہونے کے بعد حاضرین کی شہادت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ قاتل مشتبہ طریقہ پر اندر داخل ہوا۔ اس کے حرکات و سکنات اور الفاظ اس طرح کے تھے کہ پولیس اسے زیرِ نگرانی رکھ سکتی

تھی اور پولیس کو ایسا کرنا بھی چاہیے تھا، اگر پولیس نے کوئی قدم اٹھایا ہوتا تو وہ بڑی آسانی سے پکڑ کر نہتا کر دیا جاتا۔ بغیر کسی روک ٹوک کے ریوالور لیے ہوئے آیا۔ گاندھی جی جب پرارتھنا کے جلسہ میں پہنچے وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اس نے گاندھی جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تمہاری زندگی کا یہ آخری دن ہے، گاندھی جی نے جواب دیا ہاں! قبل اس کے کہ وہ دوسرا لفظ کہیں تابڑ توڑ تین گولیاں ان کے نحیف و ناتواں جسم کو چیرتی ہوئی نکل گئیں اس طرح قاتل نے ان کی قیمتی زندگی ختم کر دی۔

پٹیل پر الزام یہ المیہ جب وقوع پذیر ہوا تو غم و غصہ کی لہر کا اُٹھنا ایک قدرتی واقعہ تھا۔ کچھ لوگوں نے علانیہ سردار پٹیل کو نااہلیت کا ملزم گردانا۔ جے پرکاش نرائن نے اس مسئلہ کو اٹھا کر بڑی ہمت کا ثبوت دیا۔ گاندھی جی کی موت پر اظہار رنج و الم کے لیے دہلی میں جو جلسہ منعقد ہوا تھا اس میں تقریر کرتے ہوئے جے پرکاش نرائن نے صاف الفاظ میں کہا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کا وزیر داخلہ اس قاتلانہ حملہ کی ذمہ داری سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔ انہوں نے سردار پٹیل سے جواب طلب کیا جبکہ گاندھی جی کے قتل پر علانیہ لوگوں کو اُکسایا جا رہا تھا اور اس سے پہلے ان پر باقاعدہ بم پھینکا جا چکا تھا تو پٹیل نے کوئی احتیاطی قدم کیوں نہیں اُٹھایا۔

ذمہ داری پٹیل پر کلکتہ کے مسٹر پرفلا چندر گھوش نے بھی یہ سوال اٹھایا۔ انہوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی ملامت کی کہ وہ گاندھی جی کی جان بچانے میں ناکام رہی۔ انہوں نے کہا کہ سردار پٹیل ایک مضبوط اور کارگزار وزیر داخلہ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اس الزام کا ان کے پاس کیا جواب ہے کہ گاندھی جی کی جان بچانے کے لیے انہوں نے کوئی احتیاطی قدم کیوں نہ اُٹھایا۔

سردار پٹیل کا بیان سردار پٹیل نے اپنے مخصوص انداز میں یہ الزامات سہے، کوئی شبہ نہیں کہ اس حادثہ سے وہ بہت متاثر تھے لیکن اس بات پر خفا بھی تھے کہ لوگ انہیں کیوں ملزم گردان رہے ہیں؟ جب کانگرس پارلیمنٹری پارٹی کا اجلاس ہوا تو انہوں نے کہا کہ ان کے خلاف اس طرح کے الزامات لگا کر کانگرس کے دشمن اس تنظیم میں افتراق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے گاندھی جی سے اپنی وفاداری کا اعادہ کیا اور کہا، پارٹی کو ان الزامات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ مضبوطی کے

ساتھ متحد ہو کر اس صورت حال کا مقابلہ کرنا چاہیے جو گاندھی جی کی موت سے پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی اپیل رائیگاں نہیں گئی، کانگریس پارٹی کے بہت سے ممبروں نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ان کے ساتھ ہیں۔"

تقریب قتل پر شیرینی کی تقسیم مجموعی حیثیت سے سارا ملک گاندھی جی کے قتل سے غمزدہ تھا لیکن بعض شہروں میں گاندھی جی کے حادثۂ قتل کی تقریب پر مٹھائی تقسیم ہوئی اور جشن منایا گیا۔ گوالیار اور اجین میں خاص طور پر۔"

گاندھی جی کا قاتل ہیرو بن گیا گاندھی جی کے قاتل گوڈسے پر مقدمہ چلایا گیا۔ گوڈسے کی گرفتاری پر پبلک کا رد عمل اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہندوستانیوں کے ایک طبقہ پر فرقہ وارانہ زہر کس طرح اثر کر چکا تھا۔ بعض معزز خاندانوں کی خواتین نے اپنے ہاتھ سے سوئیٹر بن کر گوڈسے کو بھیجا، اس کی رہائی کے لیے ایک تحریک بھی اٹھی، اس کے حامی علانیہ طور پر اس کے اقدام کو سراہ نہیں سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے کہنا شروع کیا کہ گاندھی جی چونکہ عقیدۂ عدم تشدد کے پرستار تھے لہٰذا ان کے قاتل کو پھانسی نہیں ملنی چاہیے۔ جواہر لال کے پاس اور میرے پاس اس مضمون کے بہت سے تار آئے کہ گوڈسے کو پھانسی دینا گاندھی جی کے اصولوں کے خلاف ہے۔ قانون بہر حال اپنا راستہ چلتا رہا، ہائی کورٹ نے اس کی سزا یابی کی توثیق کر دی۔

آزادئ ہند کی قیمت ہندوستان نے آزادی حاصل کر لی لیکن اپنی وحدت قربان کر دی۔

پاکستان کی نئی حکومت جب بنی تو اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آیا جن کی خدمت اور قربانی کی فہرست بالکل سادہ تھی، پاکستان کے متعدد حکمران خود غرض تھے پبلک لائف میں صرف اپنے مفاد کے لیے آتے تھے۔ (۱)

پاکستان کی نئی حکومت پاکستان کی نئی حکومت کے رہنماؤں کی اکثریت یو پی، بہار اور بمبئی سے آئی تھی۔ یہ لوگ ان علاقوں [illegible] میں بات بھی نہیں کر سکتے تھے جن سے پاکستان مرکب تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاکم

اور محکوم کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو گئی ۔ یہ خود ساختہ لیڈر اس خوف میں مبتلا تھے کہ اگر آزادانہ انتخابات منعقد ہوئے تو ان میں سے اکثر منتخب نہیں ہو سکیں گے لہٰذا انہوں نے جب تک ممکن ہوا انتخابات کو ملتوی کرنا شروع کر دیا تاکہ اپنی قسمت سنوار سکیں اور زیادہ سے زیادہ مدت تک اقتدار کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھیں ۔ دس سال کی مدت گذر چکی ہے اور اب جا کر کہیں دستور بن پایا ہے اور یہ بھی حرف آخر نہیں نظر آتا بار بار اس میں تبدیلیوں کی کوشش ہوتی رہتی ہے ، کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ نئے دستور کے ماتحت پہلا انتخاب کب ہوگا ؟ اور ہوگا بھی یا نہیں ؟ (۲)

اسلام ناکام رہا

مسٹر جناح اور ان کے متبعین نے یہ محسوس نہیں کیا کہ جغرافیہ اُن کے خلاف ہے ۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں کوئی باہمی ربط نہیں ہے ان دونوں علاقوں کے مسلمان ہر اعتبار سے مذہب کے سوا ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں ، اس سے بڑا فریب اور کیا ہو سکتا ہے کہ کہا جائے کہ مذہبی ربط ان علاقوں کو متحد کر دے گا جو جغرافیائی ، اقتصادی ، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں ، یہ صحیح ہے کہ اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جو نسلی ، لسانی ، اقتصادی اور سیاسی سرحدوں سے ماورا ہو ، تاریخ گواہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک صدی گزر جانے کے بعد مسلم ممالک کو صرف اسلام کی بنیاد پر وحدت کے رشتہ میں پرونے کا کام اسلام انجام نہیں دے سکا ۔ (۲)

پاکستان ایک قوم نہیں بن سکتا

یہ تھی پوزیشن ماضی میں ! اور یہ ہے پوزیشن آج !

کوئی شخص بھی یہ توقع نہیں کر سکتا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے مسلمان اپنے اختلافات ختم کر کے ایک قوم بن جائیں گے ، صرف مغربی پاکستان میں تین صوبے ، سندھ ، پنجاب اور سرحد ایک دوسرے کے مفاد کے خلاف برسر کار اور ایک دوسرے سے بالکل متضاد اور متباین مقاصد کے حامل ہیں ، بہر حال جو ہونا تھا ہو چکا ، پاکستان کی نئی حکومت ایک حقیقت ہے ، ہندوستان اور پاکستان دونوں کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آپس میں دوستانہ روابط استوار کریں اور ایک دوسرے سے اشتراک و تعاون کریں ، اس کے خلاف جو قدم بھی اٹھے گا وہ ہولناک مصیبت ، تباہی اور بدبختی

کا پیش خیمہ ہوگا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جو کچھ ہوا وہ ناگزیر تھا بعض دوسرے لوگ اسی شدومد کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ ہوا غلط تھا اور اس سے احتراز ممکن تھا آج یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں میں سے کس کا اندازہ صحیح تھا، صرف تاریخ ہی اس کا فیصلہ کرے گی کہ آیا تقسیم قبول کرکے واقعی ہم نے دانشمندانہ اور صحیح قدم اٹھایا ہے۔(۴)

(ص: ۲۲٬۲۷، ۲۵، ۲۴٬۲۴، ۲۲۳)

یہ مولانا کی کتاب کا آخری باب ہے:

اس باب میں مولانا نے جو تاثرات ظاہر فرمائے ہیں وہ زیادہ تر ذاتی ہیں لیکن ان میں جہاں کہیں صفاتی رنگ آگیا ہے اس پر گفتگو ناگزیر ہے۔"

(ا)

پاکستان کی پہلی وزارت مشتمل تھی، لیاقت علی خاں، چندریگر، نشتر، فضل الرحمٰن، وغیرہ پر یہ سب عوامی آدمی تھے، ان کی خدمات اور قربانیوں کا ہر پاکستانی کو دل سے اعتراف تھا، مولانا اگر ان کی خدمات اور قربانیوں سے ناواقف ہیں تو ہمدردی کے مستحق ہیں۔

پاکستان کی نئی حکومت کے رہنماؤں کی اکثریت کو یوپی، بہار اور بمبئی کے لوگوں پر مشتمل بتانا غلط بیانی کا شاہکار ہے۔

اس نئی حکومت میں لیاقت علی اور چندریگر کے سوا اور کون سا شخص یوپی، بہار، یا بمبئی کا تھا؟ تقریباً ایک درجن آدمیوں کی کابینہ میں دو آدمی مہاجر ہوں تو اکثریت کہلائیں گے؟

پھر اس "نام نہاد" "اکثریت" پر الزام لگانا کہ یہ لوگ ان علاقوں کی زبان میں بات بھی نہیں کرسکتے تھے جن سے پاکستان مرکب تھا، کیسی جسارت انگیز غلط بیانی ہے۔

اوّل تو یہ الزام سرے سے غلط ہے۔ پاکستان کابینہ کی غیر معمولی اکثریت خالص پنجابی، بنگالی، سندھی اور سرحدی اصحاب پر مشتمل تھی، لیکن اگر ایسا نہ ہوتا اور واقعی یہ اکثریت یوپی، بہار اور بمبئی کے اصحاب پر مشتمل ہوتی تو بھی کیا قباحت ہوتی ہو

مرکزی حکومت میں ہر صوبہ کے لوگ ہوتے ہیں اور وہ عام سرکاری زبان سے واقف ہوتے ہیں لیکن ہر زبان سے واقف ہوں جو قطعاً ضروری نہیں ؟ مولانا آزاد جس کابینہ کے رکن تھے اس کے ارکان کا کیا حال ہے ؟

کیا مولانا آزاد گجراتی جانتے تھے ؟

کیا پنڈت نہرو مرہٹی سے واقف ہیں ؟

کیا مرارجی ڈیسائی تلگو میں بول سکتے ہیں ؟

کیا پٹیل صاحب ملیالم میں گہرافشانی پر قادر تھے ؟

کیا گوبند ولبھ پنت پنجابی میں نطق گوہر بار کو جنبش دے سکتے ہیں ؟

کیا راجندر پرشاد بنگالی میں اظہار خیال پر قادر ہیں ؟

کیا ڈاکٹر کاٹجو کرکی زبان بولنا تو بڑی چیز ہے سمجھ بھی سکتے ہیں ؟

کیا مسٹر گیڈگل اڑیہ میں کلام کر سکتے ہیں ؟

کیا لال بہادر شاستری ناگاؤں سے گفتگو پر قادر ہیں ؟

پھر ان سب پر مرکزی کابینہ کا دروازہ کیوں کھل گیا ؟

(۲)

انتخابات میں تاخیر کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ بعض نئے اور ناقابل عبور مشکلات حل کرنا تھے جن سے ہندوستان دوچار نہیں تھا اور ایسے حالات میں انتخابات موخر ہو ہی جاتے ہیں۔ خود مولانا ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک صدر رہے اور ہندوستان کی قومی پارلیمنٹ "کانگرس" کوئی انتخاب مسلسل سات سال نہ کرا سکی۔ یہ ہمارے اس دعوے کا ثبوت ہے۔

(۳)

اس باب کا سب سے زیادہ تکلیف دہ اور افسوسناک حصہ یہی ہے۔

مولانا بھی مولانا حسین احمد کی طرح اس کے قائل ہیں کہ ملتیں اوطان سے بنتی ہیں جواب میں وہی کہا جا سکتا ہے جو اقبال نے حسین احمد سے کہا تھا۔

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

کتنی عجیب بات ہے مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد کو عالم دین ہونے کی حیثیت

ہے جس فکر دینی کا علمبردار ہونا چاہیے اس کی تبلیغ اقبال اور جناح کے حصہ میں آئی ہے۔

قائل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

مولانا نے اتنا بڑا دعویٰ کرتے وقت یہ نہ سوچا کہ اگر مشرقی اور مغربی پاکستان میں کوئی باہمی ربط نہ ہوتا تو پاکستان بنتا کیسے؟ پھر پاکستان بننے کے بعد وہ ربط کیسے فنا ہو سکتا ہے؟

اسلام کی ناکامی کا جو مرثیہ مولانا نے پڑھا ہے وہ بھی تاریخ کا ایک عبرت انگیز باب ہے۔
مولانا تحریکِ خلافت کے زعیم کبیر رہ چکے ہیں، اس سلسلہ میں وہ ”امام الہند“ بھی بنے تھے۔ اگر جغرافیہ واقعی اتنی افتراق انگیز چیز ہے اور مذہبی ربط کوئی چیز نہیں اور اسلام کی بنیاد پر مسلم ممالک کو متحد کرنے میں اسلام ناکام رہا ہے تو اسلام کی ناکامی سے زیادہ مولانا کو اپنی گزشتہ زندگی پر ماتم کرنا چاہیے تھا۔ کیا وہ مولانا ہی نہیں تھے جنہوں نے طرابلس کے شہیدوں پر الہلال کے صفِ ماتم بچھا کر اسلامی ہند میں آگ لگا دی تھی؟ کیا وہ مولانا کا الہلال ہی نہیں تھا جس نے عراق کے حادثہ پر ”مشہدِ اکبر“ کے عنوان سے وہ مقالہ شائع کیا تھا جس نے ایوانِ فرنگ میں زلزلہ ڈال دیا تھا؟ کیا وہ مولانا ہی نہیں تھے جو خلافتِ عثمانیہ کے بقا و تحفظ کے لیے بار بار جیل گئے؟

اگر اسلام اتنا ہی ناکام تھا، اگر جغرافیہ واقعۃً ایسی ہی چیز ہے تو وہ بنیاد منہدم ہو جاتی ہے جس نے مولانا کو اس رتبۂ بلند تک پہنچا دیا۔

(۴)

پاکستان کی اندرونی سیاست پر مولانا نے جو تبصرہ کیا ہے یہ انہیں زیب نہیں دیتا تھا اس لیے کہ یہ تبصرہ صرف مزعومات اور مفروضات پر مبنی ہے۔

باقی رہا ہندوستان اور پاکستان کا آپس میں دوستانہ روابط رکھنا، تو جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، وہ ہمیشہ اس کا متمنی رہا ہے۔ اس راستہ میں کانٹے ہندوستان ہی کی طرف سے بچھائے گئے، رکاوٹیں پنڈت جی نے ڈالیں۔

آج بھی اگر وہ معاملہ فہمی پر آمادہ ہوں تو ساری مشکلیں آن کی آن میں ختم ہو سکتی ہیں لہذا مولانا کی یہ نصیحت پاکستان سے زیادہ ہندوستان کے لیے ہے۔
رہا پاکستان کے وجود کا صحیح یا غلط ہونا تو واقعی اس کا صحیح فیصلہ تاریخ ہی کر سکتی ہے اور بہتر ہے کہ یہ اسی پر چھوڑ دیا جائے۔

آزادیٔ ہند کا البم

چند تصویریں

◎

بترتیب حروفِ تہجّی

اپنی جھلک

گرفتاری کی اطلاع

(۸ اگست ۱۹۴۲ء، بمبئی)

بمبئی کے دوران قیام میں عام طور پر بھولا بھائی ڈیسائی کے ہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ اس موقعہ پر (ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی) کے اجلاس کے موقع پر وہیں ٹھہرا، بھولا بھائی بیمار تھے، گزشتہ کچھ عرصے سے ان کی طبیعت ناساز چلی آرہی تھی، مجھے حیرت ہوئی جب جلسے سے واپسی پر میں نے انہیں اپنا منتظر پایا، کافی رات گزر چکی تھی۔ میں نے چاہا وہ جاکر آرام کریں، انہوں نے بتایا کہ میرے ایک عزیز محمد طاہر کو اس کے ایک دوست نے جو پولیس میں ہے اطلاع دی ہے کہ تمام کانگریسی لیڈر علی الصبح گرفتار کر لیے جائیں گے۔

بھولا بھائی بہت پریشان تھے اور یہی خبر سنانے کے لیے میرے منتظر تھے میں تکان سے چور ہو رہا تھا اور اس طرح کی افواہوں پر کان دھرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بھولا بھائی سے کہا، اگر یہ خبر درست ہے تو میرے پاس آزادی کے صرف چند گھنٹے رہ جاتے ہیں، کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ جلدی سے کھانا کھاؤں اور فوراً سو جاؤں تاکہ صبح تازہ دم ہو کر حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھوں؟ بھولا بھائی راضی ہو گئے اور میں بستر پر جا کر دراز ہو گیا۔

(ص ۸۳)

گرفتاری کا منظر میں عام طور پر صبح تڑکے بیدار ہونے کا عادی ہوں، آج بھی (۷ اگست ۴۲ء) ٹھیک چار بجے بیدار ہو گیا لیکن تھکان اب تک باقی تھی، سر بوجھل ہو رہا تھا، دو ٹکیاں اسپرین کی استعمال کیں اور ایک پیالی چائے پی اور کام پر بیٹھ گیا یا اس لیے کہ اسپرین کا اثر تھا اس لیے کہ تھکان بہت تھی پھر سو گیا۔

مشکل سے پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے محسوس کیا کوئی شخص میرے پاؤں چھو رہا ہے، آنکھ کھولی تو دیکھا، دھیرو بھائی ڈیسائی بھولا بھائی کے بیٹے ایک سفید کاغذ ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں، میں فوراً سمجھ گیا، یہ وارنٹ گرفتاری ہے دھیرو نے کہا، ڈپٹی کمشنر برآمدہ میں کھڑا ہے، میں نے کہا اس سے کہہ دو مجھے تیار ہونے میں ذرا دیر لگے گی۔

میں نے غسل کیا، لباس تبدیل کیا، اپنے پرائیویٹ سیکرٹری اجمل خاں کو ضروری ہدایات دیں، پھر برآمدہ میں پہنچ گیا، بھولا بھائی اور ان کی بہو، ڈپٹی کمشنر سے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے بھولا بھائی کو دیکھا اور کہا۔

"آپ کے دوست جو خبر کل شام کو لائے تھے وہ درست نکلی"

پھر میں ڈپٹی کمشنر کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں تیار ہوں!"

اب صبح کے پانچ بج چکے تھے۔

اطمینان اور سکون (بمبئی اسٹیشن پر) ایک یورپین ملٹری افیسر ہمارے پاس آیا اور دریافت کیا، ہم چائے پئیں گے؟ میں اگرچہ صبح صبح پی چکا تھا لیکن ایک کپ اور لانے کا آرڈر دے دیا۔

(ص: ۸۵)

گرفتاری کا زندہ دلی کے ساتھ خیر مقدم (بمبئی اسٹیشن) ایک ملٹری آفیسر نے ہمیں گننا شروع کیا، نہ جانے کیا بات تھی، کئی بار شمار کرنے کے بعد بھی وہ مطمئن نہیں ہوا، ہمارے کمپارٹمنٹ میں پہنچ کر اس نے زور سے کہا،

"تیس نفر!"

دو یا تین مرتبہ جب وہ یہی الفاظ دہرائے گیا تو میں نے بھی اسی طرح چیخ کر کہا۔

"بتیس!"

یہ سن کر وہ پھر چکر میں پڑ گیا اور از سر نو شمار کرنے لگا۔

(ص: ۸۵)

قیدی کا فرمان

قلعہ احمد نگر کی جیل میں ہمیں لوہے کے برتنوں میں کھانا دیا گیا۔ ہیں نے جیلر سے کہا، ہم چینی کی پلیٹوں میں کھانے کے عادی ہیں، جیلر نے معافی مانگی اور چینی کے برتن مہیا کر دینے کا وعدہ کر لیا۔

(ص: ۸۸)

طبّی معائنہ سے انکار

۳ راگست ۱۹۴۲ء کو جب میں کلکتہ سے بمبئی روانہ ہوا تھا انفلوئنزا میں مبتلا تھا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس کے دوران میں بھی یہی کیفیت رہی۔ گورنمنٹ اس حقیقت سے واقف تھی۔ انسپکٹر جنرل جو ڈاکٹر بھی تھا، میرا طبی معائنہ کرنے کے لیے آیا۔ میں نے انکار کر دیا۔

(ص: ۸۹)

زندہ دل قیدی

قلعہ احمد نگر کی جیل میں ہمارے پہنچنے کے پانچ چھ دن بعد ایک افسر جیل کا سپرنٹنڈنٹ بن کر آیا، تاکہ ہماری دیکھ بھال کرے ہمیں اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ غور و فکر کے بعد طے پایا کہ اس کا کوئی نام رکھنا چاہیے۔ مجھے یاد آیا کہ جب چاند بی بی قلعہ احمد نگر کی اسی جیل میں نظر بند تھی تو اس کا داروغۂ زندان ایک حبشی تھا جس کا نام چیتا خاں تھا، میں نے تجویز پیش کی کہ ہم اپنے سپرنٹنڈنٹ کا بھی نام کیوں نہ رکھیں؟ میرے رفقا نے گرمجوشی سے تائید کی۔ یہ نام ایسا چل پڑا کہ جیل کے سب لوگ اسے چیتا خاں کہنے لگے۔

(ص: ۸۹)

(اپریل ۱۹۴۳ء بیگم ابوالکلام کا انتقال ہو چکا ہے)

بہن کا انتقال

مہینے کے بعد قسمت نے مجھے غم کا ایک اور تحفہ دیا، میری بہن آبرو بیگم جو بھوپال میں رہتی تھیں، دو ہفتے کے بعد مجھے

اطلاع ملی کہ وہ بھی اس جہان سے رخصت ہو گئیں۔"

(ص: ۹۲)

وزارت قبول کرنے سے انکار

(مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے مرکز میں عارضی حکومت قائم کرنے کی دعوت وائسرائے نے جواہر لال کو دی ہے، اگست ۱۹۴۶ء)

"میرے رفقاء نے بہت زور دیا کہ میں عارضی حکومت میں شامل ہو جاؤں، گاندھی جی کی رائے بھی یہی تھی، کامل احتیاط کے ساتھ غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے کابینہ سے باہر رہنا چاہیے۔ میرے بہت سے دوستوں کی یہ رائے تھی اور اب بھی ہے کہ میرا یہ فیصلہ غلط تھا ان کا خیال تھا کہ ملکی مفاد کا تقاضا اور جن حالات سے ہم گزر رہے تھے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ میں وزارت قبول کر لیتا اب میں محسوس کرتا ہوں کہ شاید میرا فیصلہ صحیح نہیں تھا ممکن تھا کہ میں ملک کی زیادہ خدمت کر سکتا، اگر میں نے وزارت قبول کر لی ہوتی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ میں باہر رہ کر زیادہ بہتر طور پر ملک کی خدمت کر سکوں گا لیکن اب محسوس کرتا ہوں کہ شاید یہ وزارت قبول کرنے کے بعد خدمت کا زیادہ موقع ملتا۔

(ص: ۱۶۳)

دستور ساز اسمبلی کی صدارت سے انکار

(کانگرس کی پیمان شکنی کے باعث مسلم لیگ عارضی حکومت میں شریک ہونے کے باوجود دستور ساز اسمبلی میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ کانگرس اپنی عہد شکنی پر قائم رہتے ہوئے دستور ساز اسمبلی کی کارروائی لیگ کے بغیر جاری رکھنے کا فیصلہ کر چکی ہے)

۱۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو دستور ساز اسمبلی کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ صدر کسے منتخب کیا جائے؟ جواہر لال اور سردار پٹیل کی رائے تھی، کوئی ایسا شخص صدر بنایا جائے جو وزیر نہ ہو، دونوں نے مجھے یہ عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا لیکن میں رضامند نہ ہوا، پھر کئی اور نام زیر بحث آئے لیکن کسی نام پر اتفاق نہ ہو سکا، آخر کار ڈاکٹر راجندر پرشاد چن لیے گئے، اگرچہ وہ وزیر حکومت تھے۔ یہ انتخاب بہت

خوش آئند ثابت ہوا کیونکہ صدارت کے فرائض انہوں نے نہایت امتیاز کے ساتھ ادا کیے
بہت سے نازک مسائل پر انہوں نے قیمتی مشورے دیے۔

(ص : ۱۷۴)

[illegible] کی خوبی کا اعتراف

(لارڈ ویول وائسرائے ہند اور مسٹر اٹیلی وزیر اعظم برطانیہ کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے

[illegible] ہندو مسلم تصفیہ کے بعد انتخابی اختیارات کی تاریخ مقرر کرنا چاہتے ہیں لارڈ ویول کہتے ہیں کہ اس خلفشار کی حالت میں اگر اختیارات منتقل کر دیے گئے تو خونریزی اور بد نظمی کی ساری ذمہ داری برطانیہ پر عائد ہوگی جسے تاریخ کبھی معاف نہ کرے گی۔ مسٹر اٹیلی جب لارڈ ویول کی بات نہیں مانتے تو وہ استعفیٰ دے دیتے ہیں)

دس سال گزر جانے کے بعد اب جو واقعات پر نظر کرتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ لارڈ ویول اور مسٹر اٹیلی میں کس کی رائے درست تھی؟ حالات اتنے پیچیدہ تھے کہ کوئی واضح فیصلہ کرنا آج بھی آسان نہیں۔ مسٹر اٹیلی کا فیصلہ ان کے اس عزم کا آئینہ دار تھا کہ ہندوستان کو آزاد ہونا چاہیے۔ جس شخص میں ذرا بھی شہنشاہیت پسندانہ رجحان ہوتا وہ ہندوستان کی کمزوری سے ضرور فائدہ اٹھاتا۔ انگریز اگر چاہتے تو ہندوستانی اختلافات کی آڑ لے کر مزید کچھ عرصہ تک حکومت کر سکتے تھے۔ ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ فرانسیسیوں نے دس سال تک ہند چینی میں اپنی حکومت قائم رکھی، حالانکہ فرانس، برطانیہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کمزور تھا۔ لیکن انگریزوں نے ہندوستان کی کمزوری کی آڑ لے کر فائدہ نہیں اٹھایا۔ تاریخ انہیں عزت کے ساتھ یاد رکھے گی اور ہم بھی بغیر کسی ذہنی تحفظ کے اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

(ص ۷۷ ، ۱۷۸)

تقسیم ہند کی تجویز

۱۴ رجون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بہت سے جلسوں میں شریک ہو چکا ہوں لیکن اس عجیب جلسے میں کاش شریک نہ ہوا ہوتا۔ کانگرس جس نے ہمیشہ ہندوستان کی آزادی اور وحدت کے لیے لڑائی جاری رکھی تھی، آج تقسیم ہند

کے ریزولیوشن پر غور کر رہی تھی۔ پنڈت گوبند ولبھ پنتھ نے ریزولیوشن پیش کیا۔ پھر سردار پٹیل اور جواہر لال بولے، بعد میں گاندھی جی نے لب کشائی کی۔

سب سے بڑا المیہ

کانگرس کی طرف سے اتنے ذلیل طریقے پر ہتھیار ڈال دینے کا منظر برداشت کر لینا میرے بس سے باہر تھا۔ اپنی تقریر میں میں نے صاف طور پر کہا کہ جس فیصلے پر ورکنگ کمیٹی پہنچی ہے۔ وہ نہایت افسوسناک حالات کا نتیجہ ہے۔ تقسیم ہندوستان کے لیے سب سے بڑا المیہ ہے اور اس کی تائید میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے یہ ہے کہ ہم نے اپنے مقدور بھر تقسیم سے بچنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ بہرحال ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ قوم ایک ہے اس کی تہذیبی زندگی ایک ہے اور ایک رہے گی، سیاسی طور پر ہم ناکام ہوئے اور اسی لیے تقسیم ملک پر مجبور ہو گئے ہمیں اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ عہد بھی کر لینا چاہیے کہ ہماری تہذیب تقسیم نہیں ہوئی۔ اگر ہم پانی کو ایک چھڑی سے ہلائیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ پانی تقسیم ہو گیا لیکن وہ تقسیم نہیں ہوتا، چھڑی جیسے ہی ہٹائی جائے گی تقسیم کے اثرات فوراً زائل ہو جائیں گے۔

سردار پٹیل بگڑ بیٹھے

سردار پٹیل کو میری تقریر پسند نہ آئی، ان کی ساری تقریر میری تقریر کا جواب تھی۔ انہوں نے کہا تقسیم ملک کا ریزولیوشن جبر یا کمزوری کا نتیجہ نہیں بلکہ ہندوستان کے موجودہ حالات کا بہترین حل یہی ہے۔

کانگرسی کارناموں کی نفی کانگرسیوں کے ہاتھوں

پہلے دن کے مباحثے کے بعد ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن کے خلاف آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ممبروں سے بڑا جوش پایا جاتا تھا نہ پنڈت پنتھ کی دل موہ لینے والی تقریر کام آئی نہ سردار پٹیل کا زور بیان لوگوں کو ریزولیوشن منظور کرنے پر راضی کر سکا۔ اور یہ لوگ کامیاب ہوتے بھی کس طرح جبکہ ان کا تازہ کلام یوم آغاز سے آج تک کے کانگرسی کارناموں کی نفی کر رہا تھا۔ لہٰذا اب گاندھی جی کے لیے ضروری ہوا کہ وہ مباحثہ میں مداخلت کریں، انہوں نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے اپیل کی وہ ورکنگ کمیٹی کی تجویز منظور کر لیں انہوں نے کہا حالات ایسے پیدا کر دیے گئے ہیں کہ تقسیم کے سوا دوسرا چارہ نہیں۔

سیاسی حقیقت پسندی کا مطالبہ یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن پلان منظور کر لیا جائے۔ (۱)

گاندھی جی کی اپیل بھی زیادہ کامیاب نہ ہوئی

ریزولیوشن جب رائے شماری کے لیے پیش ہوا تو انتیس ووٹ حمایت میں اور پندرہ مخالف میں آئے، گویا گاندھی جی تک کی اپیل کانگرس کے زیادہ ممبروں کو تقسیم ملک کی تجویز منظور کرنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ (۲)

کانگرسی لیڈر مسلمانوں سے انتقام لینے کے درپے تھے

بلا شبہ ریزولیوشن منظور ہو گیا، لیکن لوگوں کے دماغ کا کیا عالم تھا؟ ہر دل تقسیم کے خیال سے بوجھل ہو رہا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہوگا جس نے ذہنی تحفظ کے بغیر یہ تجویز منظور کی ہو، انتہا یہ ہے کہ جن لوگوں نے تقسیم کو قبول کر لیا تھا خود ان کے جذبات بھی اس کے خلاف تھے۔ یہ بہت ناروا بات تھی لیکن سب سے زیادہ بدترین چیز وہ فرقہ وارانہ پروپیگنڈا تھا جو جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔ متعدد حلقوں میں علانیہ کہا جا رہا تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہندوستان میں ۴۵ ملین مسلمان موجود ہیں اگر پاکستان میں ہندوؤں پر ذرا بھی ظلم ہوا تو اس کے نتائج ہندوستان کے مسلمانوں کو بھگتنے پڑیں گے۔ (۳)

ہندوؤں کا بدلہ مسلمانانِ ہند سے لیا جائے گا!

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسہ میں سندھ کے ممبروں نے بڑے زور کے ساتھ تقسیم کے ریزولیوشن کی مخالفت کی، ان لوگوں کو ہر طریقے سے مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ پبلک پلیٹ فارم پر نہیں لیکن نجی گفتگو میں انہیں یقین دلایا گیا کہ اگر پاکستان میں انہیں کوئی بھی تکلیف پہنچی تو ہندوستان ہندوستانی مسلمانوں سے اس کا بدلہ ضرور لے گا۔ (۴)

وحشت اور درندگی سے بھرپور تخیل

ان باتوں کا حال جب مجھے معلوم ہوا تو میں دم بخود رہ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ خطرناک جذبہ ہے، اس کے اثرات و نتائج بڑے دور رس اور تکلیف دہ ہوں گے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ تقسیم ہند کی تجویز ہندوستان اور پاکستان نے

اس بنیاد پر منظور کی ہے کہ ایک ملک کی اقلیت دوسرے ملک کی اقلیت کے لیے یرغمال کی حیثیت رکھے گی، یہ تخیل وحشت اور درندگی کا مظہر تھا، بعد کے واقعات نے میرے اس اندیشہ کو صحیح ثابت کیا، خون کی ندیاں تقسیم ہند کے فوراً بعد دونوں ملکوں کی نئی سرحدوں پر بہنے لگیں جو اسی جذبۂ انتقام و یرغمال کا نتیجہ تھیں۔ (۵)

(ص: ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸)

مولانا آزاد کی خود نوشت سے اس باب میں میں نے جو واقعات جمع کیے ہیں، ان سے مولانا آزاد کی شخصیت، کردار اور انداز و اظہار کا ایک دل آویز نقشۂ منظر کے سامنے آجاتا ہے۔ مولانا آزاد کے راستہ کو غلط اور ان کے سیاسی افکار و عقائد سے سخت ترین اختلاف رائے رکھنے کے باوجود جو ان میں آن تھی، شان تھی، وضع تھی، رکھ رکھاؤ تھا، بھاؤ تھا، بانکپن تھا، تمکنت تھی، وقار تھا، اس کے [illegible] انحراف میں بخل سے کام لینا کم از کم میرے لیے تو ممکن نہیں۔

ہر خطیب اور انشا پرداز، مدبّر اور سیاستدان "انا" کے مرض میں گرفتار ہوتا ہے لیکن مولانا کی انانیت سب سے مختلف تھی، دوسروں کا "انا" زیادہ تر رکیک اور متبذل ہوتا ہے خواہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، لیکن مولانا کے "انا" میں ہمالہ کی رفعت تھی، اتنا موٹا اور چوڑا چکلا "انا" صرف مولانا کا حصہ تھا۔ غالب کے سوا اس باب میں ان کا کوئی حریف نہیں اور غالب بھی اس لیے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ ان کی زندگی کا حلقہ محدود تھا، اسی حلقہ میں وہ اپنے "انا" کا ڈنکا بجاتے رہے، لیکن مولانا ادیب بھی تھے، انشا پرداز بھی تھے، صحافی بھی تھے، خطیب بھی تھے۔ عالم دین بھی تھے، سیاستدان بھی تھے، نیشنلزم کے حلقہ میں بھی موجود تھے جہاں ایک سے ایک گرگا گو موجود تھا لیکن وہ ادیبوں کی محفل ہو یا انشا پردازوں کا مجمع، صحافیوں کا تمکنت ہو، یا خطیبوں کی مجلس، سیاست کا پلیٹ فارم ہو یا نیشنلزم کا سفید علمار ہم کی جمعیت ہو یا صوفیائے عظام کا زاویہ ــــــــ اس شخص کا "انا" کہیں بھی امام الہند، رئیس التحریر، اور رب الارباب سے کم پر قناعت نہیں کرتا۔

جس طرح عشق چھپائے نہیں چھپتا اور ذرا سی بے احتیاطی میں معاملہ "پابدستے

دگرے وسعت بدستے دگرے تک آجاتا ہے۔ اسی طرح "انا" نے بھی زمانے کے یگانۂ روزگار لوگوں کے بڑے ڈبوئیے جن کی قابلیت، ذہانت، فراست، علم، فضل، ہر چیز شک و شبہ سے بالاتر تھی "انا" کا یہ وصف تھا کہ استعارہ اور کنارہ سے بے پرواہ وہ مجسم "انا" بن گئے تھے لیکن ان کے اس "انا" میں وہ دل کشی و دلربائی وہ سحر ہے کہ طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ محسن الملک ہوں یا وقار الملک، حالی ہوں یا شبلی موتی لال نہرو ہوں یا گاندھی جی، محمد علی ہوں یا شوکت علی، عمر میں سب سے چھوٹے لیکن "انا" کے پیمانے سے ناپئے تو ——— طلوعِ صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا!"

کانگرس جیسے ادارہ میں جہاں گاندھی جی کی پوجا ہوتی تھی، جہاں موتی لال جواہر لال اور سردار پٹیل کا طوطی بولتا تھا جہاں نیشنلزم کے دعوے کے باوجود مکمل طور پر کمیونلزم (فرقہ پرستی) کی کارفرمائی تھی جہاں محمد علی کا چراغ نہ جل سکا جس نے گاندھی کو گاندھی بنایا تھا جہاں شوکت علی کا بھرم قائم نہ رہ سکا۔ جس کی قوتِ عمل نے کانگرس کو صحیح معنی میں، ہندو مسلم اتحاد کا نشان (SYMBOL) بنا دیا تھا، جہاں بے اجمل خاں جیسے مردِ حکیم و حلیم کو دل برداشتہ ہو کر نکلنا پڑا وہاں ابوالکلام نامی ایک شخص کا اپنے قد آور اور بلند و بالا "انا" سمیت زندگی کی آخری سانس تک موجود رہنا، کانگرس کا نہیں ابوالکلام کا کمال تھا، اپنے اس کمال پر مولانا کو حق ہے کہ وہ ہر شخص سے کہیں،

کہ کس نمی طلبد زتو صلۂ دگر ——— مگر آفریں

ہر سمجھدار شخص پورے انشراحِ قلب کے ساتھ، مولانا کے اس کارنامے پر آفرین کے پھول نچھاور کرنے اور تحسین کے ڈونگرے برسانے پر مجبور ہے۔

یوں تو مولانا کی ساری کتاب مولانا کے "انا" کی منہ بولتی تصویر ہے، لیکن اس باب میں جو واقعات میں نے مختلف ابواب سے چھانٹ کر جمع کیے ہیں، انہیں پیشِ نظر رکھ کر مولانا کے انا کا ایک دل آویز مرقع منظر کے سامنے آجاتا ہے۔

ذرا غور تو کیجئے ایک نہایت نازک زمانہ میں جب انگریز زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ہیں، بغاوت کے الزام میں بمبئی کا ڈپٹی کمشنر وارنٹ گرفتاری

یہ آپ کے درِ دولت پر کھڑا ہے اور اذنِ باریابی طلب کرتا ہے مولانا فرماتے ہیں:

اس سے کہہ دو مجھے تیار ہونے میں ذرا دیر لگے گی!"

پھر نہایت اطمینان سے چائے پیتے ہیں، بعض خطوط مکمل کرتے ہیں، غسل کرتے ہیں، کپڑے بدلتے ہیں اور پھر باہزاراں جاہ و تمکین برآمد ہوتے ہیں۔ اس تکلف سے گویا بت کدہ کا در کھلا اور ڈپٹی کمشنر سے جواب تک کھڑا ہوا تھا اور مولانا کے میزبان سے وقت گزاری کے لیے باتیں کر رہا تھا، فرماتے ہیں:

"میں تیار ہوں!"

ایک نامعلوم منزل کی سمت یہ نو گرفتار لیے جا رہے ہیں۔ اسٹیشن پر چائے کا سوال کیا جاتا ہے، مولانا بے تکلف آرڈر دے دیتے ہیں۔ انگریز سارجنٹ قیدیوں کا شمار کر رہا ہے، مولانا اسے چھیڑ کر حواس باختہ کر دیتے ہیں وہ پھر گننے لگتا ہے، زنداں خانہ قلعہ احمد نگر میں اسیرانِ بلا محبوس ہیں۔ لوہے کے برتنوں میں قیدیوں کو کھانا ملتا ہے۔

مزاج شاہی رکھنے والا قیدی کہتا ہے:

"یہ کیا — ؟ ہم تو چینی کے برتنوں میں کھانے کے عادی ہیں"، جیلر معذرت کرتا ہے اور انداز خسروانہ رکھنے والا زندانی اس معذرت کو قبول کر لیتا ہے۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ ایک انگریز فوجی ہے، مولانا اس کا نام پوچھنے کی زحمت نہیں اٹھاتے ان کا بے مثل حافظہ ان کے سامنے چاند بی بی کی تصویر پیش کر دیتا ہے، وہ بھی اسی قلعہ میں قید تھی، اس کا داروغۂ زنداں ایک حبشی تھا جس کا نام چیتا خاں تھا۔ مولانا اس انگریز کا نام چیتا خاں رکھ دیتے ہیں، اور یہ نام قبولِ عام اور خلعتِ دوام حاصل کر لیتا ہے۔

دیکھیو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

مولانا کی اس جھلک میں کچھ دوسرے لوگ یعنی مولانا کے رفقائے کار بھی ایسے ہیں جن کی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں، ایک نظر ان پر بھی ڈالتے چلیے۔

(۱)

ماؤنٹ بیٹن پلان یعنی تقسیم ہند کا اصول گاندھی جی نے، پٹیل نے، نہرو نے منظور کر لیا لیکن کابینہ اسکیم منظور نہ کر سکے، یہ کیسے محب وطن تھے جنہوں نے اپنی ضد پر ملک کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا گوارا کر لیا، لیکن آپس میں میل ملت قائم رکھ کر ملک کی وحدت قائم نہ رکھ سکے۔ اگر مولانا کا لب و لہجہ ان ساتھیوں اور رفیقوں کا ذکر کرتے ہوئے تلخ ہو جاتا ہے تو یہ عین مقتضائے فطرت ہے۔

(۲)

اہنسا، عدم تشدد اور انسانیت کے علمبرداروں کے منہ سے مولانا نے جب یہ سنا ہوگا کہ ہم ہندوؤں کا بدلہ مسلمانوں سے لیں گے تو ان کے حساس قلب پر کیا کچھ نہ گزر گئی ہوگی؟ اور پھر یہ لوگ کوئی غیر نہیں اپنے تھے۔ کانگرس کے دیرینہ ممبر، مولانا کے کہن سال رفیق طریق، پھر وہ اگر ہم مسلم لیگیوں اور پاکستانیوں کے الفاظ مستعار لے کر فرماتے ہیں کہ کانگرس نے ذہنی تحفظات کے ساتھ تقسیم ہند قبول کی تھی تو کیا غلط کہتے ہیں

(۳)

یہ مولانا کہہ رہے ہیں کہ کہیں اور نہیں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسہ میں پاکستان کے پا بہ رکاب ہندو رہنماؤں کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ ہم تمہارا بدلہ ہندوستان کے لب گور مسلمانوں سے لیں گے۔ ورکنگ کمیٹی کا سینئر ممبر، کانگرس کا سابق صدر یہ سرگوشیاں سن رہا ہے مگر کچھ نہیں کر سکتا، اس کے ساتھی اور رفیق اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ یہی سوچ کر لب و لہجہ نرم کر لیں کہ یہ سابق صدر کانگرس بہر حالت ہیں کانگرس کا ساتھ دینے والا یہ اپنی ملت سے کٹ کر ہماری ہر مصیبت اور دکھ میں حصہ لینے والا بہر حال مسلمان ہے۔

(۴)

یہ غمال و انتقام کے جس فلسفہ پر مولانا کے رفقا غور کر رہے تھے، انہوں نے اس پر عمل بھی کیا۔ اور بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ اس کابینہ وزارت کے ایک ممبر خود مولانا بھی تھے۔ قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو۔

اس سے بڑھ کر غم انگیز واقعہ اور کیا ہو سکتا تھا، مولانا مسلمان تھے اور کانگرس

کے لیے اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنا وجود تک کھو چکے تھے۔ پھر بھی ان کے رفقاءِ کار کی عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ ان کی موجودگی میں، ان کی قوم کے بے گناہ افراد کے لیے انتقام و یرغمال کی اسکیم تیار ہو رہی تھی۔ یہ ستم تو ابراہیم گاردی کے ساتھ مرہٹوں نے بھی نہیں کیا تھا جو کھلم کھلا ہندو مسلم جنگ لڑ رہے تھے۔

---

(۲)

سر اسٹیفرڈ کرپس

والیان ریاست سے کرپس کی غداری "والیان ریاست کے نمائندوں سے گفتگو کرتے وقت سر اسٹیفرڈ کرپس کا رویہ واضح اور بے باکانہ تھا۔ اُنھوں نے مہاراجہ کشمیر سے کہا کہ ریاستوں کا مستقبل ہندوستان کے دامن سے وابستہ ہے، کسی والیٔ ریاست کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اگر اس نے انڈین یونین سے باہر رہنے کا فیصلہ کیا تو تاج برطانیہ اس کی مدد کرے گا لہٰذا والیان ریاست کو اپنے مستقبل کے لیے ہندوستان کی طرف دیکھنا چاہیے نہ کہ برطانیہ کی طرف مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ریاستوں کے بہت سے نمائندے یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے اور انھوں نے سر جھکا لیا۔" (۱) (ص : ۵۹)

کرپس سے راز و نیاز "اگست ۱۹۴۵ء برطانیہ کے نئے انتخابات میں مسٹر چرچل کی قدامت پسند پارٹی کو شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا، اور مسٹر اٹیلی کی لیبر پارٹی نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی اور اس طرح برطانیہ کی عنان اقتدار اس کے ہاتھ میں آگئی۔ سر اسٹیفرڈ کرپس، مسٹر اٹیلی کے دستِ راست اور لیبر پارٹی کے روحِ رواں بنے ہوئے ہیں۔"

"برطانیہ کے عام انتخابات میں لیبر پارٹی کی فتح مندی کا حال جیسے ہی مجھے

معلوم ہوا ہیں نے سر اسٹیفرڈ کو مبارکباد کا ایک پیغام بھیجا۔

کرپس نے میرے تار کا جواب بحری تار سے دیا اور یقین دلایا کہ ہندوستان کو مایوسی سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔" (۲)

(ص : ۱۱۸)

کرپس ہمارے پرانے دوست ہیں (برطانوی حکومت کی طرف سے کابینہ وفد کی آمد کا اعلان ہوا ہے۔ ۱۸ فروری ۴۶ء ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نمائندے سے گفتگو)

میں نے نمائندہ سے کہا کہ لیبر گورنمنٹ نے بڑا مناسب قدم اٹھایا ہے مجھے اس بات کی خاص طور پر خوشی ہے کہ وفد میں سر اسٹیفرڈ کرپس بھی شامل ہیں جو ہمارے پرانے دوست ہیں۔ (۳)

(ص : ۱۳۸)

کرپس کے نام نجی خط مسٹر جے۔ سی گپتا بنگال کے ایک سربرآوردہ کانگرسی رہنما ہیں پہلی دفعہ جب سر اسٹیفرڈ کرپس آئے تھے تو یہ ان کے میزبان تھے مسٹر گپتا نے مجھ سے کہا کہ وہ کرپس سے ملنے دہلی جا رہے ہیں۔ میں نے سر اسٹیفرڈ کے نام ایک خط دیا، جس میں ان کی دوبارہ آمد پر خیر سگالی اور خیر مقدم کے جذبات میں نے اس میں ظاہر کیے تھے۔

(ص ۱۳۹)

کرپس نے عارضی حکومت بنوا دی (نئے صدر کانگرس کی حیثیت سے جواہر لال نے صوبوں کی گروپ بندی کے خلاف بیان دے کر عملاً کابینہ پلان کو مسترد کر دیا ہے۔ مسلم لیگ نے بھی جواہر لال کے اس بیان، وائسرائے کے سکوت اور مسٹر ایٹلی کی خاموشی کے پیش منظر کابینہ پلان مسترد کر کے یوم راست اقدام منانے کا فیصلہ کیا ہے اور عارضی حکومت میں شرکت سے انکار کر کے صورتِ حال پر از سرِ نو غور کرنے کا مطالبہ کیا ہے)

"اس ساری مدت میں سر اسٹیفرڈ کرپس مجھ سے برابر خط و کتابت کرتے رہے میں نے انہیں لکھا کہ لیگ اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے۔ اس کی ذمہ داری لیگ ہی پر ہے،

اس وجہ سے طے شدہ سوال کو از سر نو زیر بحث نہیں لانا چاہیے اگر ایسا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ برطانوی حکومت سے سمجھوتہ اور معاہدہ کبھی بھی قطعی اور آخری صورت اختیار نہیں کر سکے گا۔ نئے عام پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا اور نئے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

سر اسٹیفرڈ کرپس نے جواب دیا کہ وہ پورے طور پر مجھ سے متفق ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ حکومت بھی یہی رویہ اختیار کرے گی، بالآخر حالات نے وہی صورت اختیار کی جس کی مجھے امید تھی۔ ۱۲ راگست ۱۹۴۶ء کو وائسرائے نے ایک کمیونکے شائع کر کے عارضی حکومت کی تشکیل کا کام جواہر لال کو سونپ دیا۔ (۴)

(ص ۱۶۲)

کانگریس کی منطق یہ تھی کہ جو برطانوی حکومت مسلم لیگ کے مطالبات کو مبنی برحق و صداقت سمجھے، وہ حق ناشناس، شہنشاہیت پرست، مردود اور معتوب اور جو برطانوی حکومت کانگریس کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور اس کی اقلیت کش پالیسی پر مہر تصدیق ثبت کر دے، وہ انسانیت دوست، جمہوریت نواز اور حق پرست۔ صوبوں کے گورنر جب تک، اختیارات خصوصی سے کام لے کر اقلیتوں کی حفاظت کرتے رہے۔ وہ سامراج کے نمائندے تھے جب انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد انہوں نے کانگریس کی اقلیت کش پالیسی میں اس سے تعاون کیا تو وہ جنٹلمین بن گئے۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

(۱)

کانگریس اور مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر ذرا انسانیت اور اصول کی کسوٹی پر کرپس کے اس بیان کو لیجئے۔

والیان ریاست برطانیہ کے "فرزند ارجمند" اور "یار وفادار" تھے، انگریزوں نے جو چاہا انہوں نے کہا، ہندوستان کے عوام اور لیڈر انگریزوں سے بگڑ بھی سکتے تھے مگر والیان ریاست اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، حکومت نے ہر موقع پر انہیں استعمال کیا اور انہوں نے گو اپنے ملک کے ساتھ غداری کی لیکن ان کے ساتھ حق وفا

ادا کر دیا۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں جن چند والیان ریاست نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے وہ کچل دیے۔ باقی ماندہ والیان ریاست نے صدق دل سے ان آقایان سفید فام کے پسینہ پر اپنا خون بہایا۔ نظام نے اگر غدر میں انگریزوں کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو بقول الفنسٹن انگریز ختم ہو گئے ہوتے۔ گوالیار نے اگر انگریزوں کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو بندیل کھنڈ اور وسطی ہند میں انگریز ہمیشہ کے لیے فنا ہو گئے ہوتے، رامپور نے اگر انگریزوں کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو اودھ میں انگریزوں کا نشان نہ ملتا، کشمیر نے اگر انگریزوں سے وفاداری نہ برتی ہوتی تو پنجاب میں وہ یوسف بے کارواں بن جاتے۔

اب ہندوستان کی آئینی تبدیلیوں کے وقت انسانیت اور شرافت کا تقاضا یہ تھا کہ بجائے کان پکڑ کے انہیں عدم تشدد کی تلوار کے سامنے بٹھا دینے کے، خود ان کے لیے کوئی اسکیم وضع کرنی چاہیے تھی۔ یہ کیسی دو رُخی پالیسی تھی، ایک طرف حکومت برطانیہ یہ اعلان کر رہی تھی کہ والیان ریاست آزاد ہیں جو چاہیں کریں۔ دوسری طرف اس کا نمائندہ سر کرپس انہیں ڈانٹ رہا تھا، خبردار جو تم نے آزادی کا خیال بھی اپنے دل میں آنے دیا، یہ طرز عمل نہ سیاست کے مطابق تھا نہ تدبر کے!

(۲)

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کانگرس باقاعدہ لیبر حکومت کے وزیروں سے درپردہ سازباز کر رہی تھی ورنہ اس طرح کا تار تو نظام یا گائیکوار بڑودہ نے کبھی چرچل کو نہیں دیا تھا۔

(۳)

سر کرپس کے پرانے دوست ہونے میں کون شبہ کر سکتا تھا؟

لائے اس بُت کو التجا کر کے
کُفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

(۴)

ان چند سطروں میں مولانا نے نہایت بلاغت کے ساتھ کانگرس کی پیمان شکنی اور انگریزوں کی بدعہدی کا مرقع پیش کر دیا ہے۔

صورت حال یہ تھی کہ کابینہ وفد نے اپنے سفارشات پیش کیے، مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے بغیر کسی ترمیم و تغیر کے "مکمل" طور پر یہ منظور کر لیے۔
پھر کانگرس نے گروپ بندی "کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا جو صریحی پیمان شکنی تھی۔ جواب میں مسلم لیگ نے بھی سفارشات مسترد کر دیے۔ کانگرس کی طرف سے مولانا نے کرپس سے فریاد کی، انہوں نے مسلم لیگ کے دلائل رد کر دیے، اور کانگرس کی تحویل میں حکومت دے دی! کیا اسی کا نام انصاف ہے؟ - انگریزوں کو اسی انصاف پر ناز ہے کانگرس کو اسی اصول پرستی پر فخر ہے؟

---

(۳)

مسٹر اٹیلی

(جون ۴۵ء شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد)

مبارکباد کا تار جولائی اور اگست کا مہینہ میں نے گلمرگ کشمیر میں گزارا، ابھی میں وہیں تھا کہ معلوم ہوا کہ برطانیہ کے عام انتخابات میں لیبر پارٹی نے بے نظیر کامیابی حاصل کی ہے، میں نے فوراً مبارکباد کا ایک تار مسٹر اٹیلی کو بھیجا اور اُمید ظاہر کی، اب کہ لیبر پارٹی کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار آ گئی ہے وہ ضرور اپنے وہ عہد پورے کرے گی جو حزب مخالف کی حیثیت سے سالہا سال سے ہندوستان کے ساتھ کرتی آئی ہے۔ (۱)

اٹیلی کی یقین دہانی مسٹر اٹیلی نے کہا کہ لیبر پارٹی ہندوستان کی سیاسی گتھی سلجھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گی۔ (۲)

مجھے یقین تھا کہ لیبر پارٹی ایک نئے زاویہ سے ہندوستان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرے گی۔ میں نتائج کے بارے میں بہت پُراُمید تھا۔ (۳)

(ص ۱۸۹)

(ستمبر ۴۵ء، کانگریس کمیٹی کا جلسہ)

لیبر پارٹی سے اُمیدیں میں نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا لیبر پارٹی کی حکومت بن جانے سے برطانیہ کے طرزِ روش میں

عظیم تبدیلی ہوئی ہے، ہندوستان کے ساتھ لیبر پارٹی کا رویہ ہمیشہ دوستانہ رہا ہے، ہمیں اسے موقع دینا چاہیے کہ وہ اپنا اخلاص ثابت کرے۔

میں نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ شملہ کانفرنس (برطانیہ کی طرف سے) ہندوستانی مسائل کے تصفیہ کی نہایت سنجیدہ کوشش تھی اور اب کہ لیبر پارٹی برسر اقتدار ہے، ہمیں مزید ترقی پسندانہ اقدامات کا برطانیہ کی طرف سے انتظار کرنا چاہیے۔"

(ص: ۱۲۰)

مسٹر اٹیلی کا شاندار بیان

(وزیر اعظم برطانیہ مسٹر اٹیلی ۱۹ار فروری ۱۹۴۶ء کو ہندوستان میں کابینہ وفد بھیجنے کا اعلان کر چکے ہیں)

۱۵ر مارچ ۱۹۴۶ء کو ہندوستان کی صورتِ حالات پر دارالعلوم میں مسٹر اٹیلی نے ایک بیان دیا، یہ اتنا شاندار بیان تھا کہ ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، انہوں نے بغیر کسی ایچ پیچ کے تسلیم کر لیا تھا کہ حالات اب بالکل بدل چکے ہیں، انہیں نئے انداز سے سلجھانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا پرانے طریقوں پر پھر عمل پیرا ہونا تصفیہ کے بجائے تعطل کا موجب ہوگا، اس بات نے ہندوستان پر نہایت خوشگوار اثر ڈالا۔ (۵)

مسٹر اٹیلی کے بیان کے اہم نکات

مسٹر اٹیلی نے اپنے بیان میں جن نکات پر زور دیا تھا، ان میں سے چند خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مسٹر اٹیلی نے تسلیم کیا تھا کہ غلطیاں دونوں طرف سے ہوئیں، لیکن اب ضرورت آگے دیکھنے کی ہے، پیچھے مڑ کر دیکھنے کی نہیں، انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اب موجودہ حالات میں ۱۹۲۰ء ۱۹۳۰ء بلکہ ۱۹۴۲ء تک کے فارمولوں کو آزمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ وہ ہندوستانیوں کے باہمی اختلافات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے کیونکہ ہر طرح کے اختلاف و افتراق کے باوجود تمام ہندوستانی آزادی کے معاملہ میں متحد ہیں، آزادی کا مطالبہ ہر ہندوستانی کا ہے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان سکھ ہو یا مرہٹہ، سیاستدان ہو یا سرکاری ملازم، مسٹر اٹیلی بالفاظ واضح اس کا

اعتراف بھی کیا کہ اب ہندوستان میں قومیت کا تصور غیر معمولی طور پر نشوونما پا چکا ہے، حتیٰ کہ فوجی سپاہیوں تک کے دل میں گھر کر چکا ہے، جنہوں نے جنگ کے زمانے میں شاندار خدمات انجام دیے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ہندوستان میں سماجی اور اقتصادی اختلافات موجود ہیں تو یہ خود ہندوستانیوں ہی کو حل کرنا ہوں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ کابینہ دفد ایک مثبت رجحان کے ساتھ جا رہا ہے۔ اس نے طے کر لیا ہے کہ وہ کامیاب ہو کر آئے گا۔

(۶) (ص ۱۳۹)

لیبر پارٹی نے ہندوستان کو آزادی دے کر انتقام لیا (جون ۴۷ء مسٹر اٹیلی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی پیش کردہ تقسیم ہند کی تجویز منظور کر لی)

لیبر گورنمنٹ نے اپنا رویہ کیوں تبدیل کیا؟ میں اس تکلیف دہ نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کا یہ اقدام ہندوستان کی بجائے برطانوی مفاد پر مبنی تھا۔ لیبر پارٹی ہمیشہ کانگرس کی ہمدرد رہی تھی، اس کے رہنماؤں نے متعدد مواقع پر علانیہ مسلم لیگ کو رجعت پسند جماعت قرار دیا تھا۔ اب مسلم لیگ کے مطالبہ کے سامنے اس کا سر جھکا دینا میری رائے میں صرف برطانوی مفاد کے تحفظ کی خاطر تھا، لیبر پارٹی نے آزادیٔ ہند کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ یہ نہیں فراموش کر سکی کہ سیاسی کشمکش کے زمانہ میں کانگرس ہمیشہ انگریزوں کے خلاف برسر کار رہی تھی۔

(۷) (ص ۱۹۱، ۱۹۲)

مسٹر اٹیلی کے بارے میں مولانا آزاد نے جو تاثرات ظاہر فرماتے ہیں اور لیبر پارٹی کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اضطرابِ خیال کی بہترین مثال ہے، وہ ان دونوں سے امیدیں بھی باندھتے ہیں۔ ان کے اقدام و عمل کی تعریف بھی کرتے ہیں، ان کے خلوص اور حسنِ نیت کے گن بھی گاتے ہیں اور پھر آخر میں یہ بھی فرما دیتے ہیں کہ لیبر پارٹی نے ہندوستان سے غداری کی اٹیلی نے ہندوستان کو آزادی دے کر اس سے انتقام لیا۔ کیا بات ہے تیری گفتگو کی!

ضروری ہے کہ مولانا کے خیالات کا ذرا وضاحت کے ساتھ تجزیہ کیا جائے۔

(۱)

سوال یہ ہے کہ حکمران قوم کے برسرِ اقتدار افراد کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دینا اور ان سے کھلے اور واضح الفاظ میں منظرِ التفات کی دریوزہ گری کرنا کس اصول کے مطابق تھا؟ کانگرس کے رہنماؤں کا قائدِ اعظم پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ انگریزوں کے دوست اور نیاز مند ہیں، وہ ہندوستان کی آزادی نہیں چاہتے وہ ملک دشمن عناصر سے سازباز کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا کبھی قائدِ اعظم نے مسٹر چرچل کو، مسٹر بلڈون کو، مسٹر لائڈ جارج کو، مسٹر چیمبرلین کو، ان کے وزیرِ اعظم بننے پر تار بھیجا، اور دعا لگائی کہ — نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں؟ یہ کیسی ستم ظریفی ہے پھر بھی کانگرس انگریز دشمن اور قائدِ اعظم انگریز نواز!

مسٹر اٹیلی دوسرے بہت سے انگریزوں اور یورپینوں کی طرح اس کے قائل تھے کہ اکثریت کو بالادستی حاصل ہونی چاہیے۔ اقلیت کو اکثریت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے، یہی جمہوریت ہے اور ان کے ملک میں یہی ہوتا رہتا تھا، آج ایک پارٹی برسرِ اقتدار ہے کل دوسری، آج ایک جماعت اکثریت میں ہے، کل کوئی اور، سیاسی جماعتیں حالات کے لحاظ سے ہر دلعزیزی حاصل کرتی اور کھوتی رہتی ہیں، اسی بنیاد پر وہ اکثریت اور اقلیت میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں،

لیکن ہندوستان کی اقلیت اور اکثریت سیاسی نہیں مذہبی تھی، لہٰذا مستقل، جو جماعتیں سیاسی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں، ان کی کثرت و قلت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، کبھی کنزرویٹو، کبھی لیبر، کبھی لبرل کے ہاتھ میں اقتدار آتا رہتا ہے۔ لیکن اگر جماعتوں کی بنیاد قوم اور مذہب ہو تو خود یورپ میں بھی وہی حالات پیدا ہو جائیں جو ہندوستان میں تھے، کیا انگلستان میں، فرانس میں، جرمنی میں، اسپین میں، امریکہ میں، یہ ممکن ہے کہ عیسائی اکثریت پر یہودی اقلیت غالب آجاتے؟ یہ اقلیت و اکثریت مستقل ہے، اکثریت ہمیشہ اکثریت رہے گی اور اقلیت ہمیشہ اقلیت، ان ممالک نے دین اور سیاست کی الگ الگ حد بندی کر رکھی ہے لہٰذا یہودی اور نصاریٰ میں کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ انگلستان میں یہودی وزیرِ اعظم ہو سکتا ہے، یہودی کی حیثیت سے نہیں، انگریز کی حیثیت سے، لیکن ہندوستان میں ایک مسلمان کبھی بھی وزیرِ اعظم

نہیں ہو سکتا۔ مولانا ابو الکلام آزاد اپنے تمام خدمات اور قربانیوں کے باوجود نہ ہو سکے تو اور کون ہو سکے گا؟

لیکن مسٹر اٹیلی نے یہ نکتہ نہیں سمجھا، نہ سمجھنے کی کوشش کی، وہ اقلیت کو، کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، اکثریت کی عظمت کے معترف تھے، وہ وزیر اعظم ہوتے تو صدر کانگرس نے انہیں مبارکباد کا تار بھیجا اور جواب میں انہوں نے شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنے خدمات پیش کر دیے۔

(۳)

اور یقیناً لیبر پارٹی اور اٹیلی سے جو امیدیں مولانا اور ان کے رفقا نے قائم کی تھیں، وہ پوری ہوئیں، لیبر پارٹی نے حق اور انصاف سے تجاوز کر کے کانگرس کو وہ سب کچھ دے دیا جس کی وہ مستحق نہیں تھی، اور اقلیتوں سے وہ سب کچھ چھین لیا جو بلا شرکت غیرے ان کا تھا۔

(۴)

مسٹر اٹیلی کی طرف سے جو "ترقی پسندانہ" رویہ مولانا اور ان کے رفقا کے حسب توقع ظاہر ہوا، اس کا سب سے اہم ثبوت یہ ہے کہ عنان وزارت عظمیٰ ہاتھ میں لیتے ہی اٹیلی نے فرما دیا۔

"اقلیت کو اکثریت کے راستہ میں حائل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی!"

---

(۵)

اور ہندوستانی مسائل کو سلجھانے کا وہ نیا انداز کیا تھا جو مسٹر اٹیلی نے اختیار کیا — یہ کہ — بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را،

(۶)

ہندوستان کے فرقہ وارانہ اختلافات کو صرف "سماجی اور اقتصادی اختلاف" قرار دینا مسٹر اٹیلی کی ذہانت اور خبث نفس دونوں کا کمال ہے!

یہ بیان دے کر مسٹر اٹیلی نے مسلمانوں اور ہندوستانی اقلیتوں کے جائز شکایات کی بالکل نفی کر دی،

سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افسترا
سوزِ فغاں سے جنبش دیوار در غلط!

(۷)

مولانا اپنے اس عقیدہ پر آخرت وقت تک بلکہ ہندوستان کی آزادی کے بارہ سال بعد تک یعنی اس کتاب کے لکھتے وقت تک قائم ہے کہ ہندوستانی مسائل کا بہترین حل کابینہ وفد کا فیصلہ ہے لیکن کسی طرح بھی اپنے ہم نفسوں سے یہ بات نہ منوا سکے، انہیں منقسم ہندوستان میں وہی لذت ملتی تھی جو متحدہ ہندوستان میں مولانا کو مل سکتی تھی۔ مولانا کو اس پر ناز تھا کہ کابینہ وفد کی اسکیم درحقیقت ان کے ذہن رسا کی پیداوار تھی، انہیں اس پر فخر تھا کہ گاندھی جی اور جواہر لال ان کے ہمنوا تھے لیکن بعد میں گاندھی جی اور جواہر لال نے یہ اسکیم مسترد کر کے وہ فخر مولانا سے چھین لیا،

حکومت ہند کے محکمہ والیان ریاست کے سابق سیکرٹری مسٹر وی پی مینن کا ایک بیان پرتاب دہلی کی کسی اشاعت میں (اوائل جون ۱۹۵۹ء) شائع ہوا ہے، جو درحقیقت مولانا کی اس کتاب پر تبصرہ ہے، مسٹر مینن نے صاف الفاظ میں مولانا پر الزام لگایا ہے کہ وہ

۱۔ فرقہ پرست تھے،

۲۔ مسلم لیگ کو خوش رکھنا چاہتے تھے،

۳۔ کابینہ وفد کی اسکیم اگر بروئے کار آجاتی تو ہندوستان کا ہر صوبہ پاکستان بن جاتا۔

یہ راز اب بارہ سال کے بعد مسٹر مینن نے منکشف کیا ہے کہ کابینہ وفد کی اسکیم صوبوں کی عارضی مگر جبری گروپ بندی کی وجہ سے غرق ہوئی نا ب نہیں ہوتی بلکہ گاندھی جی، جواہر لال اور پٹیل کے دماغ میں یہ اندیشہ گھوم رہا تھا کہ اس طرح ہندوستان کا ہر صوبہ "پاکستان" بن جاتا۔

کاش مسٹر مینن کے اس بیان کو مولانا پڑھ سکتے، پھر یقیناً بے ساختہ ان کے منہ سے نکل جاتا۔

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!

آصف علی

(زندان خانہ قلعہ احمد نگر)

قیدیوں کی تبدیلی ۱۹۴۴ء کے وسط میں گورنمنٹ آف انڈیا اس نتیجہ پر پہنچی کہ اب ہمیں احمد نگر میں نظر بند رکھنا ضروری نہیں ہے۔

(ص ۹۶)

آصف علی کا تبادلہ سردار پٹیل اور شنکر راؤ دیو پونا جیل بھیج دیے گئے، جواہر لال نینی جیل پھر وہاں سے الموڑا بھیج دیے گئے۔ آصف علی بٹالہ بھیج دیے گئے جہاں دہلی کے سیاسی قیدی نظر بند تھے۔ مجھے بنکورا پہنچا دیا گیا۔

(ص ۹۷، ۹۸)

آصف علی کی علالت اپریل ۱۹۴۵ء کے آخر میں اخبارات سے مجھے معلوم ہوا کہ بٹالہ جیل میں آصف علی بیمار ہیں، حالت نازک ہے بڑی دیر تک ان پر بے ہوشی کا دورہ طاری رہا، جس سے ان کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی، حکومت نے انہیں رہا کرنے کا فیصلہ کیا اور دہلی بھیج دیا۔

(ص ۹۹)

بیوی سے محبت (ارونا آصف علی کی متشددانہ سرگرمیوں کی خبر قلعہ احمد نگر کے جیل میں پہنچ گئی۔)

جب ہمیں یہ حالات معلوم ہوئے تو میں نے دیکھا کہ آصف علی کو اپنی اسیری کی تو کوئی پروا نہیں ہے لیکن خطرہ میں ان کی بیگم کو دیکھ کر ڈالی تھیں اس نے انہیں سخت پریشان کر دیا تھا، میں نے ان سے کہا۔

تمہیں پریشان نہ ہونا چاہیے بلکہ اس پر نازاں ہونا چاہیے کہ ایک بلند مقصد کے لیے وہ بے نظیر ہمت اور حوصلہ کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں۔ (۲)

(ص ۱۱۷)

آصف علی کابینہ وزارت میں

(اگست ۱۹۴۶ء عارضی حکومت میں مولانا آزاد کو وزارت پیش کی جاتی ہے لیکن بوجوہ وہ قبول نہیں کرتے)

میں نے مشورہ دیا کہ آصف علی کابینہ میں سے لیے جائیں، آصف علی کو جب یہ خبر معلوم ہوئی انہوں نے بہت زور دیا کہ میں شریکِ وزارت ہو جاؤں لیکن میں نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ (۳) (ص ۱۶۳)

---

(۱) آصف علی دلی کے رہنے والے تھے، اور دلی کی تہذیب و شرافت کا مرقع اُردو مادری زبان تھی، انگریزی میں اُردو سے زیادہ دسترس حاصل تھی۔ آدمی ذہین تھے بیرسٹری شروع کی اور بہت جلد صفِ اول کے وکلا میں شامل ہو گئے۔

قومی سیاسیات سے تحریکِ خلافت کے زمانہ میں دلچسپی ہوئی، بڑی سی داڑھی رکھ لی، کھدر پہننے لگے، پریکٹس ترک کر دی، جیل چلے گئے، جیل میں کئی اچھی نظمیں لکھیں جو بابائے اُردو نے اپنے رسالہ اُردو (اورنگ آباد دکن) میں ۱۹۲۲ء، شائع کیں اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ بڑا، ستھرا ادبی ذوق رکھتے تھے، میں نے انگریزی میں تو ان کی کوئی تقریر نہیں سنی، لیکن اُردو کے ایک ڈیبیٹ میں (جامعہ ملیہ اسلامیہ ۱۹۳۲ء) حصہ لیتے دیکھا تھا، اندازِ خطیبانہ اور اسلوب دلچسپ تھا۔

عہدِ تحریکِ خلافت میں آصف علی کی جیل سے رہائی تقریباً اسی طرح ہوئی

جس طرح ڈاکٹر محمود کی قلعہ احمد نگر کی جیل سے عمل میں آئی تھی، مولانا محمد علی مغفور ایک شعلہ خو تھے وہ بھلا اس کمزوری کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے، خفا ہو گئے۔ اس زمانہ میں وہ شخص پلیٹ فارم پر ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹک سکتا تھا جس سے علی برادران یا ان میں سے کوئی ایک خفا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آصف علی جیل سے رہائی کے بعد عملی طور پر سیاست سے الگ ہو گئے اور بیرسٹری میں (تارک تعاون) ہونے کے باوجود منہمک ہو کر خوب روپیہ کمانے لگے۔

۱۹۲۷ء میں ریاست اندور میں ہولناک ہندو مسلم فساد ہوا، مسلمان بے طرح مارے اور لوٹے گئے، حدودِ ریاست کے اندر باہر کے مسلمانوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا اور اندرونِ ریاست میں مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ، گرفتاری اور سزایابی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مولانا محمد علی کے برادر نسبتی اور ماموں زاد بھائی مسٹر معظم علی اندور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے، ریاست کے خلاف مولانا کے اقدام و عمل کا اثر معظم صاحب پر پڑ سکتا تھا لیکن انہوں نے پروا نہ کی اور والیٔ اندور کی مسلم آزادی کے خلاف "ہمدرد" میں مقالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

مولانا محمد علی کی تجویز یہ تھی کہ مسلمانانِ اندور کے لیے کچھ اور نہیں کیا جا سکتا تو کم از کم قانونی امداد تو پہنچانی چاہیے، مولانا کی اپیل پر سب سے پہلے ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے جو تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان ہی میں رہ گئے اور اب بھی وہیں ہیں لبیک کا نعرہ بلند کیا اور رضاکارانہ طور پر اپنے خدمات پیش کر دیے۔ مولانا اور ڈاکٹر کچلو کے درمیان خاصے گہرے سیاسی اختلافات تھے جنہوں نے ذاتی رنجش کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن کچلو کے اس جذبے سے مولانا بہت متاثر ہوئے اور "ہمدرد" میں ان کی تعریف کی حکومتِ اندور نے جیسے ہی ڈاکٹر کچلو اندور پہنچے حدودِ ریاست سے نکل جانے کا حکم دے دیا، وہ دلی آ گئے اور مولانا محمد علی سے حالات بیان کیے۔ اب مولانا نے چاہا کہ آصف علی چلے جائیں، آصف علی نے ایک ہزار روز محنتانہ کا مطالبہ کیا، نیز اپنا اور اپنے منشی اور ملازم کا سفر خرچ اور معاوضہ مستزاد، مولانا نے جس طرح کچلو کے جذبۂ ملی کو "ہمدرد" میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا، اس طرح آصف علی

کے جذبۂ طلبِ زر کی خوب خبر لی۔

۱۹۳۲ء میں ارونا آصف علی کی وجہ سے آصف علی کو اُبھرنے کا موقعہ پھر ملا، ارونا بڑی پرجوش اور نتائج سے بے پروا ہوکر خطرات کی آگ میں کود پڑنے والی خاتون تھیں، مولانا ابوالکلام نے اپنی خودنوشت میں کہیں لکھا ہے کہ لیڈی ہارڈنگ بیٹس سے جواہر لال کافی متاثر تھے، اسی طرح اروناآصف علی کے جوش اور جذبۂ ایثار اور ولولۂ قربانی سے خود مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری بہت متاثر تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر انصاری اور مولانا آزاد نے داخلہ کونسل کا پروگرام کانگریس کے سامنے رکھا جسے تھوڑے حیص بیص کے بعد اس نے منظور کر لیا۔ اس موقع پر مولانا نے آصف علی کو بھی ساتھ ساتھ رکھا، مولانا کے تعلقات آصف علی سے پہلے بھی کافی تھے کچھ ہم وطنی کی نسبت کچھ ہم ذوقی اور ہم مشربی، اب ارونا کے باعث ان تعلقات میں اتنا استحکام پیدا ہوا کہ مولانا اپنی طبیعت اور عادات کے خلاف جب دہلی آتے تو زیادہ تر آصف علی کے ہاں ٹھہرتے، یہاں پورے خلوص سے ان کی پیشوائی کی جاتی۔

آصف علی کی زندگی کا یہ دور کانگریس اور مولانا سے تعلقات کے باعث کچھ ایسا مستحکم ثابت ہوا کہ پھر زندگی بھر وہ اسی راہ پر گامزن رہے،

۱۹۴۵ء میں جب جواہر لال قانون شکنی کرتے ہوئے کشمیر میں خاردار تار پھلانگ کر داخل ہوئے اور گرفتار ہوئے تو ان کے ساتھ پھلانگ لگانے والے اور گرفتار ہونے والے آصف علی بھی تھے۔

(۲)

ارونا سے آصف علی کی شادی محبت کا نتیجہ تھی

عشق از یں بسیار کردست و کند
سبحہ را زنار کردست و کند

آصف علی نے اس محبت کو ایک سچے محبت کرنے والے اور شریف شخص کی طرح، بعد کی تلخیوں اور بدمزگیوں کے باوجود، زندگی کی آخری سانس تک نباہا۔

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش   دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

آصف علی کی زندگی کا یہ پہلو نہایت شاندار ہے۔

(۳)

پھر کچھ عرصہ بعد جب مولانا کابینہ میں شریک ہو گئے تو آصف علی امریکہ میں ہندوستان کے سفیر بنا کر بھیج دیے گئے، وہاں سے آئے تو اڑیسہ کی گورنری پر مامور ہوئے۔ وہاں سے فارغ ہوتے تو سوئٹزرلینڈ میں سفیرِ ہند کی حیثیت سے پہنچے، وہیں مرضِ قلب میں وفات پائی۔

سیاسی اختلاف نے ارونا آصف علی اور آصف علی کی راہیں جدا کر دی تھیں، وہ کانگرسی تھے، یہ سوشلسٹ تھیں، وہ کانگرس کے وزیر و سفیر، یہ کانگرس کی مخالف اور دشمن، وہ راج بھون میں جاہ و جلال کے ساتھ رہ رہے تھے، یہ شہر و دیار کی گلیوں اور کوچوں میں اپنے انقلابی خیالات کا پرچار کر رہی تھیں، وہ امن و قانون کے محافظ، یہ قانون شکن اور امن سوز۔

لیکن سوئٹزرلینڈ میں جب دل کا مہلک حملہ آصف علی پر ہوا تو ارونا سرِ بالیں موجود تھیں۔

دیکھا وقتِ نزع رخِ دل آرام کو
عید ہوئی ذوق وصے شام کو!

لاش دلّی لائی گئی، مولانا آزاد نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور وہ جسم سپردِ خاک کر دیا گیا، جس نے ایک عرصہ تک شعر و ادب، آئین و قانون اور سیاست و حکومت کے ایوان میں گہما گہمی برپا کر رکھی تھی۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

---

(۵)

ارونا آصف علی

کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ

۵ راگست ۱۹۴۲ کو ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا۔ میں نے افتتاحیہ تقریر میں کہا، جاپان کا حملہ قریب تر ہوتا جا رہا ہے، قوم، قوت حاصل کرنا چاہتی ہے کہ حملہ آور کا مقابلہ کر سکے، انگریز اگر چاہیں تو سنگاپور، ملایا اور برما کی طرح ہندوستان سے بھی فرار ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی کہیں نہیں جا سکتے، یہ ان کا وطن ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کی تجویز منظور کر لی۔

(ص ۸۲، ۸۳)

نو گرفتاروں کا قافلہ

صبح صبح بمبئی کے ڈپٹی کمشنر نے مجھے گرفتار کیا، ہماری کار وکٹوریہ ٹرمینس کی طرف جا رہی تھی، سارا اسٹیشن خالی پڑا تھا۔ جیسے ہی میں کار سے اترا میری نظر اشوکا مہتہ پر پڑی۔ پلیٹ فارم پر ایک ٹرین ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ یہ ایک کاری ڈور ٹرین تھی جو عموماً بمبئی سے پونا لائن پر چلتی تھی۔ میں ایک کمپارٹمنٹ میں پہنچایا گیا اور کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا

جواہر لال، آصف علی، سید محمود

فوراً ہی بعد جواہر لال، آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود نمودار ہوئے۔ جواہر لال نے

مجبورت کہا، کانگریسی بھی لائے گئے ہیں، اور ایک دوسرے کمپارٹمنٹ میں ہیں۔

بہادر عورت

ذرا دیر بعد گارڈ نے سیٹی دی اور ٹرین نے جنبش کی۔ میں نے دیکھا بیگم آصف علی پلیٹ فارم پر کھڑی ہیں وہ اپنے شوہر کو الوداع کہنے آئی تھیں جیسے ٹرین چلی انہوں نے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا

"میرے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی نہیں رہوں گی، کچھ نہ کچھ ضرور کرکے دکھاؤں گی۔"

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ واقعی کر دکھایا۔[1]

(ص ۸۴، ۸۵)

بیگم آصف علی کا کردار

"ہندوستان خالی کردو" کی تحریک نے کئی نمایاں شخصیتوں کو اُبھرنے میں مدد دی، ان میں بیگم آصف علی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

ہماری گرفتاری کے بعد انہوں نے سارے ملک کا دورہ کیا اور برطانیہ کے مساعی جنگ کی مخالفت اور مزاحمت کے سلسلہ میں غیر معمولی تنظیمی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ ان کی سرگرمیاں تشدد اور عدم تشدد کی حد بندیوں سے آزاد تھیں۔ انہوں نے جو مناسب سمجھا کر گزریں۔

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

کچھ عرصہ کے بعد حکومتِ ہند ان کی سرگرمیوں سے چوکنا ہوئی اور انہیں گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ وہ روپوش ہوگئیں اور گرفتار نہ ہوسکیں۔ اس نازک موقع پر بہت سے ہندوستانیوں نے ان کی بیش بہا امداد کی، ان مدد کرنے والوں میں بڑے بڑے سرکاری ملازمین اور بڑے بڑے صنعت کار بھی تھے جو عام طور پر حکومت برطانیہ کے یار وفادار سمجھے جاتے تھے۔ بمبئی اور کلکتہ کے کئی سربرآوردہ تجارت پیشہ اصحاب نے ان کی بیش از بیش مدد کی۔ حد یہ ہے کہ وہ انڈین سول سروس کے اعلیٰ حکام اور انڈین آرمی کے افسران بالا کے گھروں میں اطمینان اور عافیت کے ساتھ روپوشی کی زندگی بسر کرتی رہیں انہوں نے حسبِ دل خواہ فنڈ جمع کیا اور ہماری نظر بندی کے دوران میں برابر سرگرمِ عمل رہیں

لارڈ ویول سے رہائی کی سفارش

۱۹۴۵ء میں جب میں رہا ہوا تو وہ چھپتی چھپاتی مجھ سے ملنے کے لیے کلکتہ آئیں۔

میں نے لارڈ ویول سے ارونا آصف علی کے بارے میں گفتگو کی، انہوں نے کہا ان کی گزشتہ سرگرمیوں کی بنا پر تو وہ انہیں گرفتار نہ کرنے کا وعدہ کرتے ہیں لیکن ان کی آئندہ سرگرمیاں کیا ہوں گی یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے؟ میں نے لارڈ ویول سے کہا، اب سیاسی صورت حال تبدیل ہو چکی ہے اور بظاہر اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ وہ تخریبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

جب میں مطمئن ہو گیا کہ اب ان کی گرفتاری کا کوئی خطرہ نہیں ہے تو میں نے کہا کہ اب وہ نمودار ہو جائیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

ارونا آصف علی پر وائسرائے کا طنز

ارونا آصف علی نے اپنی سرگرمیوں کی بنا پر وہ مقام حاصل کر لیا کہ وائسرائے نے اپنی ایک تقریر میں ان کا ذکر کرتے ہوئے کانگرس کے عقیدہ عدم تشدد پر چوٹ کی۔ انہوں نے کہا جب کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ایک ممبر کی بیوی متشددانہ سرگرمیوں میں مصروف ہے تو حکومت کے لیے یہ بہت دشوار ہے کہ عدم تشدد سے متعلق کانگرس کے اعلانات پر یقین کرے۔ (۲۱) (ص ۱۱۶، ۱۱۷)

بحریہ کی بغاوت میں ارونا کا دور

(بحریہ کے فوجی افسروں کی شورش / اہالیان بمبئی کی ان سے ہمدردی)

"بیگم آصف علی نے بحریہ کے افسروں کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہ ان کی پرزور پشت پناہ بن گئیں۔ میری تائید حاصل کرنے کے لیے وہ دہلی آئیں۔ میں نے ان سے کہا کہ بحریہ کے افسروں کا طرز عمل عقل مندی سے دور ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ بلا کسی شرط کے وہ اپنے کام پر واپس جائیں۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل بمبئی میں تھے۔ انہوں نے بھی مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے ان سے کہا بحریہ کے افسروں نے جو قدم اٹھایا ہے وہ نامناسب ہے۔ (ص ۱۳۱)

[illegible] لنگوال کے نام سے مشہور تھیں، کوہ منصوری پر ان کی آصف علی [illegible] ملیں اور ایک دوسرے کی رازدار بن گئیں۔ آصف علی کی والدہ پرانے

خیالات کی خاتون تھیں، انہیں آرزو تھی کہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے کوئی چاند سی بہو کسی برابر کے خاندان سے بیاہ کر لائیں گی۔ چاند سی بہو تو آگئی لیکن نہ وہ اپنے خاندان کی تھی نہ اپنی قوم کی نہ اپنے مذہب کی، سول میرج نے دونوں کو ایک نہ ٹوٹنے والے رشتہ میں منسلک کر دیا تھا۔

آصف علی کے گھر میں داخل ہونے کے بعد ارونا نے ایک مشرقی بہو کی طرح ساس کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا لیکن وہ پردہ کی بیوی نہ تھیں، تعلیم سے بہرہ ور، ادبی سوسائٹیوں کی ممبر، سیاست سے ذوق، ملکی خدمت کے جذبے سے مخمور، بہت جلد گھر کی چار دیواری سے نکلیں اور سارے ملک کی اہم شخصیت بن گئیں۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری کی سرپرستی نے انہیں بہت جلد کانگرس کی صفِ اول میں پہنچا دیا۔

۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے میں جامعہ ملیہ دہلی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ مولانا آزاد آجکل دہلی میں ہیں اور دریا گنج میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے لی ہے، وہیں مقیم ہیں، اور ترجمان القرآن کی تعریب و تحریر میں مصروف ہیں، میں نے اور میرے ایک عزیز دوست عبدالسلام قدوائی (ندوی) نے پروگرام بنایا کہ مولانا سے ملنا چاہیے۔ مولانا کی بارگاہ میں جامعہ کے دو غیر معروف طالب علم، بغیر پہلے وقت مقرر کیے، اُمنگ اور حوصلہ کے بل پر پہنچ گئے۔

بڑی سی کوٹھی! مولانا اس کے تنہا مکین!

ایک ملازم بڑی دیر کے بعد نظر آیا، اس سے کہا مولانا سے ہم ملنے آئے ہیں اس نے ایک مرتبہ ہم دونوں کے سراپا پر نظر ڈالی اور خاموش ہو گیا۔ اتنے میں ایک کار کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی، ڈاکٹر انصاری اپنی مخصوص دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ نمودار ہوئے، ان کے پیچھے ارونا آصف علی سفید ساڑھی میں ملبوس، چھوٹا سا قد، گندمی رنگ بڑی بڑی آنکھیں، ہونٹوں پر ایک جاں نواز تبسم، ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی اتریں، اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مولانا کی بارگاہ رفعت مآب میں پہنچ گئیں۔ اتنی دیر میں ملازم کو جواب سوجھ گیا اس نے بڑی رکھائی سے کہا۔

"اب کیسے جاؤ گے؟"

ظاہر ہے یہ سوال لاجواب تھا۔ ۔ ۔

میں نے ارونا آصف علی کو متعدد جلسوں میں دیکھا۔ ان کی تقریریں سنیں۔ دل نے ہر مرتبہ اچھا ہی اثر قبول کیا۔ اور یہ اثر پذیری اس وقت اور بڑھ گئی جب ہندوستان تقسیم ہوا۔ فوج اور پولیس کے تعاون سے ہندو اکثریت نے جب مسلمانان ہند میں شکست خوردگی کا احساس پیدا کر دیا۔ وہ ہمت ہار بیٹھے اور چلتی ٹرینوں سے انہیں اٹھا اٹھا کر پھینکا جانے لگا تو ان کے لیے یہ وسیع سرزمین تنگ ہو گئی۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا حوصلہ بلند رکھنے، ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے، اور ان کا ہراس دور کرنے کے سلسلہ میں ارونا آصف علی نے جو بیش بہا خدمات انجام دیے وہ کبھی فراموش نہیں کیے جا سکیں گے۔ انہوں نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور مسلم محلوں میں گشت کر کے ولولہ انگیز تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ ان تقریروں کا بڑا اچھا اثر ہوا اور کم از کم وقتی طور پر مسلمانوں کی دہشت میں بڑی حد تک کمی ہو گئی۔

(۲)

بظاہر وائسرائے کا یہ اعتراض وزنی تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ "ہندوستان خالی کر دو" کی تحریک کے بعد آصف علی اور ارونا آصف علی کے درمیان سیاسی اختلافات کی ایسی وسیع خلیج پیدا ہو گئی جس نے دونوں کی خاص طور پر آصف علی کی زندگی تلخ کر دی۔ آصف علی نے اپنے ساتھ انہیں امریکہ لے جانا چاہا مگر وہ نہ گئیں۔ آصف علی نے اپنے ساتھ اڑیسہ کے راج بھون میں رکھنا چاہا لیکن راج بھون میں قدم رکھنا وہ گوارا نہ کر سکیں۔ آصف علی نے چاہا وہ ان کے ساتھ سوئٹزرلینڈ چلیں مگر وہ نہ مانیں۔ آصف علی مر گئے تو ارونا کا دل پسیجا خوب روئیں، لیکن

اب وفا ہے نہ جفا، یاد وفا باقی ہے
تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانہ کی

ارونا کا سیاسی مسلک اب بھی وہی ہے جو کانگرس کا نہیں ہے۔

خان بہادر اللہ بخش

نیشنلسٹ مسلم کنونشن سر اسٹیفرڈ کرپس سے ملاقات کے لیے خان بہادر اللہ بخش سندھ کے چیف منسٹر بھی مدعو کیے گئے۔ خان بہادر اللہ بخش نے حال میں دلی کی نیشنلسٹ مسلم کنونشن کی صدارت کے بعد نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی، میں نے کنونشن میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا لیکن پس پردہ رہ کر اسے ضروری امداد دی تھی، یہ کانفرنس شاندار طور پر کامیاب ہوئی۔ اطراف واکناف سے چودہ سو ڈیلی گیٹ شرکت کے لیے آئے یہ اجتماع اتنا اثر انگیز ثابت ہوا کہ برطانوی اور اینگلو انڈین اخبارات جو نیشنلسٹ مسلمانوں کو حقیر ثابت کیا کرتے تھے اسے نظر انداز نہ کر سکے۔ انہیں اس اعتراف پر مجبور ہونا پڑا کہ یہ کانفرنس اس بات کا ثبوت ہے کہ نیشنلسٹ مسلمان نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ (۱) (ص ۴۰)

توہین آمیز برتاؤ اللہ بخش وائسرائے کا دعوت نامہ پا کر دہلی آگئے اور سر اسٹیفرڈ کرپس سے انٹرویو کا انتظار کرنے لگے لیکن انٹرویو نہ ہوا۔ جہاں تک ممکن ہو یہ بڑی بے تکی بات تھی، میں نے کرپس سے اس مسئلہ پر گفتگو کی انہوں نے جواب دیا وہ بہت جلد اللہ بخش سے ملیں گے۔ لیکن اس وعدے کے باوجود عملی طور پر انٹرویو کا تعین نہیں ہوا۔ اللہ بخش اس صورت حال سے بہت جز بز ہوئے اور مزید انتظار کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ مجھے جب یہ خبر ملی تو میں نے سخت الفاظ میں کرپس سے

گفتگو کی اور کہا یہ صرف اللہ بخش کی توہین نہیں ہے بلکہ اس ٹھوس مستلم تنظیم کی بھی توہین ہے جس کے وہ نمائندے ہیں۔ میری مداخلت کارگر ہوئی، دوسرے روز دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ اس واقعہ سے بہت بددل ہوا۔ کرپس کا یہ طرزِ عمل تدبر سے خالی تھا۔ (۲) (ص ۵۴)

---

(۱)

خان بہادر اللہ بخش مرحوم "خان بہادر" ہونے کے باوجود کانگرس کے چہیتے تھے سندھ چونکہ غیر معمولی مسلم اکثریت کا صوبہ تھا۔ اس لیے کانگرس کو ایسے "مسلمان" کی ضرورت تھی جو اس کے چشم ابرو پر رقص کر سکے، خان بہادر کو ایسی تنظیم درکار تھی جو ہر حالت میں ان کی وزارت عظمیٰ قائم رکھنے میں مدد دے۔ سندھ میں غیر مسلم لیگی وزارت بننے کے معنی یہ تھے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں نہ مسلم لیگ مقبول ہے نہ تحریک پاکستان، اس لیے پنجاب میں "سر" خضر حیات خاں اور سندھ میں "خان بہادر" اللہ بخش، کانگریس کے منظورِ نظر بن گئے۔

سندھ کے مسلم زعما میں چلتی رہتی تھی، کانگرس متحد تھی۔ لہٰذا وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود ایک ٹھوس طاقت بن گئی۔ اس نے خان بہادر کا ساتھ دیا اور وہ وزیر اعظم بن گئے۔

وزیر اعظم بننے کے بعد وہ کانگریس کی نظر میں اور چڑھ گئے۔ کانگرس نے بصرف زر کثیر، دہلی میں، سر کرپس کی آمد سے کچھ پہلے مسلم نیشنلسٹ کنونشن کا ڈھونگ رچایا، تاکہ انگریزوں کو یقین ہو جائے کہ مسلمانوں کی نمائندگی صرف مسلم لیگ نہیں کرتی، نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت بھی کرتی ہے۔

لیکن اس کنونشن کو رقم خطیر صرف کرنے اور پس پردہ رہ کر زیادہ مدد دینے کے باوجود مولانا زیادہ کامیاب نہ بنا سکے اور مسلمانوں کی رائے عامہ پر اس "شو" کا کوئی اثر پڑا، نہ حکومت مرعوب ہوئی نہ انگریز حقائق سے چشم پوشی کر سکے۔

اس زمانہ میں خان بہادر صاحب دن دہاڑے اپنے وطن میں قتل کر دیے گئے۔ مسٹر ایوب کھوڑو پر سازش قتل کا الزام لگایا گیا، وہ گرفتار کر لیے گئے۔ لیکن عدالت

بری ہو گئے، قاتل کا آج تک سُراغ نہ لگ سکا۔

انہی اللہ بخش کے بھائی مولا بخش کو، ڈاکٹر خاں صاحب اور فیروز خاں نون نے ری پبلکن پارٹی کا رکن بنا لیا۔ وزیر کی حیثیت سے انہوں نے جو شہرت حاصل کی وہ سب کے علم میں ہے، سر غلام حسین، ہدایت اللہ نے ایک مرتبہ انہیں سندھ کی مسلم لیگی کابینہ میں شریک کر لیا تھا مگر قائداعظم نے حکم دیا کہ یہ اقدام واپس لیا جائے لیکن قائداعظم کے انتقال کے بعد مرکز کی ری پبلکن پارٹی نے انہیں وزیر بنا کر گزشتہ "غلطی" کی تلافی کر دی۔

(۲)

مولانا کی مداخلت سے دفع شر کے لیے سر کرپس نے خان بہادر کو شرف باریابی تو عطا کر دیا، لیکن جس شخص کی پشت پر اپنی قوم کی رائے عامہ نہ ہو، وہ کیا کر سکتا ہے، خان بہادر سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے۔ لیکن مسلمانان سندھ ان سے اور اُن کی سیاست سے بیزار تھے، مولانا کانگریس کے صدر تھے لیکن اپنی قوم کی تائید سے محروم، دونوں کرپس سے مل تو لیے لیکن خالی ہاتھ گئے تھے، خالی ہاتھ واپس آئے۔

لارڈ اکینلک

بحریہ کے ہندوستانی افسروں کی شورش

(یہ خبر سننے کے بعد اور حالات سے آشنا ہونے کے بعد)

"میں نے کمانڈر انچیف سے فوری ملاقات کی درخواست کی، دوسرے روز دس بجے صبح پارلیمنٹ ہاؤس میں لارڈ اکینلک نے مجھ سے ملاقات کی۔ میں نے ان کے غور و فکر کے لیے دو نکات پیش کیے۔"

۱۔ کانگرس نے بحری افسروں کے طرزِ عمل کو پسند نہیں کیا اور انہیں مشورہ دیا ہے کہ بغیر کسی شرط کے اپنے کام پر واپس چلے جائیں، لیکن بہرحال یہ بات کانگرس کے لیے باعثِ تشویش ہو گی۔ اگر انہیں ہدفِ انتقام بنایا جائے، اگر حکومت نے کوئی انتقامی کارروائی کی تو کانگرس اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔

۲۔ نسلی امتیاز اور دوسری شکایات کی پوری پوری تحقیق کی جائے اور ان کا تدارک کیا جائے۔

کمانڈر انچیف کا شریفانہ برتاؤ

لارڈ اکینلک نے دوستانہ انداز میں مجھ سے گفتگو کی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا لب و لہجہ میری توقع سے زیادہ بے تپاک تھا، انہوں نے کہا اور بحریہ کے ہندوستانی حکام نے بغیر کسی

شرط سے ڈیوٹی پر جانا قبول کر لیا تو ہرگز انہیں ہدف انتقام نہیں بنایا جائے گا۔ جہاں تک نسلی امتیاز کا تعلق ہے، ان کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ یہ شکایت پورے طور پر رفع کر دی جائے۔

لارڈ آکینلک نے مجھے پورے طور پر مطمئن کر دیا، میں نے ایک بیان شائع کر کے بحریہ کے افسران سے اپیل کی کہ وہ اپنے کام پر واپس چلے جائیں اور انہیں یقین دلایا کہ ان کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ (۱) (ص ۱۳۱)

---

(۱)

لارڈ آکینلک ہندوستان کے آخری کمانڈر انچیف تھے، جنگ کے زمانہ میں وہ العالمین کے مورچہ پر اپنی سپاہ کے ساتھ موجود تھے۔ جب دفعتہً جنرل رومیل کی جرمن فوجوں نے اتحادیوں کے سارے استحکامات ختم کر دیے اور مصر براہ راست خطرہ میں آگیا اس موقع پر آکینلک نے بڑی پامردی اور استقلال کا ثبوت دیا۔

تقسیم کے بعد لارڈ آکینلک نے تجویز پیش کی کہ کچھ عرصہ تک ہندوستان اور پاکستان کا فوجی نظام مشترک رہے لیکن راجندر پرشاد وغیرہ نے یہ بات نہ مانی۔

پاکستان بننے کے بعد ایک مرتبہ آکینلک پاکستان کسی تجارتی سرگرمی کے سلسلہ میں آئے تو ہندوستان کے اخبارات نے تہلکہ مچا دیا کہ وہ ہندوستان کے خلاف پاکستان کے ساتھ سازشیں کر رہے ہیں!

---

(۸)

سر الیون جنکنس

(جون ۱۹۴۵ء شملہ کانفرنس)

وائسرائے لاج کا منظر کانفرنس شروع ہونے سے پہلے ہم وائسرائے لاج پہنچ گئے، لان پر وائسرائے ہمارے استقبال کے لیے کھڑے تھے، یہاں رسمی طور پر ہم سب کا تعارف کرایا گیا، میں بہت کمزور تھا، میرے لیے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا، میں نے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری سر الیون جنکنس سے اپنی معذوری بیان کی، وہ مجھے ایک گوشہ میں لے گئے یہاں میرے لیے ایک صوفہ رکھ دیا گیا، میں بیٹھ گیا۔

عربی داں لیڈی چند منٹ بعد سر الیون جنکنس دوبارہ آئے، ان کے ساتھ ایک لیڈی بھی تھی۔ اس خاتون کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا، یہ عربی زبان کی فاضل خاتون ہیں۔ شاید ان کا خیال تھا کہ چونکہ میں تنہا بیٹھا ہوں لہٰذا کوئی رفیق تنہائی چاہیے اور ایک مستشرق سے بڑھ کر میرا رفیق اور مونس کون ہو سکتا تھا؟

لطیفہ میں نے عربی میں اس لیڈی سے گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن محسوس کیا کہ اس بیچاری کی عربی "لا" (نہیں) اور "نعم" (ہاں) سے زیادہ وسیع نہیں پھر میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا، وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کس بنیاد پر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ آپ روانی کے ساتھ عربی زبان میں گفتگو کر سکتی ہیں۔

لیڈی نے جواب دیا کہ چند ماہ تک وہ بغداد میں رہ چکی ہے اور گزشتہ رات کی ڈنر پارٹی میں اس نے بعض مہمانوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ عرب لوگ جب کسی بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں تو کہتے ہیں "عجیب عجیب"،

پھر اس نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، بس یہی الفاظ میرے لیے بلائے جان بن گئے اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ میں عربی کی فاضل اجل ہوں۔

(ص: ۱۰۸، ۱۰۹)

---

(۹)

مسٹر آرتھر مور

مسلمانوں کی مظلومیت مسلمانوں کے قتل عام سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے جب مرن برت رکھا تو اسٹیٹس مین کے سابق ایڈیٹر مسٹر آرتھر مور نے بھی امپیریل ہوٹل میں مرن برت شروع کر دیا۔ ہندو مسلم فسادات نے انہیں بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔

ایک انگریز ہندوستانی مسٹر آرتھر مور نے مجھ سے کہا کہ اگر یہ مصیبت ختم نہیں ہوتی تو فاقہ کر کے وہ اپنی جان دے دیں گے۔ وہ برسہا برس سے ہندوستان میں رہتے چلے آئے تھے اور اب اس ملک کو اپنا وطن بنا چکے تھے انہوں نے کہا کہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے یہ ان کا فرض ہے کہ انسانیت کی تباہی اور بربادی کو روکنے کی کوشش کریں جس کے مظاہر قدم قدم پر نمایاں تھے۔

مسٹر آرتھر مور نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ ان المناک واقعات کو دیکھنے کے مقابلہ میں جو ہندوستان میں رونما ہو رہے ہیں مر جانا آسان ہے، میں نے انہیں پیغام بھیجا کہ گاندھی جی نے اپنا برت توڑ دیا ہے، وہ بھی ایسا ہی کریں ۔ (۱)

(ص ۲۲۰، ۲۲۱)

(۱)
اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلّی میں مسلمانوں کے قتل عام نے غیر قوم اور غیر ملت

کے لوگوں تک کو کس درجہ متاثر اور دل رفتہ کر دیا تھا۔

مسٹر آرتھر مور ان لوگوں میں تھے جو مسلم لیگ کی سیاست سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے تھے، تحریک پاکستان سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ کانگریس اور کانگریسی رہنماؤں کے مداح اور ثنا خواں تھے، گو ان کے بعض اقدامات پر کبھی کبھی نکتہ چینی بھی کر جاتے تھے۔

آرتھر مور جیسے شخص کا دل پسیج گیا لیکن نہ پسیجا تو سردار پٹیل کا —— آج اس دنیا میں سردار پٹیل موجود نہیں ہیں، آرتھر مور اگر زندہ بھی ہیں تو گوشہ نشین لیکن جس طرح پٹیل کی سنگ دلی تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہے، اسی طرح آرتھر مور کی انسانیت دوستی نے بھی تاریخ ہند میں ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔

بھولا بھائی ڈیسائی

(کرپس مشن کے زمانے میں)

ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو کرپس سے ملنے کی ممانعت میں نے ایک گشتی چٹھی ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو بھیجی کہ جداگانہ طور پر کوئی شخص بھی کرپس سے ملاقات نہیں کر سکتا۔ کرپس نے مجھ سے شکایت کی کہ پچھلی دفعہ جب وہ ہندوستان آئے تھے تو ورکنگ کمیٹی کے متعدد ممبروں سے انہیں ملاقات کا موقع ملا تھا۔ اس مرتبہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ میں نے ان پر پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ جب ایک ذمہ دار تنظیم حکومت سے گفت و شنید میں مصروف ہو تو یہ کام صرف اس کے بااختیار نمائندوں ہی کو کرنا چاہیے۔ لہٰذا ورکنگ کمیٹی کے کسی ممبر کو جداگانہ طور پر گفت و شنید کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے لیکن اگر وہ کسی ممبر سے ملنا چاہتے ہیں، سبب خواہ کچھ بھی ہو میں خوشی سے انتظام کر دوں گا۔ (۱)

بھولا بھائی سے ملنے کا اشتیاق کرپس نے کہا کہ وہ خاص طور پر بھولا بھائی ڈیسائی سے ملنے کو بے تاب ہیں۔ ہندوستان کے پچھلے دورے کے موقع پر وہ اُن کے مہمان بھی رہے تھے۔ اپنے کھادی کے سوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس میں وہ ملبوس تھے انہوں نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ کہا:

یہ کپڑے جو میرے جسم پر نظر آرہے ہیں، بھولا بھائی ڈیسائی کا تحفہ ہیں۔

(س ۵۵)

بھولا بھائی کے اخراج کا سبب

اب میں ان واقعات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو سنٹرل لیجسلیچر کی نئی کانگریس پارٹی سے بھولا بھائی کے اخراج کا سبب بنے۔ بہت سے لوگ متعجب تھے کہ وہ کس لیے نظر انداز کر دیے گئے۔ کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جنہیں واقعہ کے جملہ تفصیلات کا علم ہو مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں نے تمام متعلقہ حقائق بیان نہ کر دیے تو پس پردہ تاریخ پردۂ خفا میں مستور رہے گی۔

کانگرس کے پرانے ممبر بھولا بھائی سے جلتے تھے

بھولا بھائی ڈیسائی بمبئی کے نہایت کامیاب اور ممتاز وکیل تھے جو رفتہ رفتہ ہندوستان کے چوٹی کے قانون دانوں میں شمار ہونے لگے۔ پہلے پہل وہ کانگرس کے سرگرم کارکن نہیں تھے لیکن جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء منظور ہوا اور کانگرس نے انتخابات میں حصہ لینے کا ارادہ کیا تو کانگرس ٹکٹ پر وہ مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ اور فوراً ہی مرکزی اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے لیڈر چن لیے گئے۔ انہوں نے اپنے فرائض نہایت قابلیت اور امتیاز کے ساتھ انجام دیے۔ ان کی قابلیت اور جوش عمل نے کانگرس کے اندرونی حلقے میں انہیں ممتاز کر دیا۔ چنانچہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی منتخب ہو گئے اور رفتہ رفتہ کانگرس کے صفِ اول کے لیڈروں میں شمار ہونے لگے۔ ان کے اس عروج نے بعض قدیم ممبران کانگرس کو حسد میں مبتلا کر دیا اور انہوں نے محسوس کیا کہ ایک ایسے شخص کو جو ابھی کچھ مدت پہلے کانگرس میں بھرتی ہوا ہے اتنی زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ (۲)

ورکنگ کمیٹی سے علیحدہ رکھے گئے

بھولا بھائی کی صحت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی اسی لیے میں نے انہیں کانگرس کی نئی ورکنگ کمیٹی میں شریک نہیں کیا چنانچہ یہاں دوسرے کانگرسی لیڈروں کی طرح وہ

گرفتار نہیں کیے گئے، وہ اُن کانگرسی لیڈروں میں تھے جو جیل سے باہر تھے۔

بھولا بھائی کی لیاقت علی سے ملاقات

گاندھی جی ۱۹۴۴ء میں جب رہا ہوئے تو دلی کے بعض لوگوں کے دل میں خیال آیا کہ تعطل دور ہو سکتا ہے اگر کانگرس اور مسلم لیگ کے بجائے مرکزی اسمبلی کی کانگرس کمیٹی اور مسلم لیگ پارٹی میں کوئی مفاہمت ہو جائے۔ اگر ایسا ہو سکے تو یہ ایک عارضی صورت ہوگی۔ لیکن اگر دوران جنگ قائم رہ جائے تو پھر اختتام جنگ کے بعد کانگرس اور مسلم لیگ میں مستقل بنیاد پر مفاہمت آسان ہو جائے گی۔ چند مشترک دوستوں نے اس سلسلے میں مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر لیاقت علی خاں سے اور بھولا بھائی ڈیسائی سے ملاقات کی۔ لیاقت علی خاں نے اتفاق کا اظہار کیا اور ان کی اور بھولا بھائی ڈیسائی کی ملاقات ہوئی۔

گاندھی جی سے مشورہ کا فیصلہ

بھولا بھائی ڈیسائی اس تجویز سے دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ بات واضح کر دی کہ کانگرس کی منظوری کے بغیر وہ کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتے۔ انہوں نے زور دیا کہ مفاہمت صرف لیجسلیچر کی دونوں پارٹیوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان بھی ہونی چاہیے۔ کانگرس کے تمام لیڈر جیل میں تھے اُن سے صلاح و مشورہ کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ گاندھی جی کے پاس جائیں گے اور اُن کے مشورہ پر کاربند ہوں گے۔ (۴)

گاندھی جی کی تحریری رضامندی

بھولا بھائی ڈیسائی گاندھی جی سے ملے اور اُن سے لیاقت علی خاں اور دوسرے اصحاب سے ملاقات کی تفصیل بیان کی۔ گاندھی جی ہر پیر کو چُپ کا روزہ رکھتے تھے۔ اتفاق کی بات بھولا بھائی ڈیسائی کی ملاقات اُن سے پیر کے دن ہوئی۔ گاندھی نے گجراتی زبان میں جواب لکھ کر دے دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں اور ضروری تفصیلات کی رپورٹ دیتے رہیں۔

تجویز مفاہمت منڈھے نہیں چڑھی

گاندھی جی کی حمایت سے مسلح ہو کر بھولا بھائی ڈیسائی نے اپنی گفت و شنید جاری رکھی اور یہ معاہدہ طے پایا کہ وائسرائے کی نئی ایگزیکٹو کونسل از سر نو تشکیل

اور وہ صرف کانگریس پارٹی اور لیگ پارٹی کے ممبروں پر مشتمل ہو۔ گفت و شنید کنندگان نے یہ خواہش ظاہر کی کہ کانگریس پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے بھولا بھائی ایگزیکیٹو کونسل میں شریک ہوں۔ لیکن اگر یہ کسی وجہ سے ممکن نہ ہو تو خان عبدالقیوم خان جو اس وقت کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ کونسل میں شریک ہو جائیں۔ بھولا بھائی نے یہ تفصیل گاندھی جی کے گوش گزار کر دی لیکن متعدد وجوہ سے یہ تجویز ناکام ہوئی اور معاملہ رفت گزشت ہو گیا۔ (۴)

حریف بازی لے گئے

۱۹۴۵ء میں جب ہم سب جیل سے باہر آئے تو یہ واقعات ہمارے علم میں بھی آئے۔ اب ان واقعات پر کانگریسی لیڈروں کے مابین بحث مباحثہ شروع ہو گیا۔ بد قسمتی سے اس موقع پر یہ حقیقت بالکل نظر انداز کر دی گئی کہ بھولا بھائی نے جو کچھ کیا گاندھی جی کے علم و اجازت سے کیا۔ سردار پٹیل نے خاص طور پر اس معاملے سے دلچسپی لی اور بحث مباحثہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ یقین کر لیا گیا۔ بھولا بھائی ڈیسائی نے لیاقت علی سے معاہدہ کرتے وقت کانگریس کو پس پشت ڈال دیا اور وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں شریک ہونے کی کوشش کی۔ بھولا بھائی کے حریفوں نے ان کی پرائیویٹ زندگی پر اتہام لگا کر گاندھی جی کو بھی ان کے خلاف کر دیا۔ بیچارے پر جو الزامات لگائے گئے وہ زیادہ تر غلط تھے لیکن کئی مہینے تک مخالفانہ پروپیگنڈا جاری رہا اور اس طرح ان کی شخصیت مستقل طور پر مجروح ہو گئی۔ (۵)

گاندھی جی کے حاشیہ نشین

کچھ لوگوں نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ گاندھی جی کے معتمد رفقا کو متاثر کر کے گاندھی جی کے فیصلے پر اثر انداز ہو جایا کریں۔ یہ لوگ گاندھی جی کے معتمد رفقا سے مختلف بیان کیا کرتے تھے تا کہ یہ باتیں گاندھی جی تک پہنچ جایا کریں۔ عام طور پر گاندھی جی اس قسم کی باتیں ایک کان سے سنتے دوسرے سے اڑا دیتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا اگر مسلسل اور بار بار اُن کے ذاتی حلقے کے لوگ کوئی بات گوش گزار کرتے تو ان کا فیصلہ متاثر ہو جاتا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ گاندھی جی کو اسی طرح موتی لال نہرو کے خلاف مسموم کر دیا گیا تھا۔ جواہر لال بھی ایک مرتبہ اس مہم کے ہدف بن چکے تھے لیکن ان دونوں واقعات میں جب گاندھی جی

کو اصل حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے خوشگوار اور معروضی طرزِ عمل اختیار کر کے معاملہ ختم کر دیا۔ بدقسمتی سے بھولا بھائی کے ساتھ ایسا نہ ہوا اور گاندھی جی اُن سے بدگمان اور برہم ہو کر چلے گئے۔ (۶)

بھولا بھائی کا بیانِ صفائی

میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ وہ پیر کا دن تھا جب بھولا بھائی نے گاندھی جی سے مل کر مسلم لیگ سے گفت و شنید کرنے کی اجازت طلب کی تھی اور گاندھی جی نے اپنا جواب تحریری طور پر دے دیا تھا۔ بھولا بھائی نے گاندھی جی کی یہ تحریر محفوظ رکھی۔ سردار پٹیل اور دوسرے لوگوں کو دکھائی اور کہا کہ یہ گفت و شنید گاندھی جی کے علم اور اجازت سے انہوں نے جاری رکھی تھی لہٰذا وہ کسی طرح بھی سزاوارِ ملامت نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ (۷)

کانگرس کا ٹکٹ نہیں دیا گیا

حقیقت یہ ہے کہ بھولا بھائی نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا تھا اُس کا کوئی جواب اُن کے مخالفین کے پاس نہیں تھا۔ یہ دُکھ دینے والی بات تھی کہ اُن کے احتجاج پر کوئی توجہ نہ کی گئی اور برابر یہی پروپیگنڈا کیا جاتا رہا کہ وہ لیگ کے ساتھ کانگرس کے خلاف سازش کر رہے تھے۔ اُن کے خلاف احساسات اتنے شدید ہو گئے تھے کہ جب عام انتخابات ۴۶-۱۹۴۵ء کے موسم سرما میں منعقد ہوئے تو اسمبلی کی ممبری کے لیے انہیں کانگرس کا ٹکٹ بھی نہیں دیا گیا۔ (۸)

مرضِ قلب کا حملہ

یہ ایک بہت بڑا دھچکا تھا، بھولا بھائی کے لیے! اس کا ان کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ قلب کے مریض وہ پہلے ہی سے تھے لیکن اب متواتر دورے پڑنے لگے۔ انہیں اس بات کا غم تھا کہ انہوں نے وفاداری کے ساتھ کانگرس کی خدمت کی، کانگرس کی راہ میں تشدّد اور مصائب برداشت کیے اور اس کا صلہ کیا ملا —— ذلت اور اخراج —— ! (۹)

اسی غم میں انتقال

اس واقعہ کے بعد میں پھر بمبئی گیا اور حسبِ معمول بھولا بھائی کے ہاں ٹھہرا۔ وہ بسترِ علالت پر دراز تھے۔ جب میں نے اُن سے خیریت دریافت کی تو وہ اتنے متاثر ہوئے کہ جواب دینے کے بجائے رونے لگے۔

انہیں سب سے بڑا غم اس بات کا تھا کہ گاندھی جی نے بھی جو تمام حقائق سے باخبر تھے۔ بجنۂ چینیوں کے مقابلے میں ان کی حمایت نہ کی۔ میں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن میری کوشش ناکام ہوئی۔ میں نے یہ واقعہ گاندھی جی سے جب بیان کیا تو میں نے محسوس کیا کہ بھولا بھائی کے خلاف ان کے کان اتنے بھرے جا چکے تھے کہ اب اُن کے دل میں اس غریب کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ کچھ ہی عرصے بعد بھولا بھائی کا انتقال ہو گیا۔ دل کی حرکت بند ہو گئی۔ (۱۰)

خدمت کا صلہ عتاب جب کبھی بھی یہ واقعہ یاد آجاتا ہے مجھے بڑا صدمہ ہوتا ہے کیونکہ بھولا بھائی نے کانگرس کی خدمت دل وجان سے کی تھی لیکن بغیر کسی سبب کے وہ معتوب قرار دیے گئے۔ (۱۱)

(ص: ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷)

بھولا بھائی ڈیسائی کے بارے میں مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے کئی حقائق برافگندہ نقاب ہوتے ہیں۔

(۱)

یہ واقعہ کانگرس کے آمرانہ رجحان کی غمازی کر رہا ہے۔ سر کرپس سے اگر ورکنگ کمیٹی کے ممبر ملاقات کر لیتے یا تبادلۂ خیالات کی انہیں اجازت دے دی جاتی تو نہ کانگرس کی تنظیم میں کوئی رخنہ پڑتا نہ کوئی ممبر بالا بالا سر کرپس سے ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کر لیتا۔ فیصلہ تو بہرحال کانگرس کو من حیث الجماعت کرنا تھا۔

(۲)

بھولا بھائی ذاتی طور پر بڑے شریف اور مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اختلاف فکر و نظر کے باوجود لوگ اُن کی عزت کرتے تھے اور انہیں احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

مارچ ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے۔ میں بمبئی سے دہلی گیا اور حسبِ معمول قرول باغ میں بیگم محمد علی کی قیام گاہ پر ٹھہرا۔ مولانا شوکت علی مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے۔ وہ بھی یہیں ٹھہرے تھے، میں انہیں سے ملنے اور روزنامہ "خلافت" اور خلافت پریس کے

بعض معاملات پر صلاح و مشورہ کرنے گیا تھا۔

دوسرے دن صبح کو جب وہ اسمبلی جانے لگے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ سر عبدالرحیم صدر اسمبلی تھے۔ ان کے سیکرٹری سے کہہ کر صدر کی گیلری کا پاس مجھے دلوایا۔ دوپہر کے لیے جب اجلاس برخاست ہوا تو اسمبلی کے ہوٹل میں ہم لوگوں نے لنچ کھایا۔ مشہور تحریکِ خلافت کے مسٹر حسن علی اور ناگپور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مصباح العثمان مولانا کے علی گڑھ کے رفقا تھے اور بڑے عزیز اور محبوب دوست تھے۔ درحقیقت ”گسٹ آف آنر“ یہی دونوں حضرات تھے۔ میں تو طفیلی تھا۔

لنچ کے بعد حسن علی صاحب اور عثمان صاحب تو چلے گئے، مولانا پھر اسمبلی ہال میں پہنچ گئے اور میں اپنی نشست پر بیٹھ کر کارروائی دیکھنے لگا۔ کوئی پانچ بجے کے قریب اجلاس ختم ہوا۔ ہم لوگ کار میں آکر بیٹھ گئے۔ مولانا نے ڈرائیور سے فرمایا:

”امپیریل ہوٹل چلو!“

ذرا دیر میں کار امپیریل ہوٹل پہنچ گئی۔ ہال میں ایک پارٹی کا انتظام تھا۔ یہ پارٹی بھولا بھائی نے دی تھی۔ دروازے پر وہ اور ان کے صاحبزادے دھیرو بھائی مہمانوں کی پیشوائی کر رہے تھے۔ بھولا بھائی سفید کھدر کے چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی میں ملبوس تھے۔ اردو میں مہمانوں سے مسکرا مسکرا کر بات چیت کر رہے تھے۔ لب و لہجہ شستہ، تلفظ درست۔

اس پارٹی میں کانگرس کے رہنماؤں کے علاوہ ہر طبقے اور ہر خیال کے سر برآوردہ اصحاب موجود تھے۔ جسٹس سر شاہ سلیمان جج فیڈرل کورٹ آف انڈیا، مولانا شوکت علی، قائداعظم، میر غلام بھیک نیرنگ اور بہت سے دوسرے مختلف الخیال زعما موجود تھے مختلف النوع اجتماع نتیجہ تھا بھولا بھائی کی دل آویز اور سحر طراز شخصیت کا۔

(۳) اور ظاہر ہے کہ گاندھی جی کا فیصلہ کانگرس کا فیصلہ تھا۔ جس بات پر گاندھی جی صاد کر دیں جو چیز گاندھی جی منظور کر لیں، کانگرس کبھی اور کسی طرح اس سے انحراف کر ہی نہیں سکتی تھی۔

(۴)

اس سلسلے میں خان عبدالقیوم خاں کا نام مولانا نے لیا ہے۔ یہ وہی خان عبدالقیوم خاں

ہیں جن کی منزلت کا کانگریس میں یہ عالم تھا کہ مرکزی اسمبلی میں ڈپٹی لیڈر کے منصب پر فائز تھے اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں کانگریس کے لیڈر کی حیثیت سے ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

جب کانگریس کی ہٹ دھرمی اور مسلم آزادی سے مایوس ہو کر انہوں نے نعرہ لگایا

یاں قافلہ لٹتا ہے بس اب یاں سے چل اے دل
تو آپ ہی کہہ دے گا کہ منزل تو نہیں ہے!

اور مسلم لیگ میں صدق و اخلاص کی متاع لے کر شریک ہو گئے تو یہی کانگریسی لیڈر یہ اعلان کرنے لگے کہ خان عبدالقیوم خان اس قابل کب تھے کہ کانگریس میں رہیں کانگریس سے ان کا نکل جانا اچھا ہی ہوا۔

(۵)

جیسا کہ مولانا نے فرمایا ہے کہ سردار پٹیل نے خاص طور پر اس معاملہ میں دلچسپی لی، واقعہ بھی یہ ہے کہ بھولا بھائی کو بدنام کرنے میں اور انہیں ہدف ستم بنانے میں سردار پٹیل پیش پیش تھے۔ ان کا بس چلتا تو گاندھی جی کو بھی معاف نہ کرتے۔ لیکن گاندھی جی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے لہٰذا نزلہ بر عضو ضعیف می ریزد بیچارے بھولا بھائی سردار پٹیل کی تعزیر یا انتقام سے نہ بچ سکے۔

(۶)

اکثر بڑے آدمیوں کی طرح گاندھی جی میں بھی یہ کمزوری تھی کہ وہ اپنے حاشیہ نشینوں کی بات پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر لیتے تھے۔

مولانا محمد علی کو بھی گاندھی جی سے یہی شکایت تھی، وہ فرمایا کرتے تھے "مہادیو ڈیسائی گاندھی جی کے نفس ناطقہ ہیں، جس سے بھی گاندھی جی کے تعلقات خراب ہوتے ہیں اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا یہ مہادیو ڈیسائی کی سازش اور دراندازی کا نتیجہ ہے۔

علی برادران سے گاندھی جی کی الفت اور شیفتگی کا وہ عالم تھا جس کا آج کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن گاندھی جی اور علی برادران کے درمیان جو خلیج پیدا ہوئی وہ گاندھی جی کے انہی حاشیہ نشینوں کی کارفرمائی تھی۔ گاندھی جی رفتہ رفتہ علی برادران کے خلاف اتنے مسموم ہو گئے کہ ان کی سچی اور مبنی بر اصول باتوں کو بھی ناقابل التفات

سمجھنے لگے، اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ کسے نہیں معلوم؟

(۷)

لیکن مصیبت یہ تھی کہ جو سزاوارِ ملامت ٹھہرایا جا سکتا تھا یعنی گاندھی جی اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت کسی میں نہ تھی لہٰذا اُسے تاکا گیا جو گو سزاوارِ ملامت نہ تھا لیکن مزاحمت اور مقاومت کی طاقت نہیں رکھتا تھا لہٰذا نہ صرف وہ سزاوارِ ملامت ٹھہرایا گیا بلکہ اُسے معتوب و مردود قرار دے دیا گیا۔

(۸)

ٹکٹ دینے کا فیصلہ جس بورڈ کے ہاتھ میں تھا اس کے ایک ممبر خود مولانا بھی تھے اگر انہوں نے بھولا بھائی کی آتنی پُرزور وکالت وہاں کی ہوتی تو شاید عبرتناک انجام بیچارے کا نہ ہوتا۔

(۹)

خدمت اور وفاداری کا یہ صلہ کانگرس کی طرف سے صرف بھولا بھائی ہی کو نہیں ملا ایسے مظلوموں کی فہرست بہت لمبی ہے۔

اکیلے داغ تم ہی نے نہیں اٹھائے ستم
یونہی ازل سے مرے یار ہوتی آئی ہے

(۱۰)

بھولا بھائی کی شرافت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا کہ اس غم میں گھل گھل کر جان دے دی لیکن بہ بلک طور پر حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔

(۱۱)

اس موقع پر میں ڈاکٹر کھارے کے ایک اہم اور معرکہ آرا بیان کا کچھ حصہ پیش کروں گا۔

پہلے ڈاکٹر کھارے کا تعارف کرا دوں:

ڈاکٹر کھارے سی پی کے سب سے بڑے کانگرسی لیڈر تھے۔ سی پی میں جب پہلی کانگرسی وزارت بنی تو وزارتِ اعلیٰ کی پگڑی انہی کے سر باندھی گئی۔

ڈاکٹر کھارے اپنے مزاج، طبیعت اور زبان کے اعتبار سے بڑے کھرے آدمی

واقع ہوتے ہیں۔ سردار پٹیل نے سندھیا اسٹیم نیوی گیشن کمپنی کے مینیجنگ ڈائریکٹر والچند ہیرا چند کے بھائی کی سفارش کی کہ ایک بہت بڑا سرکاری ٹھیکہ انہیں دیا جائے۔ ڈاکٹر کھارے نے سردار کی اس سفارش کا کوئی اثر نہیں لیا اور جو مناسب سمجھا کیا۔ مسٹر نیاز محمد خاں سی پی کے ایک دیانتدار اور کارگزار پولیس افسر تھے۔ جب مسٹر ... مشہور کانگرسی لیڈر پر ایک مسلمان لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کا الزام عائد ہوا اور پولیس نے تفتیش شروع کی تو بڑے بڑے کانگرسی نیتاؤں نے ڈاکٹر کھارے پر زور دیا کہ نیاز محمد خاں کو موقع واردات سے تبدیل کر دیں۔ لیکن ڈاکٹر کھارے نے نہایت کٹر ہندو ہونے کے باوجود یہ بات نہ مانی۔

سردار پٹیل نے گاندھی جی کے کان کھارے کے خلاف بھرنے شروع کیے۔ رفتہ رفتہ گاندھی جی اُن سے ناراض ہو گئے۔ ڈاکٹر کھارے نے گاندھی جی کی خوشامد کرنے کے بجائے وزارت اور کانگرس سے مستعفی ہونے کا ارادہ کر لیا۔ بعد میں انہیں دوبارہ گاندھی جی کے حلقۂ عقیدت میں شریک کرنے کی بار بار کوشش کی گئی لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔ ۱۹۴۲ء کی توڑ پھوڑ تحریک کے زمانے میں کچھ عرصے تک لارڈ لن لتھ گو وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہے۔ پھر جب گاندھی جی نے مرن برت رکھا اور وائسرائے نے سخت رویہ اختیار کیا تو یہ مستعفی ہو گئے اس لیے نہیں کہ انہیں گاندھی جی سے ہمدردی تھی بلکہ اس لیے کہ یہ گاندھی جی کی اختیاری موت کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینا چاہتے تھے۔

رہائی کے بعد گاندھی جی خود اُن سے ملے اور دوبارہ کانگرس میں شریک ہو جانے کا مشورہ دیا لیکن یہ بھی اپنی آن کے پکے تھے، جواب دیا، جب تک کانگرس مجھ سے معافی نہ مانگ لے اس وقت تک میں اس تجویز پر غور نہیں کر سکتا۔

انہی ڈاکٹر کھارے نے مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کی وفات سے ایک دن پہلے یعنی ۱۹ر مئی ۱۹۴۶ء کو "ترنا بھارت" ایک مرہٹی روزنامہ کو یہ بیان دیا تھا۔

"جن دنوں مسٹر ڈیسائی آزاد ہند فوج کی پیروی کر رہے تھے، میری ان سے ۱۹، ۲۰، دسمبر ۱۹۴۵ء کو آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کے ڈیفنس کے سلسلے میں ملاقات ہوئی تھی۔ سرکاری

کام کے بعد مسٹر ڈیسائی نے مجھ سے پوچھا، "گاندھی جی سے تمہاری کیا بات چیت ہوئی؟" میں نے جواب دیا۔

"میں نے گاندھی جی سے صاف کہہ دیا جب تک کانگرس ورکنگ کمیٹی میرے خلاف منظور شدہ ریزولیوشن واپس نہیں لے لیتی، اپنی غلطی پر اظہارِ افسوس نہیں کرتی میرا کانگرس میں شامل ہونا بے معنی ہے۔"

گاندھی جی نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

میں نے کہا "اگر کانگرس ورکنگ کمیٹی یہ اعلان کر دے کہ اس نے میرے بارے میں غلطی کی تھی، پھر میں کانگرس میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کر سکوں گا۔"

میری یہ بات سن کر مسٹر ڈیسائی نے مجھ سے کہا:

"کانگرس ہائی کمان نے میرے ساتھ بھی ویسی ہی کارروائی کی ہے جیسی آپ کے ساتھ کی تھی۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں میں نے نواب زادہ لیاقت علی خاں سے ایک معاہدہ کیا جسے گاندھی جی کی منظوری حاصل تھی اسی معاہدے کے نتیجے کے طور پر لارڈ ویول انگلستان گئے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہا ہوئے اور شملہ کانفرنس منعقد ہوئی مجھے قدرتاً یہ توقع تھی کہ شملہ کی گفت و شنید میں مجھے شریک رکھا جائے گا۔ لیکن کانگرس ورکنگ کمیٹی کے پہلے ہی اجلاس میں سردار پٹیل اور پنڈت نہرو نے میرے فعل (معاہدہ) پر سخت نفرت ظاہر کی، مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے کانگرس کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔ مجھے اس بات کا بڑا صدمہ ہوا۔ میں یہ بات گاندھی جی کے علم میں لایا۔ انہوں نے کہا:

"ورکنگ کمیٹی کے ممبر تمہیں پسند نہیں کرتے، تمہیں ضد نہیں کرنی چاہیے۔ آج ورکنگ کمیٹی میں قوم ہے۔"

میں نے جواب دیا:

"ورکنگ کمیٹی کو رہا کرانے والا میں، اسمبلی پارٹی کا لیڈر میں!"

گاندھی جی نے کہا:

"مجھے تم سے ڈر لگتا ہے تمہیں وائسرائے کی کونسل میں شریک نہیں ہونا چاہیے، مجھے لکھ کر دے دو کہ تم اس عہدے کے قابل نہیں ہو!"

یہ سن کر مجھے آپ (کھارے) کا قصہ یاد آ گیا، میں نے گاندھی جی سے کہا "آپ نے ڈاکٹر کھارے سے بھی ناانصافی کی تھی۔ میں ایسی کوئی تحریر آپ کو نہیں دوں گا اور نہ کبھی میں ایسی تجویز منظور کر سکتا ہوں۔"

میں نے ڈیسائی سے پوچھا:

"آپ نے یہ بات پبلک میں کیوں نہیں کہی؟"

مسٹر ڈیسائی نے جواب دیا:

"گالیاں دینا میرا شیوہ نہیں ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ مسٹر ڈیسائی کی اسی صدمے کے باعث موت ہوئی۔"

جواہر لال نہرو

جواہر لال انگریزوں کے ہمدرد تھے

جواہر لال نے کرپس کے لندن واپس جاتے ہی نیوز کرانیکل کے نمائندے کو ایک بیان دیا جس کا مفاد یہ تھا کہ کانگرس نے کرپس پیش کش مسترد کر دی لیکن ہندوستان برطانیہ کی مدد کرنے کو تیار ہے۔ مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ جواہر لال کا یہ بیان عوام کو اضطراب خیال میں مبتلا کر دے گا۔ وہ الہ آباد جا چکے تھے، میں کلکتہ واپس جانے کے انتظامات مکمل کر چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ راستہ میں الہ آباد اترتا ہوا جواہر لال سے گفتگو کر کے آگے بڑھوں گا۔ میں نے جواہر لال سے کہا کہ ورکنگ کمیٹی ایک تجویز منظور کر چکی ہے اگر انہوں نے کوئی ایسا بیان دیا جس سے یہ تاثر پیدا ہو کہ کانگرس مساعی جنگ کی مخالفت نہ کرے گی تو ورکنگ کمیٹی کی ساری کی ساری تجویز دھری رہ جائے گی، جواہر لال شروع میں تو بحث پر آمادہ ہو گئے لیکن آخر میری رائے انہوں نے مان لی، مجھے بڑی خوشی ہوئی جب انہوں نے یہ کہا کہ اب وہ کوئی بیان نہیں دیں گے۔ (۱)

جواہر لال کی صفائی

یہاں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جواہر لال تمام مسائل پر بین الاقوامی نقطہ نظر سے غور کرنے کے عادی ہیں۔ (۲)

جواہر لال کرپس تجاویز کے حق میں تھے

اس ساری مدت میں جواہر لال سخت ترین ذہنی پریشانی میں مبتلا رہے، وہ ابھی کچھ دن ہوئے چین کا دورہ کر کے واپس آئے تھے، وہ چیانگ

کائی تیتاپ اور ان کی اہلیہ سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ایک مرتبہ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے دوران میں جواہر لال میرے پاس آئے، ہم میں جو گفتگو ہوئی اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کرپس پیش کش قبول کر لینے پر تیار ہیں، اگرچہ برطانیہ کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔

مفادِ ہند کے خلاف جواہر لال کا رویہ

اس گفتگو سے میں بہت پریشان ہوا، دو بجے رات تک سو نہ سکا۔ صبح ہوتے ہی شریمتی راجیشوری نہرو کے گھر گیا جہاں جواہر لال مقیم تھے، ایک گھنٹے سے زیادہ عرصہ تک ہم میں گفتگو ہوتی رہی، میں نے ان سے کہا کہ ان کے خیالات کا رجحان ہمارے بہترین ملکی مفاد کے خلاف ہے، اگر حقیقی اختیارات ہندوستان کو نہیں منتقل ہوتے اور وائسرائے کی صرف نئی ایگزیکٹو کونسل تشکیل پذیر ہوتی ہے تو کرپس پیش کش سے جو چیز ہمیں حاصل ہو گی وہ ہے صرف وعدہ! وہ بھی وعدہ فردا۔ (۳)

جواہر لال جھک گئے

جواہر لال دُنیا کے تازہ واقعات و حوادث سے بہت زیادہ آشفتہ خاطر تھے، انہیں خود بھی اپنے موقف پر اطمینان نہیں تھا، ان کے دماغ میں جو کشمکش ہو رہی تھی، اس نے انہیں بے حس بنا دیا تھا، کچھ دیر تک وہ چپ چاپ میری باتیں سنتے رہے، پھر انہوں نے کہا، میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ذاتی رجحانات کی بنا پر کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتا، میرا فیصلہ وہی ہو گا جو میرے رفقاء کا ہو گا۔ (۴)

ذہنی بوجھ

جواہر لال کی فطرت کچھ اس طرح کی ہے کہ جب وہ دماغی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں تو نیند کی حالت میں بھی باتیں کرنے لگتے ہیں شریمتی راجیشوری نہرو نے مجھے بتایا گزشتہ دو روز سے جواہر لال سوتے میں خوب باتیں کرتے ہیں۔ وہ کسی مسئلہ پر مباحثہ کرتے نظر آتے ہیں، کبھی چپکے چپکے بڑبڑانے لگتے ہیں۔ کبھی زور سے بولنے لگتے ہیں۔ حالتِ خواب میں گفتگو کرتے وقت کبھی کرپس کا نام لیتے ہیں، کبھی گاندھی جی کا حوالہ دیتے ہیں، کبھی آپ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ مزید ثبوت اس بات کا تھا کہ کتنا بڑا ذہنی بوجھ تھا جس کے ماتحت ان کا دماغ کام کر رہا تھا۔ (۵)

(ص ٦٢، ٦٦، ٦٥/٦٤)

برگشتگی کا نتیجہ نہیں تھی ۔انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کیا کہ ان کی رائے غلط تھی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اب یہ باتیں ہم فراموش کر دیں ۔ مجھے جواہر لال سے یہی توقع تھی ،ان کی فطرت کچھ ویسی ہے کہ جب وہ کسی خیال سے متاثر ہوتے ہیں تو کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اس کا اظہار کر دیتے ہیں ۔ لیکن بعد میں اپنی غلطی کا احساس کرتے ہیں تو اس کے اعتراف میں بھی تامل نہیں کرتے ، میں اس صاف گفتگو سے بہت متاثر ہوا ، وہ اور میں ہمیشہ گہرے دوست رہے تھے اور اس بات نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی تھی کہ ہم دونوں کے درمیان کسی طرح کا بھی اختلاف ہو ۔(۱۳)

(ص: ۱۳۰)

کشمیر میں جواہر لال کی گرفتاری

(کابینہ وفد ہندوستان میں موجود ہے، شیخ عبداللہ نے کشمیر خالی کر دو ، کا نعرہ لگایا مہاراجہ نے انہیں گرفتار کر لیا ۔)

جواہر لال کشمیر کی اس جد و جہد سے جو نمائندہ حکومت کے لیے جاری تھی ہمیشہ سے دلچسپی لیتے آئے ہیں ، جب شیخ عبداللہ گرفتار کر لیے گئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ کشمیر جانا چاہیے ، یہ بھی خیال کیا گیا کہ شیخ عبداللہ اور ان کے رفقا کے لیے قانونی امداد مہیا کرنے کا انتظام کیا جائے ، میں نے آصف علی سے کہا کہ یہ کام وہ کریں ، جواہر لال نے کہا کہ وہ آصف علی کے ساتھ کشمیر جائیں گے ، دونوں روانہ ہو گئے مہاراجہ کی حکومت اس فیصلہ سے بہت پریشان ہوئی ۔اس نے ان دونوں کے داخلہ پر پابندی عائد کر دی ، یہ لوگ راولپنڈی سے آگے بڑھ کر جب کشمیر کی سرحد پر پہنچے تو اوڑی میں انہیں روک لیا گیا انھوں نے مہاراجہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا مہاراجہ کی حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا ، اس واقعہ سے سارے ہندوستان میں سنسنی پھیل گئی ۔ (۱۴)

جواہر لال نے غلطی کی

جہاں میں حکومت کشمیر کے اس اقدام پر سخت نادم تھا وہاں میرے خیال میں کشمیر کے معاملہ پر اس وقت ایک نئی جنگ شروع کرنا بھی مناسب نہ تھا ۔

(ص ۱۴۸)

جواہر لال کی فطرت (عارضی حکومت قائم کرنے کے بعد صوبہ سرحد سے اطلاع ملتی ہے کہ ڈاکٹر خان کے چیف منسٹر ہونے کے باوجود صوبہ سرحد کے لوگ کانگرس کے بجائے مسلم لیگ کے وفادار ہیں، جواہر لال اس سرکاری رپورٹ کو من گھڑت قرار دیتے ہیں اور صوبہ سرحد کے دورے کا فیصلہ کر لیتے ہیں)

جواہر لال کی فطرت کچھ اس قسم کی ہے کہ اکثر ان کے اقدامات وقتی جذبے اور ہیجان کے تابع ہوتے ہیں، ویسے وہ دوسروں کی بات سننے پر آمادہ رہتے ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حقائق پر غور کیے بغیر وہ کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں اور جب فیصلہ کر لیں تو اس پر اڑ جاتے ہیں، پھر نتائج سے بے پروا آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اپنے فیصلہ پر جواہر لال اڑے رہے جب مجھے اس فیصلہ کا علم ہوا، میں نے جواہر لال سے کہا کہ وہ جلد بازی سے کام نہ لیں، کانگرس نے مرکز میں ابھی ابھی وزارت قبول کی ہے اور ابھی اپنے آپ کو وہ مستحکم نہیں کر سکی، اس موقع پر اگر انہوں نے سرحد کا دورہ کیا تو ناراضامند عناصر کو کانگرس کے خلاف سرگرم عمل ہونے کا موقع مل جائے گا لہٰذا بہتر یہ ہے کہ کسی دوسرے مناسب وقت کے لیے دورہ ملتوی کر دیں۔ گاندھی جی نے بھی میری تائید کی، لیکن جواہر لال اپنی بات پر اڑے رہے، انہوں نے کہا نتائج خواہ کچھ بھی ہوں وہ بہر حال سرحد جائیں گے۔ (۱۵)

(ص ۱۶۹ / ۱۷۰)

ماؤنٹ بیٹن اور جواہر لال (مارچ ۴۷ء میں نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سردار پٹیل کو تقسیم ہند کا قائل کر لیا ہے)

اب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی عنان توجہ جواہر لال کی طرف مبذول کی، پہلے پہل تو جواہر لال نے نہایت سختی سے تقسیم ہند کے تخیل کی مخالفت کی، لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ترغیب اس وقت تک جاری رہی جب تک رفتہ رفتہ جواہر لال کی مخالفت کمزور نہ پڑ گئی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان آنے کے ایک مہینے کے اندر ہی اندر تقسیم ہند کے نعرے کا مخالف جواہر لال اگر اس کا پرزور حامی نہیں تو کم از کم خاموش سامع بن گیا۔ (۱۶)

لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا اثر جواہر لال پر: مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے کہ لارڈ

ماؤنٹ بیٹن نے کس طرح جواہر لال کو جیت لیا، جواہر لال ایک با اصول آدمی ہیں لیکن جذباتی بھی ہیں اور شخصی اثرات سے متاثر بھی ہو جاتے ہیں ہو سکتا ہے کہ سردار پٹیل کی بحث نے ان پر کوئی اثر کیا ہو، لیکن وہ اثر بہر حال فیصلہ کن نہیں تھا، جواہر لال لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے بہت زیادہ متاثر تھے اور ان سے بھی زیادہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا ان پر اثر تھا، وہ نہ صرف نہایت ذہین خاتون ہیں بلکہ دل کو موہ لینے والے اطوار اور دوستانہ انداز کی بھی مالک ہیں، وہ اپنے شوہر کی انتہا سے زیادہ مداح ہیں، اکثر مواقع پر وہ ان لوگوں کے سامنے اپنے شوہر کی ترجمانی بڑے دلآویز پیرایہ میں کرتی ہیں، جو ان سے متفق نہیں ہوتے۔

کرشنا مینن اور جواہر لال

دوسرا شخص جس نے اس مسئلہ پر جواہر لال کو پرچایا کرشنا مینن تھا، میں جانتا ہوں جواہر لال اس کے مشورے کان دھر کر سنتے ہیں، میں نے محسوس کیا کہ کرشنا مینن نے اکثر انہیں غلط مشورہ دیا۔ سردار پٹیل اور میں کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی بات ایک ہی طرح سوچیں، لیکن ہم دونوں کرشنا مینن کی بدخوئی پر متفق تھے۔ (۱۸)

(ص ۱۸۳، ۱۸۴)

جواہر لال تقسیم ہند کے مبلغ بن گئے

چند روز بعد جواہر لال مجھ سے ملنے آئے انہوں نے کہا کہ ہمیں خوش خیالی میں نہیں مبتلا رہنا چاہیے۔ حقیقت کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ آخر میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں تقسیم ہند کی مخالفت ترک کر دوں، انہوں نے کہا کہ تقسیم یقینی ہے اور یہ عقلمندی نہیں ہے کہ جو بات بہر حال ہونے والی ہے اس کی مخالفت کی جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ بات دور اندیشی سے بعید ہے کہ اس مسئلہ پر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی مخالفت کروں۔ (۱۸)

جواہر لال سے میرا اختلاف

میں نے جواہر لال سے کہا کہ میں یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں صاف طور پر دیکھ رہا ہوں کہ ہم ایک کے بعد دوسرا غلط فیصلہ کر رہے ہیں، میں نے جواہر لال کو متنبہ کیا کہ اگر تقسیم پر رضا مند ہو گئے تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی، تاریخ کی شہادت یہ ہو گی کہ تقسیم مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کے اشتراک سے عمل میں آئی ہے۔ (۱۹) (ص [illegible])

جواہر لال اور دلی کا قتل عام

(دلی میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو چکا ہے، حکومت کے مقرر کردہ اسپیشل مجسٹریٹ اور فوجی سپاہی بھی مسلمانوں کے قتل و غارت میں حصہ لے رہے ہیں)

۴۷، ۱۹۴۶ء کے لرزہ خیز زمانہ میں جواہر لال نے یکتا ایڈمنسٹریٹر ہونے کا ثبوت دیا۔ وزیر بننے کے پہلے ہی دن سے انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ حکومت کو اپنے شہریوں کے درمیان کسی طرح کا امتیاز روا نہ رکھنا چاہیے۔ اسے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی اور بدھ سب سے مساویانہ سلوک کرنا چاہیے۔ جو شخص بھی ہندوستان کا شہری ہے وہ قانون کی نظر میں یکساں حقوق کا حامل ہے۔ (۲۰)

فسادات بہار اور جواہر لال

جواہر لال کے ایڈمنسٹریٹر ہونے کی صلاحیت کا پہلا مشاہدہ ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ کلکتہ کی خونریزی کے بعد ہی نواکھالی میں فسادات پھوٹ پڑے، جہاں ہندوؤں کو بے حد نقصان اٹھانا پڑا۔ بہار کے ہندوؤں نے نواکھالی کے ہندوؤں کا بدلہ لینے کے لیے مقامی مسلمانوں کو ہدف ستم بنا لیا اور بہار کے سارے صوبے میں وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کے قتل و بربادی کا بازار گرم ہو گیا۔ صوبائی حکومت اس صورت حال سے عہدہ برآ نہ ہو سکی۔ حکومت ہند کو سختی کے ساتھ قدم اٹھانا پڑا، اس زمانے میں تقریباً دو ہفتے تک میں پٹنہ میں مقیم رہا، میں اس بات سے بہت متاثر ہوا کہ وہ پوری قوت اور سختی سے مسلمانوں کی تباہی و بربادی روکنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ ہم سب اسی کام میں مصروف تھے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کار دشوار میں سب سے نمایاں حصہ جواہر لال نے لیا۔ (۲۱) (ص ۲۱۲، ۲۱۳)

جواہر لال کے بارے میں مولانا کے تاثرات و خیالات بڑے وقیع ہیں، اس لیے اہم اور مستند بھی!

مولانا کے اور جواہر لال کے تعلقات ذاتی نوعیت کے [illegible] زندگی کی آخری سانس تک قائم رہے۔ ان تعلقات میں دوستی تھی، اپنائیت [illegible] ی، وطن کا نباہ

اگر یہ کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ کانگرس سے آخر وقت تک مولانا کے وابستہ رہنے میں جہاں دوسرے فکری و نظری عوامل کارفرما تھے وہاں موتی لال اور جواہر لال سے ان کے عزیزانہ تعلقات بھی ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا نے جواہر لال کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اس کے بعض پہلوؤں پر گفتگو ناگزیر ہے۔

(ا)

مساعی جنگ کے سلسلہ میں، جواہر لال کی روش یہ تھی کہ وہ انگریزوں کا ساتھ دینے کو اور محوریوں خاص طور پر جاپان کا سر کچلنے کو بے تاب تھے، اس روش کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بلا شبہ اس میں فکری و نظری عناصر ہی نظر آئیں گے، لیکن جو بات خاص طور پر جواہر لال کو متاثر کر رہی تھی وہ تھا "لا لحب علی بل لبغض معاویہ" والا معاملہ، جواہر لال کسی طرح بھی سوبھاش بوس کو گوارا نہیں کر سکتے، سارے ہندوستان میں وہی ایک ایسے شخص تھے جو ان کے کامیاب حریف تھے، وہ کسی بات میں بھی جواہر لال سے پیچھے نہیں تھے۔ قابلیت، خدمات، ایثار، قربانی، بے خوفی، دلیری، حب وطن، ہر دلعزیزی، قبول عام، تدبر، معاملہ فہمی، ہر منزل میں وہ جواہر لال سے اگر آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں تھے، اور ایک بات میں آگے بھی تھے،

جواہر لال اپنی آزاد روی کے باوجود ہر معاملہ میں "باپو" یعنی گاندھی جی کے سامنے جھک جانے کے عادی تھے، سوبھاش چندر بوس نے یہ کام سیکھا ہی نہیں تھا، وہ باپو کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتے تھے، لیکن خود باپو کے نقش قدم پر رہ روی کریں، یہ ناممکن تھا، اس چیز نے عوام میں انہیں جواہر لال سے زیادہ ہر دلعزیز بنا دیا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ گاندھی جی، جواہر لال، سردار پٹیل، مولانا آزاد، راجندر پرشاد سب نے گھٹنے ٹیک دیے مگر انہیں دوبارہ صدر کانگرس ہونے سے نہ روک سکے۔

جنگ شروع ہونے کے بعد بوس کی سرگرمیوں نے اسے نہ صرف ہندوستان کا بلکہ ایشیا کا ہیرو بنا دیا، گاندھی جی تو مصلحت دیکھ کر اس کا کلمہ پڑھنے لگے، اور بغیر اس کے کہ اس نے معافی مانگی، از خود انہوں نے اسے معاف کر دیا، لیکن

جواہر لال مصالحت نہ کر سکے، انہیں حریف کو زک دینے کی صورت یہی نظر آئی کہ اس کے مخالف کیمپ کا ساتھ دیا جائے، چنانچہ ساتھیوں کو روکنے کے باوجود وہ بار بار مسائی جنگ کے سلسلہ میں ایسا بیان دے دیتے تھے جو انگریزوں کے لیے مفید مطلب ہوتا تھا جس سے کانگرس کی سوچے بازی پر بُرا اثر پڑتا تھا۔

(۲)

مولانا نے جواہر لال کی جو صفائی "قومی اور بین الاقوامی حدود" کو قائم کر کے دی ہے وہ قابلِ قبول نہیں ہے، قومی معاملات ہوں یا بین الاقوامی ہر معاملہ میں ان کی روش وہی ہوتی ہے جو ان کے اغراض و مقاصد کے قریب ہوتی ہے، کشمیر کا مسئلہ "قومی" ہے، تبت کا "بین الاقوامی"، لیکن دونوں مسائل کی نوعیت یکساں ہے، مگر کیا جواہر لال کا طرزِ عمل بھی یکساں ہے؟

(۳)

لیکن جواہر لال کے سامنے نہ کرپس تھے نہ مولانا آزاد نہ کانگرس، وہ تو ہر مسئلہ کا لوس کی روشنی میں مطالعہ کر رہے تھے اور اسی بنیاد پر رائے قائم کرتے تھے

(۴)

یہ جواہر لال کی دیرینہ عادت اور اسی عادت نے انہیں گاندھی جی کا چہیتا بنا دیا تھا۔

۱۹۳۳ء میں جب گاندھی اروِن پیکٹ ہوا تو درحقیقت وہ گاندھی جی کی طرف سے اعترافِ شکست تھا۔ وائسرائے نے گاندھی جی کا کوئی خالص مطالبہ نہیں منظور کیا تھا، سول نافرمانی کے اسیروں کی بڑی تعداد تک رہا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بعض دہشت پسندوں کو پھانسی کی سزا ہو چکی تھی، ان کے لیے گاندھی جی نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن وائسرائے لارڈ اروِن ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر بھی گاندھی جی نے صلح کر لی۔

جواہر لال نے اپنی خود نوشت میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم لوگ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں سو رہے تھے، رات گئے گاندھی جی لارڈ اروِن سے معاہدہ صلح کر کے واپس تشریف لائے، ہم سب کو جگا کر معاہدہ

دکھایا گیا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے بہترین شکست کے بجائے صلح کہا جا سکے۔ اس حادثہ نے میرے ہوش و حواس پراگندہ کر دیے لیکن "باپو" ایک فیصلہ کر آئے تھے، ہمیں ماننا پڑا۔

"گاندھی ارون پیکٹ" کے بعد بھی کئی مرتبہ ایسے واقعات پیش آئے، جواہر لال نے ہر مرتبہ اسی لچک کا اظہار کیا۔

(۵)

اس "ذہنی بوجھ" کے اسباب و عوامل کا تجزیہ سطورِ بالا میں کیا جا چکا ہے۔

(۶)

جواہر لال کی جرأت بیباک ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس معاملہ میں شاید ہندوستان کا کوئی لیڈر ان کا حریف نہیں بن سکتا۔

اس موقعہ پر اپنا بھی ایک مشاہدہ بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے!

میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ایک طالب علم تھا۔ اس زمانہ میں سائمن کمیشن کی آمد آمد کی خبر لکھنؤ میں مشتہر ہوئی، تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں اور اسکولوں کے طلبہ نے طے کیا کہ چار باغ کے اسٹیشن پر "سائمن گو بیک" کے نعروں سے خیر مقدمی مظاہرہ کیا جائے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے بورڈنگ ہاؤس اور ندوہ کے بورڈنگ ہاؤس میں چند قدم کا فاصلہ ہے طے یہ ہوا کہ صبح جو جلوس جائے وہ ندوۃ اور لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبہ کا مشترکہ جلوس ہو، چار باغ اسٹیشن کے سامنے طویل و عریض میدان شہر کے طلبہ اور باشندوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس مظاہرہ کی قیادت کرنے جواہر لال خاص طور پر الہ آباد سے لکھنؤ تشریف لائے تھے چنانچہ مظاہرین کے آگے آگے وہ موجود تھے۔

لکھنؤ کے سٹی مجسٹریٹ علین الدین تھے (ڈبلیو زیڈ احمد کی اہلیہ اور مشہور ممثلہ نینا کے والد) یہ بڑے سخت مزاج آدمی تھے۔ مظاہرے کو روکنے اور مظاہرین کو درہم برہم کرنے کا کام حکومت نے انہیں کو سونپا۔ یہ ایک اسپ سبک سیر پر سوار

موقع واردات پر موجود تھے ۔ گھوڑے پر سوار پولیس بھی ڈنڈے اور پستول سے مسلح کافی تعداد میں موجود تھی، اس موقع پر چوہدری خلیق الزماں، پنڈت گوبند بلبھ پنت، موہن لال سکسینہ وغیرہ مقامی کانگریسی لیڈر بھی موجود تھے۔

علین الدین صاحب نے مجمع کو حکم دیا کہ برخاست ہو جائے، جواہر لال نے کہا، ہم سائمن صاحب کا خیر مقدم کیے بغیر واپس نہیں جا سکتے، علین الدین نے اپنے سواروں کو حکم دیا۔

"بڑھو!"

یہ سوار اپنے بڑے بڑے ڈنڈے لے کر مجمع پر پل پڑے، بھلا گھوڑوں کی ٹاپوں اور سپاہیوں کے ڈنڈوں کا مقابلہ کون کرتا؟ بھگدڑ مچ گئی، لیکن میں اس واقعہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جواہر لال کے پائے ثبات میں جنبش تک نہیں پیدا ہوئی وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ کھڑے رہے۔ ایک موقع تو ایسا آیا کہ اگر بہت سے طلبہ انہیں گھیرے میں نہ لے لیتے تو شاید وہ گھوڑے کے پاؤں تلے روندے جاتے لیکن ان کا استقلال قائم رہا۔

اس اثنا میں سائمن صاحب کا قافلہ اُترا، اور مجمع نے علین الدین صاحب کی موجودگی میں مسلسل نعرے لگانے شروع کیے۔

"سائمن گو بیک"

تھوڑی دیر کے بعد مجمع منتشر ہو گیا۔

شام کو امین آباد پارک میں زبردست احتجاجی جلسہ ہوا، جس میں جواہر لال نے پرجوش تقریر کی، ڈائس پر پنڈت پنت بھی بیٹھے تھے، کسی سپاہی کا ڈنڈا ان کے ماتھے پر پڑا تھا، جس سے ماتھا کھل گیا تھا، پٹی باندھے تھے، خون اب تک رس رہا تھا۔

(۷)

المورڑہ جیل میں بھی جواہر لال کا شغل بے کاری یہی تھا۔

(۸)

مولانا کے اس "کارنامہ" کی حقیقت یہ ہے کہ پنجاب میں تقریباً مسلم نشستوں

پر اگرچہ لیگ نے قبضہ کر لیا تھا اور از روئے اخلاق و آئین اسے تشکیل وزارت کا حق تھا لیکن مولانا نے سر خضر حیات خاں اور ان کے تین چار ساتھیوں قزلباش اور برق وغیرہ کو مسلمانان پنجاب کا نمائندہ تسلیم کر لیا۔ کانگرس کو، سکھوں کو اور دوسرے غیر مسلم عناصر کو خضر حیات کا پشت پناہ بنا دیا، مسلمانوں کی اکثریت چونکہ عددی تھی، لہٰذا چند غداروں کو اپنے ساتھ ملا لینے کے بعد مولانا نے درحقیقت کانگرسی بظاہر یونینسٹ حکومت قائم کرا دی۔ مولانا ہندوؤں کے شور مبارکباد سے اتنے مسحور ہوئے کہ انہوں نے یہ نہ سوچا، اس طرح وہ پاکستان کی بنیاد مستحکم کر رہے ہیں، مسلمانوں نے سوچا اور بجا طور پر سوچا کہ جب اس طرح ہماری اکثریت چالبازیوں کے باعث اب اقلیت بنائی جا سکتی ہے تو سارے ہندوستان کی عنان اقتدار ہاتھ میں لے لینے کے بعد مسلم اکثریت کے صوبے بالکل کانگرس کے رحم و کرم پر ہوں گے وہاں وہی حکومت بن سکے گی جو کانگرس کی منظور نظر ہو۔

(۹)

نہرو خاندان کے لوگ مولانا سے چاہے جتنے خفا ہوں لیکن یہ ماننا پڑے گا انہوں نے جو بات نہرو کو سمجھائی وہ تھی اصولی اور سچی!

واقعی مسلم لیگ عوامی جماعت تھی، اس سے اشتراک و تعاون کانگرس کے شایان شان تھا لیکن یونینسٹ جماعت جس نے ہمیشہ کانگرس کے سر پر ڈنڈے برسائے جس نے کانگرس کی ہر تحریک کو پوری بہیمیت سے کچلا، جس نے کانگرسی لیڈروں کو ہتھکڑیاں پہنا کر جیل بھیجا، جس نے انگریزوں کی حمایت اور جاں نثاری میں اپنے ملک، قوم اور وطن سے غداری کی، جو صرف جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں پر مشتمل تھی، جس میں سردار خاں بہادر اور رائے بہادر بھرے ہوتے تھے، جس کے ارکان میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہیں تھا جس نے کبھی بھولے سے بھی کسی عوامی تحریک میں حصہ لیا ہو، جس نے ہمیشہ انگریزوں کی وفاداری پر قوم اور ملت کی وفاداری کو ترجیح دی، محض مسلم لیگ کو زک دینے کے لیے ایسی جماعت سے ساز باز کرنا اور سازش سے کام لے کر اس کی وزارت بنوا دینا یقیناً مولانا کا ایسا کارنامہ تھا جس پر ہندوؤں کی مسرت بجا تھی، جس پر مولانا بھی فخر کرنے میں ممکن

ہے حق بجانب ہوں لیکن ملتِ اسلامیہ کا جہاں تک تعلق ہے اس نے نفرت اور حقارت کے ساتھ اس کارنامہ کو دیکھا تھا، یہ کارنامہ اس کی نظر میں بالکل ایسا ہی تھا جیسے جعفر و صادق کا۔

چنانچہ خود کانگرس کے معاملہ فہم طبقہ نے بھی اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور جواہر لال نے بالکل بجا طور پر کہا کہ مولانا نے

"یونینسٹ پارٹی کے ساتھ کانگرس کو شریکِ وزارت کر کے اصُول قربان کر دیا تھا۔"

(۱۰)

یہ مولانا کی غلط فہمی تھی!

اقلیت کا کوئی فرد بھی اپنی قوم اور ملت سے زیادہ سے زیادہ غداری کرنے کے بعد بھی "ایسی پوزیشن" نہیں حاصل کر سکتا کہ اکثریت اسے اپنا قائد مطلق تسلیم کر لے۔ اور یہ بات کچھ فطری سی ہے، ہندوستان ہی میں نہیں دُنیا کے ہر ملک میں یہی ہوتا ہے۔ رُوس میں، انگلستان میں، جرمنی میں، امریکہ میں کوئی یہودی خواہ کتنا ہی قابل ہو، اس کے خدمات کتنے ہی وقیع ہوں، اس کے کارنامے کیسے ہی لازوال ہوں چرچل، آئزن ہاور، ڈیگال اور ایڈ فائر کا مقام نہیں حاصل کر سکتا۔

(۱۱)

حیرت ہے مولانا جن کی زندگی کا پہلا دَور علمائِ سُوء کے خلاف دشنام و پیکار میں گزرا تھا اور جو زندگی کے آخری دور میں ان لوگوں کے خلاف صف آرا ہے جو جماعتی تنظیم میں شگاف ڈالنے کے عادی تھے، خود ایسا کارنامہ انجام دے کر جو ان دونوں کا جامع تھا اتنے خوش اور نازاں ہیں!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے

(۱۲)

جواہر لال کا یہ خیال بے بنیاد نہیں تھا، بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ایسا ہوا بھی۔

(۱۳)

یہ جواہر لال کی وہی کمزوری ہے جسے "لچک" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان پر القا اور الہام نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے صحیح موقف اختیار کر کے غلطی کی۔ یہ احساس انہیں مولانا کے پاس لایا تھا کہ لے دے کے ایک مولانا ہی تو ہیں جنہیں کانگرس "شو بوائے" کے طور پر استعمال کر رہی ہے، یہ بھی دل برداشتہ ہو کر اگر دامن جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں تو کانگرس واقعی بالکل ہندو جماعت بن جاتی ہے گی، کانگرس کے ہندو جماعت بن جانے کے مقابلہ میں یہ بے اصولی جواہر لال نے گوارا کر لی۔

(۱۴)

تاریخ کا یہ بھی کتنا عجیب اور حیرت انگیز واقعہ ہے۔

شیخ عبداللہ جب ایک قومی کارکن کی حیثیت سے "کشمیر خالی کر دو" کا نعرہ بلند کرتے اور کشمیریوں کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں، مہاراجہ خفا ہو کر انہیں گرفتار کر لیتے ہیں تو جواہر لال ملک کے وسیع تر مفاد کو پس پشت ڈال کر صدر کانگرس اور حکومت برطانیہ کے مذاکرات میں جمود پیدا کر کے اور اس طرح آزادیٔ ہند کے امکان میں مزید تاخیر پیدا کر کے کشمیر پہنچتے ہیں، قانون شکنی کرتے ہیں اور گرفتار ہو جاتے ہیں۔

لیکن یہی شیخ عبداللہ جب ایک مرتبہ پھر چند سال کے بعد وزیر اعظم کشمیر کی حیثیت سے کشمیر کے حق خود ارادیت کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو بہ پر دستور اور آئین سے منہ موڑ کر انہیں وزارت سے ڈسمس کر دیا جاتا ہے وہ گرفتار کر لیے جاتے ہیں، بغیر مقدمہ چلائے انہیں جیل میں ٹھونس دیا جاتا ہے اور سالہا سال تک ان کی خبر نہیں لی جاتی انہیں غدار قرار دیا جاتا ہے، بیچاری مردولا سارا بائی عبداللہ کی حمایت کرتی ہے تو وہ بھی گرفتار کر لی جاتی ہے اور یہ سب کچھ مہاراجہ ہری سنگھ نہیں کرتے جواہر لال نہرو کرتے ہیں۔

میرے تغیرِ رنگ پہ مت جا
انقلابات ہیں زمانے کے!

وہی بات مہاراجہ ہری سنگھ کریں تو غلط اور وزیر ہند جواہر لال کریں تو درست۔

تم بھی وہی کہو تو کہے اک جہاں سچا
میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں غلط

(۱۵)

سرحد کے اس دورہ سے بہرحال ایک فائدہ تو ہوا، ڈاکٹر خاں صاحب اور خاں عبدالغفار خاں کا بھرم کھل گیا، کیونکہ ان کے "طرہ پرپیچ وخم" کا "پیچ وخم"، سرحد کے عوام نے دن دہاڑے اور پنڈت نہرو کے سامنے نکال دیا تھا۔

(۱۶)

بھلا دیتی ہیں سب رنج والم حیرانیاں میری
تیری تمکین بے حد کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہے

(۱۷)

مولانا کا اور حسرت موہانی کا سیاسی اور ادبی مسلک بالکل جدا گانہ تھا اور ہمیشہ جدا رہا۔ لیکن جواہر لال کی بارگاہ میں کرشنا مینن کو باریاب اور کامیاب دیکھ کر ضرور انہیں حسرت کا یہ شعر کسی نہ کسی وقت یاد آتا ہوگا۔

گرد فاداری اغیار کا غوغا ہے یہی !
جان سے ہم بھی گزر جائیں گے سوچا ہے یہی !

(۱۸)

یہ بات اگر جواہر لال نے شروع ہی میں محسوس کر لی ہوتی تو مولانا کو اتنا صدمہ بھی نہ ہوتا اور حالات بھی اس قدر زیادہ نازک صورت نہ اختیار کرتے،

ہرچہ دانا کند، کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار !

(۱۹)

یہ تو صحیح ہے کہ تاریخ کبھی بھی کانگرس کو معاف نہیں کرے گی، لیکن اس بات پر نہیں کہ اس نے تقسیم کیوں قبول کی؟ اس بات پر کہ اس نے ذہنی تحفظ کے ساتھ تقسیم کیوں قبول کی؟

دونوں میں بڑا فرق ہے اور اس فرق کی نشان دہی خود مولانا بھی کئی مقامات پر اپنی کتاب میں فرما چکے ہیں،

(۲۰)

لیکن اس احساس کے باوجود عملی طور پر جواہر لال کچھ نہ کر سکے،

خود مولانا نے اپنی اس خود نوشت میں تحریر فرمایا ہے کہ جواہر لال نے گاندھی جی کے سامنے اعتراف کیا کہ مسلمان کتے بلی کی طرح قتل کیے جاتے ہیں اور وہ کچھ نہیں کر سکتے، سردار پٹیل نے انہیں ڈانٹ دیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے زیادہ کے مسلمان مستحق ہیں۔

جواہر لال کی یہ ادا ہے ۔ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست ۔ وہ اپنی قوم اور اپنی حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف خوب زور شور سے احتجاج کرتے ہیں لیکن نہ اپنی حکومت کو راہ راست پر لا سکتے ہیں نہ قوم کی اصلاح کر سکتے ہیں ۔

اُردو کا حامی جواہر لال سے زیادہ ہندوستان میں کوئی نہیں ہے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق اگر ہندوستان میں ہوتے تو شاید اس مسئلہ پر دونوں میں رقابت ہو جاتی ۔ لیکن اُردو سے اس والہانہ شیفتگی کے باوجود وہ اسے اس کا حق نہ دلا سکے ولی تک میں نہیں مسلمانوں کو وہ آئین و قانون کی میزان میں وہی درجہ دیتے تھے جو ہندوؤں کو حاصل تھا لیکن مسلمان ان کی نظر کے سامنے ان کی راج دھانی میں کتے بلی کی طرح کٹتے رہے ، لیکن نہ وہ سردار پٹیل سے وزارت داخلہ چھین سکے ، نہ خود مستعفی ہو سکے ، نہ حکومت کی مشینری میں ردّ و بدل کر سکے ، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ہمدردیاں مسلمانوں کے کام نہ آ سکیں ، وہ سیہ بختی کے بدستور شکار رہے ۔

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

(۲۱)

اب بھی جب چند روز پہلے بہار میں فساد ہوا اور سیتا مڑھی ہی میں مسلمان تہ تیغ بے دریغ ہوتے تو وہ مقتول مسلمانوں کے لیے دعائے مغفرت اور ان کے پسماندگان کے لیے التجائے صبر و جمیل اور بہار کے ہندوؤں کو مسلمانوں سے حسن سلوک کی نصیحت کر کے چلے آتے کسی ہندو قاتل کو سزا ملی ہو یا کوئی ہندو لیڈر اکھڑ گیا ہو، اس غلطی کا صدور یا تحریر سطور تک تو نہیں ہوا۔

---

(۱۲)

چیانگ کائی شیک

ہندوستان سے چیانگ کی ہمدردی آغازِ جنگ کے ساتھ ہی جنرلسمو چیانگ کائی شیک نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ حکومتِ برطانیہ کو ہندوستان سے معاملات روبراہ کر لینے چاہئیں۔ پھر جب پرل ہاربر پر جاپان نے حملہ کیا تو چیانگ کائی شیک کے اس اصرار نے اور زیادہ شدت اختیار کر لی۔ میدانِ جنگ میں جاپان کے کودنے کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ چیانگ کائی شیک اور چینی حکومت کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا اور چین بھی امریکہ، برطانیہ، روس اور فرانس کی طرح بڑی طاقتوں میں شمار ہونے لگا۔

جواہر لال اور چیانگ کائی شیک جنگ شروع ہونے سے کچھ ہی مدت پہلے جواہر لال نے جنوبی چین کا دورہ کیا تھا چیانگ کائی شیک ان کے میزبان تھے۔ اس طرح ان دونوں میں بڑے گہرے اور قریبی تعلقات و مراسم پیدا ہو گئے۔

ہندوستان کے مطالبۂ آزادی سے چیانگ کی ہمدردی جواہر لال کے دورۂ چین کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ چیانگ کائی شیک نے ایک مشن ہندوستان بھیجا اور مجھے بحیثیت صدرِ کانگرس ایک خط لکھا جس میں ہندوستان کے جذبۂ آزادی کے ساتھ پوری پوری ہمدردی کا اظہار

کیا تھا۔

چیانگ کائی شیک ہندوستان میں اب چیانگ کائی شیک نے فیصلہ کیا کہ انہیں خود بھی ہندوستان کا دورہ کرنا چاہیے، اور وائسرائے نیز کانگرسی رہنماؤں سے مل کر مفاہمت باہمی کی کوئی صورت پیدا کرنی چاہیے۔

(ص ۴۲)

چیانگ کائی شیک کا مشورہ ۹، فروری ۱۹۴۲ء کو جنرل اور میڈم چیانگ کائی شیک دہلی پہنچے۔ دو دن بعد میں نے اور جواہر لال نے ان سے ملاقات کی، انہوں نے کہا۔

"محکوم قومیں دو میں سے ایک ہی طریقے پر عمل کر کے آزادی حاصل کر سکتی ہیں، یا تو تلوار سونت لی جائے اور غیر ملکی حکمرانوں کو نکال باہر کیا جائے ورنہ پھر پُرامن ذرائع سے آزادی حاصل کی جائے۔ اس صورت میں آزادی کی طرف جو قدم بڑھے گا وہ تدریجی ہوگا۔"

اس کے بعد جنرلیسمو نے پوچھا۔

"ہندوستان کی صحیح جگہ کہاں ہے؟ نازی جرمنی کے ساتھ یا جمہوریتوں کے ساتھ؟"

پھر انہوں نے کہا،

"اگر برطانوی گورنمنٹ خود مختار حکومت، درجہ نوآبادیات کے برابر عطا کرتی ہے تو اسے ضرور قبول کر لینا چاہیے!"

جواہر لال نے مجھ سے اُردو میں کہا،

"کانگرس کے صدر آپ ہیں، آپ ہی جواب دیجیے"

میں نے کہا "اگر دوران جنگ میں برطانوی حکومت ہمیں درجہ نوآبادیات کی پیشکش کرے گی اور اس پر رضامند ہو جائے گی کہ نمائندگان ہند، آزادی اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوں تو کانگرس ہرگز اس طرح کی پیش کش مسترد نہیں کرے گی!"

(ص ۴۳، ۴۴)

تاج محل دیکھنے کی آرزو

جنرلسمو نے تاج محل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، حکومت نے اپنے پسندیدہ آدمیوں کے ساتھ ان کے دورہ کا پروگرام بنا دیا لیکن میڈم چیانگ کائی شیک نے اصرار کیا کہ جواہر لال ضرور ہمارے ساتھ آگرہ جائیں گے۔ اس طرح وہ چیانگ پارٹی کے ایک ممبر بن گئے، حکومت کو یہ بات بہت گراں گزری۔
(ص ۴۴، ۴۵)

گاندھی جی سے چیانگ کی ملاقات

دہلی سے جنرل لسمو کلکتہ گئے، گاندھی برلا پارک میں مقیم تھے۔ جنرلسمو اور میڈم چیانگ کائی شیک ان سے ملنے وہیں آتے، یہ ملاقات تقریباً دو گھنٹہ تک جاری رہی۔ میڈم چیانگ کائی شیک ترجمان کے فرائض انجام دے رہی تھیں (کیونکہ جنرل سمو چینی کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں جانتے تھے اور میڈم آسانی سے انگریزی بول لیتی تھیں) گاندھی جی نے انہیں بتایا کہ جنوبی افریقہ میں پہلے پہل کس طرح انہوں نے ستیہ گرہ کا آغاز کیا، اور پھر کیونکہ تدریجی طور پر، عدم تشدد، اور عدم تعاون کی تکنیک نے نشو و نما کے مراحل ہندوستان کے سیاسی مسائل حل کرنے کے سلسلہ میں طے کیے؛

گفتگو کا اچھا اثر نہ پڑا

اس ملاقات کے وقت میں کلکتہ میں موجود نہیں تھا۔ بعد میں جواہر لال نے اس ملاقات کے حالات مجھے بتائے، یہ وہ زمانہ تھا کہ جواہر لال، تمام معاملات میں، گاندھی جی کے ہمنوا نہیں تھے، انہوں نے کہا، گاندھی جی نے جس انداز میں جنرلسمو سے بات چیت کی، اس کا کچھ اچھا اثر ان پر نہ پڑا۔

میرے لیے اس بارے میں محاکمہ کرنا آسان نہیں ہو سکتا ہے کہ جنرلسمو گاندھی جی کے موقف کے موثرات صحیح طور پر سمجھ نہ سکے ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ گاندھی جی کے دلائل کو انہوں نے وزنی نہ محسوس کیا ہو، لیکن مجھے بڑی حیرت ہو گی۔ اگر واقعتہً وہ گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر نہ ہوتے ہوں جس کی سحر طرازی سے غیر ملکی ہمیشہ متاثر ہوتے رہے ہیں۔
(ص ۴۴، ۴۵)

مولانا نے جنرل چیانگ کائی شیک کے بارے میں جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں ان سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ غلام ہندوستان کی آزادی سے آزاد چین کے سربراہ مملکت چیانگ کائی شیک کو غیر معمولی ہمدردی تھی۔

۲۔ جواہر لال سے چیانگ کائی شیک کو بہت زیادہ تعلق خاطر تھا۔

۳۔ جواہر لال جب چین گئے تو آزاد چین کے سربراہ مملکت نے غلام ہندوستان سے آئے، جواہر لال سے ملے اور حکومت ہند کی ناراضی، برہمی اور خفگی کی پروا کیے بغیر کانگریسی رہنماؤں سے براہ راست رابطہ قائم کیا۔

۴۔ جب تاج محل کی زیارت کے لیے آگرہ جانے لگے تو میڈم چیانگ کائی شیک نے اصرار کر کے جواہر لال کو اپنی پارٹی میں شریک کیا۔

یہ سب باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ چیانگ کائی شیک کو ہندوستان کی آزادی اور جواہر لال کی ذات سے کس درجہ تعلق خاطر رہا۔

لیکن جواہر لال نے آزاد ہندوستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے ان احسانات کا جواب کس طرح دیا؟

داخلی شورش کے بعد جب ماؤزے تنگ کی کمیونسٹ پارٹی چین پر قابض ہو گئی اور چیانگ کائی شیک فارموسا میں چینی حکومت کے سربراہ بن کر پہنچے تو جواہر لال کی آنکھیں بدل گئیں، انھوں نے چیانگ کائی شیک سے اتنی ہمدردی بھی نہیں کی جتنی وہ تبت کے دلائی لامہ سے کر رہے ہیں۔

جواہر لال کا یہ شیوہ کچھ نیا نہیں ہے، یہ ان کی دیرینہ عادت ہے۔

مصر کے نحاس پاشا سے بھی غلامی کے زمانے میں ان کے بہت گہرے تعلقات تھے، ممکن نہ تھا کہ لندن جاتے اور آتے وقت وہ نحاس پاشا کے مہمان خصوصی نہ بنیں۔

لیکن جب جمال عبدالناصر نے مصر پر قبضہ کر لیا اور تطہیر کی مہم شروع کی تو مصر کے سیاسی لیڈروں میں سب سے پہلے نحاس پاشا ہی شکار بنائے گئے۔ اس واقعہ کے بعد جواہر لال مصر گئے، جمال عبدالناصر کے مہمان بنے، ان سے دوستی کے پلنگ بڑھائے لیکن بھولے سے نحاس پاشا کی خیریت نہ دریافت کی وہ کچھ اور نہیں کر سکتے

تھے تو کم از کم چیانگ کائی شیک کی طرح یہ تو کر سکتے تھے کہ جس طرح وہ ہندوستان سے کے بعد حکومت برطانیہ کے معتوب کانگرسی لیڈروں سے ملے اور ذاتی رابطہ بھی قائم رکھا، اسی طرح جواہر لال شوق سے جمال عبدالناصر کے مہمان بنتے، لیکن نحاس بیچارے سے مل تو لیتے، ظاہر ہے نحاس پاشا ان سے ناصر کے خلاف سازش کرنے تو نہ بیٹھ جاتے۔

درد کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

---

(۱۲)

سر خضر حیات خاں

مسلم لیگ کے خلاف کانگرس سے خضر حیات کا تعاون

(جون ۴۵ء شملہ کانفرنس وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے لیے کانگرس بضد ہے کہ وہ مسلمانوں کو نامزد کرنے کا حق بھی رکھتی ہے۔ مسلم لیگ کو اصرار ہے کہ مسلمان ممبروں کی نامزدگی صرف مسلم لیگ ہی کرے گی)

پنجاب کے وزیراعظم کی حیثیت سے خضر حیات خاں بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ اس زمانہ میں متعدد بار وہ مجھ سے آکر ملے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تمام اختلافی مسائل پر ان کا رویہ نہایت معقول تھا۔ وہ ہمارے مددگار ثابت ہوئے انہوں نے پیش آمدہ مسائل میں ہم سے پورا پورا تعاون کیا۔ (۱)

(ص ۱۱۰)

خضر حیات کے نام سے جناح کا اختلاف

ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں کی جو عارضی فہرست خود لارڈ ویول نے تیار کی تھی، اس میں پنجاب کے وزیراعظم خضر حیات خاں کا نام بھی تھا۔ مسٹر جناح نے نہایت سختی کے ساتھ اس تجویز کی مخالفت کی (۲)

کانگرس خضر حیات کے ساتھ تھی

خضر حیات خاں بھاگے بھاگے مجھ سے ملنے آتے، میں نے انہیں یقین دلایا کہ کانگرس

کو ان کی شمولیت پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں ہے، یہی بات میں نے بار بار لارڈ ویول کے بھی گوش گزار کی۔ (۳) (ص ۱۱۴)

میری حکمتِ عملی نے خضر حیات کو وزیر اعلیٰ بنا دیا

(۱۹۴۶ء کے عام انتخابات کے بعد وزارت سازی کے سلسلہ میں مولانا آزاد لاہور پہنچتے ہیں)

پنجاب کی صورتِ حالات خاص طور پر نہایت نازک تھی۔ یہ مسلم اکثریت کا صوبہ تھا لیکن کسی پارٹی کو بھی واضح اکثریت انتخابات میں حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مسلم ممبرانِ اسمبلی، یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ میں منقسم تھے۔ میں نے دونوں جماعتوں سے گفتگو کی، مسٹر جناح کی ہدایت کے مطابق لیگ پارٹی نے میری دعوت قبول نہیں کی بہر حال میں نے گفت و شنید کا سلسلہ ایسے انداز میں جاری رکھا کہ یونینسٹ پارٹی کے لیے کانگرس کی تائید کے ساتھ تشکیل وزارت کا مرحلہ آسان ہو گیا۔ گورنر ذاتی طور پر مسلم لیگ کی طرف مائل تھا لیکن میری اس حکمتِ عملی کے باعث اب اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہ گیا کہ یونینسٹ پارٹی کے لیڈر خضر حیات خاں کو تشکیلِ وزارت کی دعوت دے۔ (۴)

میں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا

یہ پہلا موقع تھا کہ پنجاب میں کانگرس شریک حکومت بنی، یہ ایسی بات تھی جو اب تک ناممکن سمجھی جاتی رہی۔ سارے ملک کے سیاسی حلقوں نے اعتراف کیا کہ میں نے غیر معمولی صلاحیت اور تدبر کا ثبوت دیتے ہوئے پنجاب میں وزارت سازی کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ملک کے مختلف اطراف و جوانب سے مبارکباد کے تاروں کی مجھ پر بھرمار ہو گئی۔ نیشنل ہیرالڈ نے جو یوپی کانگرس کا ترجمان ہے۔ مجھے مبارکباد دی کہ میں نے ایسا طرزِ کار اختیار کیا جس سے پنجاب کا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ حل ہو گیا۔ اس اخبار نے تو میرے بارے میں یہاں تک لکھ دیا کہ پنجاب کے حالات کو اس طرح مٹھی میں لے لینا میری صلاحیت اور تدبر کی ایسی شاندار مثال ہے جس کی نظیر اب تک کسی کانگرسی لیڈر کے ہاں نظر نہیں آتی۔ (۵) (ص ۱۲۸)

خضر حیات کانگرس کے زیر اثر آ گئے

خضر حیات خاں کانگرس کی پشت پناہی کے باعث اب پنجاب کے وزیر اعظم تھے اور قدرتی طور پر کانگرس کے زیر اثر بھی۔ (۶) (ص ۱۲۹)

خضر حیات کے بارے میں مولانا نے جن "تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ بڑے سبق آموز ہیں جو واقعات اس باب میں بیان ہوئے ہیں وہ افسوسناک بھی ہیں اور شرمناک بھی، مولانا کو اپنے جس کارنامہ پر فخر ہے جس کی داد نیشنل ہیرالڈ اور دوسرے کانگرسی اخبارات نے دی، اس طرح کا فخر نظام حیدر آباد کو بھی تھا۔ جب اس نے انگریزوں کا ساتھ دے کر ٹیپو سلطان کی حکومت ختم کرائی تھی۔ حکیم احسن اللہ خاں کو اور میر رجب علی اور الٰہی بخش کو بھی تھا، جنہوں نے بہادر شاہ کی حکومت ختم کرائی، علی نقی کو بھی تھا، جس نے واجد علی شاہ کا تختہ ڈلوایا۔ حیرت ہے قائد اعظم اور مسلم لیگ کے خلاف مولانا آزاد اتنے آگے جا پہنچے کہ وہ یہ سب کچھ کرنے پر تیار ہو گئے؟ انہوں نے ذرا نہ سوچا کہ ملتِ اسلامیہ تو ممکن ہے انہیں معاف کر دے، لیکن تاریخ جس سے ہمیشہ سہمے رہتے تھے کبھی نہیں معاف کرے گی۔

اب میں الگ الگ مولانا کے اشارات کی روشنی میں حالات کا جائزہ لوں گا۔

(۱)

خضر حیات خاں جب مولانا سے بار بار آ کر ملے اور مسلم لیگ کے خلاف مورچہ بنانے میں مددگار بھی ثابت ہوئے تو مولانا نے ایک لمحہ کے لیے کبھی نہ اپنے ماضی پر نظر ڈالی نہ خضر حیات کی تاریخ گزشتہ کے ورق اُلٹے، انہوں نے ذرا دیر کے لیے بھی نہ سوچا کہ۔ کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل؟

(۲)

قائد اعظم نے خضر حیات کے نام سے اختلاف اس لیے کیا کہ وہ جانتے تھے، خضر حیات اپنی وزارت قائم رکھنے کے لیے مسلمانوں کے ملی مقاصد کا سودا کر لینے سے دریغ نہیں کریں گے۔ پھر یہ کہ ایگزیکٹو کونسل میں ان مسلمانوں کو جگہ ملنی چاہیے تھی جو اپنی قوم کے سچے نمائندے ہوں، خضر حیات خاں اپنی ذات کے سوا کس کے

نمائندے تھے؟

(۳)

خضر حیات کو مسلم لیگ کے خلاف کانگرس کا سہارا درکار تھا، کانگرس مسلم لیگ کو نیچا دکھانے کے لیے خضر حیات جیسے سلطنت انگلشیہ کے یار وفادار سے ناجائز تعلق پیدا کر سکتی تھی، لیکن قائدِ اعظم، اصول اور حق وصداقت کے سوا کسی چیز کو سامنے نہیں رکھتے تھے، وہ بھلا کب گوارا کر سکتے تھے کہ وہ شخص مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے ایگزیکٹو کونسل میں شریک کیا جاتے جو مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہے اور مفادِ ملی کے خلاف دشمنوں سے سازباز کرتا رہا ہے؟

۴۔ مولانا اگر کانگرس میں شریک تھے تو اس کا انہیں حق تھا، مسلم لیگ سے اگر خفا تھے، قائدِ اعظم سے اگر بیزار تھے، پاکستان کے ذکر سے اگر چڑتے تھے، مسلمانوں کی قومی انفرادیت ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، دو قومی نظریہ سے اختلاف تھا یہ سب باتیں سمجھ میں آسکتی ہیں۔ لیکن کیا دُنیا کے کسی آئین اخلاق اور دستورِ سیاست کی رُو سے مولانا کو غلط بیانی کا حق بھی تھا؟ دو اور دو کو چار کہنے کے بجائے تین ثابت کرنے کے بھی وہ مجاز تھے؟ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید بھی کہہ سکتے تھے؟

کس اطمینان سے مولانا نے فرمایا ہے۔

"پنجاب مسلم اکثریت کا صوبہ تھا لیکن کسی پارٹی کو بھی واضح اکثریت انتخابات میں حاصل نہیں ہوئی مسلم ممبرانِ اسمبلی، یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ میں منقسم تھے!"

گویا مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں مسلمان ممبر تقریباً برابر بٹے ہوئے تھے، لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟

میں اسی کتاب میں کسی جگہ تفصیل سے انتخابات کے اعداد وشمار پیش کر چکا ہوں اب اعادہ کی ضرورت نہیں لیکن بہرحال کیا حقیقت ہے؟ گھی کے چراغ جلے کہ مسلم اکثریت کا ایک بڑا صوبہ بغیر فوج کشی اور بغیر رائے عامہ کی تائید کے ہمارا باجگذار ہو گیا، ہندو اخبارات نے جو خراجِ تحسین مولانا کو پیش کیا بلاشبہ وہ اس کے سزاوار تھے۔ جو کام گاندھی جی کی روحانیت، گلینسی کے تشدد خضر حیات کی غداری برطانوی حکومت کی ریشہ دوانی سے نہیں ہو سکا، وہ یک چشم زدن مولانا کی "حکمتِ عملی" سے انجام پا گیا۔

خار کو گل اور گل کو خار جو چاہے کرے
تو نے جو چاہا کیا اے یار جو چاہے کرے

۶۔ ٹیپ کا بند یہی ہے مولانا کے یہ الفاظ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں:
"خضر حیات خاں کانگرس کی پشت پناہی کے باعث اب پنجاب کے وزیر اعظم تھے اور ذاتی طور پر کانگرس کے زیر اثر بھی!"

اس اجمال پر ہزار تفصیلیں قربان!
کیا بات ہے تیری گفتگو کی!

---

(۱۴)

ڈاکٹر خاں صاحب

ڈاکٹر خاں صاحب کی کوتاہیاں (۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں سرحد کانگرس نے اپنے جوڑ توڑ سے صوبہ میں اپنی وزارت بنالی، عوام کا ایک بڑا طبقہ کانگریس اور کانگرس وزارت کے خلاف ہے)

ڈاکٹر صاحب کا دوبارہ وزیر اعلیٰ بننا اور زیادہ مخالفوں کی تقویت کا موجب بنا۔ ڈاکٹر خاں صاحب کو یہ موقع حاصل تھا کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے سارے صوبے کو جیت لیتے لیکن ان سے پے در پے ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں جنہوں نے مخالفوں کی طاقت میں مزید اضافہ کر دیا۔ (۱)

خاں برادران کی کنجوسی یہ غلطیاں زیادہ تر ذاتی اور سماجی قسم کی تھیں۔ سرحد کا پٹھان اپنی میزبانی کے لیے مشہور ہے، وہ اپنی روٹی کا آخری ٹکڑا بھی خوشی خوشی مہمان کے لیے رکھ دیتا ہے، اس کا دستر خوان ہر ایک کے لیے کھلا رہتا ہے۔ اس جذبۂ میزبانی کی توقع وہ دوسروں سے بھی رکھتا ہے، خاص طور پر ان لوگوں سے جو سماج میں کسی بڑے منصب پر فائز ہوں۔ بخل اور کنجوسی سے زیادہ کوئی چیز بھی اس میں انحراف اور برگشتگی کا جذبہ پیدا کرنے والی نہیں بدقسمتی سے خاں بھائی اپنے متبعین کی نگاہ میں اسی چیز سے محروم تھے۔ (۲)

دولت مند لیکن بخیل

خان بھائی دولت مند آدمی ہیں لیکن خوئے میزبانی سے تہی دامن! ڈاکٹر خاں صاحب کے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد بھی اُن کے دسترخوان پر شاید ہی کوئی مدعو ہو کر آیا ہو۔ چائے یا کھانے کے وقت اگر کچھ لوگ آ جاتے تو ان سے یہ کبھی نہ کہا جاتا کہ ما حضر تناول فرمائیے۔ (۳)

خاں کے بخل نے بہتوں کو دشمن بنا دیا

بخل اس پبلک فنڈ پر بھی اثر انداز تھا، جس پر انہیں تصرف حاصل تھا۔ الیکشن کے زمانے میں کانگرس نے ایک رقمِ خطیر ان کی صوابدید پر چھوڑ دی لیکن خان بھائیوں نے اس فنڈ کا روپیہ کم سے کم خرچ کیا، کئی کانگرسی امیدوار اس لیے ناکام ہوتے کہ معقول اور بروقت امداد نہ مل سکی، بعد میں جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اس مد کا روپیہ بے کار پڑا ہے تو یہ لوگ ان کے بدترین دشمن بن گئے۔ (۴)

ایک دلچسپ اور سبق آموز واقعہ

ایک موقع پر پشاور سے کچھ لوگ الیکشن فنڈ کے سلسلہ میں میرے پاس کلکتہ آئے چونکہ یہ چائے کا وقت تھا، میں نے چائے اور بسکٹ پیش کیے، وفد کے کئی لوگوں نے بسکٹوں پر حیرت کی نظر ڈالی۔ ایک آدمی نے بسکٹ اُٹھایا اور مجھ سے اس کا نام پوچھا، معلوم ہوتا تھا یہ بسکٹ اسے پسند آیا، پھر اُن لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ایسے ہی بسکٹ انہوں نے ڈاکٹر خاں صاحب کے گھر میں دیکھے ہیں لیکن انہوں نے ہم لوگوں کو نہ کبھی بسکٹ کھلائے نہ چائے پلائی۔

سیاہ جھنڈیوں سے جواہر لال کا استقبال

۴۶ء میں صحیح پوزیشن یہ تھی کہ ہم دہلی بیٹھے ہوئے خاں بھائیوں کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے وہ حقیقت پر مبنی نہ تھا۔ جواہر لال جب پشاور پہنچے تو یہ انکشاف ایک ناخوشگوار جھٹکے کی طرح انہیں محسوس ہوا، ڈاکٹر خاں صاحب صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے اور وزارت کانگرس کی تھی۔ جب جواہر لال ہوائی اڈے پر اُترے تو انہوں نے دیکھا کہ ہزاروں پٹھان کالی جھنڈیاں لیے جمع ہیں اور مخالفانہ نعرے لگ رہے ہیں۔ ڈاکٹر خاں صاحب اور دوسرے وزراء جو جواہر لال کے استقبال کے لیے آئے تھے خود ہی پولیس کے پہرے میں کھڑے تھے اور بالکل

ہی بے بس ثابت ہو رہے تھے۔ (۵)

ڈاکٹر خاں صاحب کا پول کھل گیا

جواہر لال جیسے ہی طیارے سے اُترے ان کے خلاف مخالفانہ نعرے لگنے لگے، مجمع کے کچھ لوگوں نے کار پر حملہ کرنے کی کوشش بھی کی، ڈاکٹر خاں صاحب اتنے گھبرائے کہ انہوں نے اپنا ریوالور نکال کر شوٹ کرنے کی دھمکی دی، اس کے بعد ہی ان کو جانے کا راستہ مل سکا۔ جواہر لال اور وزراء سرحد کی کاریں پولیس کے گھیرے میں آگے بڑھ رہی تھیں۔

کچھ در پردہ حقائق

دوسرے روز جواہر لال قبائلی علاقے کے دورے پر پشاور سے روانہ ہوئے، ہر جگہ انہوں نے مخالفوں کے بڑے بڑے جتھے کھڑے دیکھے، وزیرستان کے ملک خاص طور پر ان مظاہروں کے ذمّہ دار تھے۔ بعض مقامات پر جواہر لال کی کار پر پتھراؤ بھی کیا گیا، ایک مرتبہ ایک پتھر ان کی پیشانی پر آکر لگا۔ ڈاکٹر خاں صاحب اور ان کے رفقاء بالکل بے بس منظر آ رہے تھے۔ آخر جواہر لال نے معاملہ خود ہی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نہ انہوں نے کمزوری دکھائی نہ خوف کھایا، زبردست ہمت اور حوصلہ کا مظاہرہ کیا۔ اُن کے اس دلیرانہ رویّے سے پٹھان بہت متاثر ہوئے۔ ان کی واپسی کے بعد ان تمام واقعات پر لارڈ ویول نے افسوس کا اظہار کیا اور حکام سرحد کے رویّے کی تحقیقات کرنی چاہی، لیکن جواہر لال نے اس بنا سے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے اتفاق نہ کیا، لارڈ ویول جواہر لال کی اس بات سے بہت متاثر ہوئے انہوں نے ان رویّے کی بڑی تعریف کی۔ (۶)

(ص ۱۴۰، ۱۴۱)

ڈاکٹر خاں کا پختونستان

(تقسیم ہند کی سکیم کانگریس منظور کر چکی ہے۔ جون ۴۷ء)

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کیا تھا کہ صوبے کو حق خود اختیاری دیا جائے گا چنانچہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ صوبہ سرحد کو بھی موقع دیا جائے گا کہ حق خود اختیاری کی اساس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرے۔ چنانچہ انہوں نے تجویز کیا کہ سرحد میں ریفرنڈم

کا انتظام کیا جائے کہ آیا وہ ہندوستان کے ساتھ وابستہ رہنا چاہتا ہے یا پاکستان کے ساتھ؟ ڈاکٹر خان صاحب اب تک سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے، اس مرحلہ پر کانگریس ورکنگ کمیٹی میں وہ بھی موجود تھے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنا پلان انہیں سمجھایا کہ سرحد میں ریفرنڈم کیا جائے گا اور ڈاکٹر خان صاحب سے پوچھا آیا انہیں کوئی اعتراض ہے؟ ڈاکٹر خان صاحب سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ سرحد کی رائے عامہ ان کے ساتھ ہے لہٰذا وہ ریفرنڈم کی تجویز پر کوئی اعتراض نہ کر سکے لیکن انہوں نے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا، انہوں نے کہا کہ اگر ریفرنڈم ہوتا ہے تو پھر سرحد کے پٹھانوں کو یہ حق ملنا چاہیے کہ پختونستان کے نام سے وہ اپنی ایک الگ حکومت قائم کر سکیں۔

خان بھائی سرحد میں بالکل بے اثر تھے

واقعہ یہ تھا کہ خان بھائی سرحد میں اتنے طاقتور نہیں تھے جتنا کانگریس نے سمجھ رکھا تھا، تقسیم ہند کے ایجیٹیشن کے بعد سے اُن کا اثر و رسوخ کم ہوتا جا رہا تھا اور اب کہ پاکستان بالکل سامنے آ رہا تھا اور مسلم اکثریت کے صوبوں سے وعدہ کر لیا گیا تھا کہ وہ اپنی ایک آزاد حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ جذبات کا دھارا اپنے ساتھ سرحد کو بھی بہا لے گیا، ڈاکٹر خان صاحب نے دیکھا کہ قیادت قائم رکھنے کے لیے پختونستان کا مطالبہ ضروری ہے بہت سے پٹھان پنجابی تسلط کے خوف سے اپنی ایک چھوٹی سی حکومت پر قناعت گوارا کر لیں گے۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کوئی نیا مطالبہ سننے کو تیار نہیں تھے، وہ اپنی سکیم کو جلد از جلد بروئے کار لانا چاہتے تھے اور مطالبہ پختونستان کی تفصیل بھی ابھی زیر بحث نہیں آئی تھی۔ (۸)

(ص ۱۹۴)

مولانا نے ڈاکٹر خان کے بارے میں جو انکشافات کیے ہیں وہ بڑے دلچسپ اور عجیب ہیں۔ اگر مسٹر غلام محمد کو ڈاکٹر خان صاحب کی یہ حقیقت معلوم ہوتی تو شاید وہ انہیں پاکستان کا گمشدہ ہیرو بنانے کی کوشش نہ کرتے، مسٹر اسکندر مرزا اگر ان اسرار سربستہ کے امین ہوتے تو شاید وہ بھی ڈاکٹر خان صاحب کو، مغربی

پاکستان کا چیف منسٹر نہ بناتے اور ری پبلکن پارٹی کا قائم بنانے کی جدوجہد نہ کرتے خود ڈاکٹر خاں صاحب آج زندہ ہوتے اور مولانا کے یہ ارشادات پڑھتے تو ضرور کہہ اٹھتے ؎

اب کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا؟

مولانا کے ارشادات کی روشنی میں اب بعض مخصوص حقائق پر میں گفتگو کروں گا

(۱)

یہ بالکل نیا انکشاف ہے ـــــ انکشاف اس اعتبار سے کہ عام طور پر تو مسلمان اس حقیقت سے آشنا تھے لیکن شاید پہلا موقع ہے کہ ایک سابق صدرِ کانگرس نے اس طرح واشگاف الفاظ میں یہ حقیقت تسلیم کی ہے -

(۲)

یہ ایسا انکشاف ہے جس کا علم خاں صاحب کے مخالفوں کو بھی نہیں تھا، اس لیے کہ انہیں ان سے کچھ زیادہ واسطہ نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو مخالفانہ، بھلا کسی مخالف کی وہ میزبانی کیوں کرتے، لیکن اپنے متبعین، حامیوں اور جاں نثاروں کے ساتھ یہ سلوک واقعی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہے -

(۳)

ڈاکٹر خاں صاحب کی میزبانی کے ایک واقعہ کا تذکرہ اس موقع پر ضرور کروں گا انڈیا ایکٹ کے ماتحت جب صوبائی انتخابات منعقد ہوئے تو مسلم لیگ کی طرف سے سرحد کا دورہ کرتے مولانا شوکت علی پشاور پہنچے، سرحد میں کانگریسی وزارت قائم تھی۔ اور ڈاکٹر خاں صاحب صوبہ کے وزیرِ اعلیٰ تھے -

مولانا شوکت علی، ڈاکٹر خاں صاحب اور خان عبدالغفار خاں کے ایک زمانہ میں مرشد رہ چکے تھے اور یہ لوگ اپنے آپ کو مولانا کا "سپاہی" اور "رضا کار" کہنے پر فخر کرتے تھے، بعد میں حالات بدلے، اور یہ دونوں بھائی کانگریس کے گہوارہ میں چلے گئے لیکن بہرحال معاملہ حسرت کی زبان میں وہ تھا -

بھلاتے پر بھی قصۂ ربطِ ماضی
بھلایا نہ جائے گا ہم سے نہ تم سے

مولانا شوکت علی پشاور پہنچے تو ڈاکٹر خاں صاحب نے ایک روز دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ مولانا نے بے تامل یہ دعوت قبول کر لی اور وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ دعوت اچھی خاصی تھی لیکن حاضرین کم سے کم یعنی خود ڈاکٹر خاں صاحب مولانا شوکت علی اور ایک آدھ کوئی اور۔ اس وقت تو یہ خیال ہوا تھا کہ دعوت چونکہ سیاسی ہے، اس لیے اس موقع پر زیادہ مجمع ڈاکٹر خاں صاحب نے مناسب نہ سمجھا، اب معلوم ہوا، اس کا سبب بخل تھا۔

بہرحال دعوت ہوئی اور مولانا شوکت علی اپنی مستانہ اور دلربا اداؤں کے ساتھ مسلم لیگ اور اس کے اغراض و مقاصد کی تبلیغ و تلقین بھی کرتے رہے۔ لیکن ڈاکٹر خاں صاحب نے قائل ہونے کے لیے تو یہ دعوت دی نہیں تھی، وہ مسکراتے رہے ہوں ہاں کرتے رہے۔

کھانے کے بعد مولانا اُٹھے اور اپنے مخصوص دلفریب انداز میں گھڑی دیکھی اور فرمایا۔

"بہت کام ہے بھائی بہت کام ہے۔ اب جاؤں گا، اب جاؤں گا!"

ڈاکٹر خاں صاحب نے اخلاقاً کہہ دیا۔

"گرمی اتنی شدید پڑ رہی ہے، اس وقت کہاں جائیے گا۔"

برجستہ اور بے ساختہ مولانا شوکت علی نے جواب دیا،

"مجھے لُو اور گرمی سے ڈراتے ہو خود جہنم سے نہیں ڈرتے؟"

یہ الفاظ سن کر خاں صاحب پر سناٹا چھا گیا، پھر انہوں نے کچھ نہیں کہا، موٹر تک چپ چاپ آ کر پہنچایا اور رخصت ہو گئے۔

(۴)

واقعی ڈاکٹر خاں صاحب نے اپنی دلعزیزی اپنے ہاتھوں کھوئی ورنہ یہ خزانۂ قارون صرف کر کے کتنی آسانی سے وہ اپنی قیادت برقرار رکھ سکتے تھے۔

(۵)

کتنا دلچسپ منظر ہوگا جب خاں صاحب جواہر لال کے استقبال کے لیے ہوائی اڈہ پر پہنچ کر خود ہی پولیس کی پناہ میں آ گئے۔

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے۔

(۶)

مولانا نے جواہر لال کو شجاعت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ تو صحیح ہے، اس لیے کہ واقعی اس موقع پر انہوں نے کوئی کمزوری نہیں دکھائی تھی لیکن عفو و درگزر کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ غلط ہے کیونکہ اس واقعہ کے بعد ہی خان محبوب علی خاں، پولٹیکل ایجنٹ کے منصب سے معطل کر دیے گئے اور ان کے خلاف باقاعدہ محکمانہ کارروائی ہوئی، پھر پاکستان بننے کے بعد وہ اپنے منصب پر دوبارہ بحال کیے گئے۔

اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس مظاہرہ میں وزیری پیش پیش تھے، اور ان قبائل پر جواہر لال کی حکومت نے (جس میں مسلم لیگ ابھی شریک نہیں ہوئی تھی) فضائی بمباری کی تھی، جس کے خلاف عبدالغفار خاں نے پبلک احتجاج بھی کیا تھا۔

(۷)

ڈاکٹر خاں کی جہاں بے بسی قابلِ رحم ہے کہ وہ ریفرنڈم کی مخالفت نہ کر سکے وہاں یہ ذہانت قابلِ داد ہے کہ انہوں نے فوراً پختونستان کا سوال پیدا کر دیا۔ یہ اب معلوم ہوا کہ پختونستان صرف عبدالغفار خاں کی جائداد نہیں ہے اس میں خاں صاحب بھی برابر کے شریک تھے۔

(۸)

مولانا کے ان ارشادات پر مزید گفتگو کی اس لیے ضرورت نہیں کہ یہ بے نقاب حقائق ہیں۔

ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

بابو راجندر پرشاد

فوج کی تقسیم کا سوال

(ہندوستان تقسیم ہو چکا ہے، پاکستان اور بھارت میں نئی حکومتیں بن چکی ہیں)

فوج کے بارے میں یہ فیصلہ ہوا کہ ایک چوتھائی فوج پاکستان کے حصہ میں اور تین چوتھائی ہندوستان کے حصہ میں آئی۔ پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا فوج کی تقسیم ابھی عمل میں آئے یا ایک متحدہ کمان کے تحت دو تین سال تک کام کرتی رہے؟

مشترک فوج کی تجویز

فوج کے کمانڈروں کا مشورہ تھا کہ کچھ مدت تک جنرل اسٹاف مشترک رہے۔ میں نے اس تجویز کی تائید کی۔ میں یہ بات بھی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی بھی پختہ رائے یہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر فوج متحدہ کمان کے ماتحت رہتی تو آزادی کے بعد خون کی ندیاں نہ بہنے پاتیں۔

راجندر بابو کا اصل رُوپ

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میرے رفقا نے میری رائے سے اتفاق نہیں کیا، بلکہ اختلاف کا اظہار کیا۔ سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متحیر کیا وہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی مخالفت تھی۔ وہ امن کے مبلغ اور عدم تشدد کے علمبردار ہمیشہ سے چلے آ رہے تھے لیکن فوج کی

تقسیم کے مسئلہ میں سب سے زیادہ شدت اور اصرار کے ساتھ پیش پیش وہی تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر ہندوستان دو حکومتوں میں تقسیم ہو چکا ہے تو پھر ایک دن کے لیے بھی متحدہ فوج نہ قائم رہ سکتی ہے نہ رہنی چاہیے۔ (۱)

فوج بھی شریک قتل و غارت ہوگئی

میں سمجھتا ہوں، یہ نہایت خطرناک فیصلہ تھا اس نے فوج کو قومیت کی بنیاد پر تقسیم کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ وارانہ زہر فوج میں بھی سرایت کر گیا، جو اب تک اس سے محفوظ تھی۔ ۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد جب دونوں طرف سے معصوم مردوں اور عورتوں کے خون کی ندیاں بہنے لگیں تو کتنے افسوس کا مقام ہے کہ کسی نہ کسی حد تک فوج کے آدمیوں نے بھی اس قتل و غارت میں حصہ لیا۔ (۲) (ص ۱۰۱، ۱۰۲)

۱۔ راجندر پرشاد گاندھی جی کے خاص الخاص چیلے مانے جاتے ہیں۔ عدم تشدد پر ان کا اعتقاد آزادی سے پہلے اس درجہ مستحکم تھا کہ آزادی ہند بھی اس کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت رکھتی تھی، لیکن آزادی کے بعد ان کی روش بدل گئی اور وہ بھی فوج کو اسی طرح ضروری سمجھنے لگے جس طرح وہ لوگ جو ہمیشہ سے عدم تشدد کے نظریہ کو ایک مذاق سمجھتے رہے ہیں۔

۲۔ دبے الفاظ میں مولانا نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ فوج بھی مسلمانوں کے قتل و غارت میں ہندو عوام کا ساتھ دے رہی تھی۔ تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل۔

(۱۶)

راج گوپال اچاری

ماڈریٹ انقلاب پسند کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں کا جہاں تک تعلق تھا اُن کی بڑی تعداد جنگ کے بارے میں کوئی معین رائے نہیں رکھتی تھی۔ یہ سب گاندھی جی کی رہنمائی سے لَو لگاتے بیٹھے تھے صرف راجگوپال اچاری ایک ایسے شخص تھے جو تجاویز کرپس کو بے چون و چرا مان لینے کے حق میں تھے لیکن اُن کے خیالات کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتے تھے۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات تھی کہ کانگرسی حلقے میں وہ ایسے شخص سمجھے جاتے تھے جسے مشکل کسی ماڈریٹ (معتدل مزاج سیاستدان) سے ممتاز مانا جاسکتا تھا۔ (۱)

(ص ۵۰/۵۱)

پاکستان کی تائید کرنے والا پہلا کانگرسی لیڈر گزشتہ کچھ عرصے سے مسٹر راجگوپال اچاری کو ملک کے فرقہ وارانہ حالات نے بہت زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے اختلاف کے باعث ہندوستان کی آزادی رکی ہوئی ہے۔ کرپس مشن کے مسترد ہونے کے فوراً بعد وہ کھلے بندوں کہنے لگے کہ اگر کانگرس مسلم لیگ کے مطالبات تسلیم کرے تو تو آزادیٔ ہند کے راستے کا پتھر ہٹ جائے گا۔ انہوں نے ان خیالات کے اظہار پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مدراس اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے

سامنے اس مضمون کی ایک تجویز پیش کی اور اُسے منظور کرالیا۔ (۲)

راجہ جی کی خود سری

راجگوپال اچاری نے یہ تجویز پیش کرنے سے پیشتر نہ مجھ سے نہ ہمارے رفقا میں سے کسی اور سے مشورہ کیا۔ اخبارات میں یہ تجویز پڑھ کر میں بے کل ہوگیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ مدراس اسمبلی نے جو تجویز منظور کی ہے وہ کانگرس کی اعلان کردہ پالیسی کے خلاف ہے، ورکنگ کمیٹی کے ایک ذمہ دار ممبر کی حیثیت سے انہیں چاہیے تھا کہ اپنے رفقا ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کرتے پھر اپنے خیالات ظاہر کرتے اور مدراس اسمبلی سے تجویز منظور کراتے، ورکنگ کمیٹی ان کی بات نہ مانتی تو استعفا دے کر اپنے خیالات کا پرچار کرتے۔ انھوں نے مجھے ایک خط لکھا۔

راجہ جی کا استعفا

"میں آپ پر واضح کر چکا ہوں کہ اس مسئلے پر میرے احساسات کتنے شدید ہیں، میں فرض ناشناسی کا مرتکب ہوں گا، اگر لوگوں کو اس بات کے سوچنے اور اس راہ پر چلنے کی دعوت نہ دوں جو میرے نزدیک صحیح اور درست ہے لہٰذا مجھے اجازت دیجیے کہ میں ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہو جاؤں۔" (۳) (ص ۶۹، ۶۸، ۶۷)

گاندھی جی کا آمرانہ حکم (اپریل ۴۶ء کابینہ وفد دہلی میں مقیم ہے)

شری راجگوپال اچاری نے جب یہ مہم شروع کی کہ کانگرس مسلم لیگ کا مطالبہ مان لے بلکہ یہاں تک آگے گئے کہ اصولی طور پر تقسیم ہند کی بھی حمایت کرنے لگے تو انہیں ورکنگ کمیٹی سے الگ ہونا پڑا اور کانگرس کے حلقے میں وہ غیر مقبول ہو گئے گاندھی جی نے بھی راجہ جی کی سرگرمیوں کو پسند نہیں کیا وہ نہیں چاہتے تھے کہ راجہ جی کابینہ وفد سے ملاقات کریں۔ انھوں نے راجہ جی کو ہدایت کی وہ فی الحال مدراس سے باہر نہ نکلیں گاندھی جی کی یہ خواہش تھی کہ وہ دہلی بھی نہ آئیں۔ (۴)
(ص ۱۴۶)

---

(۱)

مدراس میں کانگرس کی مقبولیت اور اثر و رسوخ میں راجہ جی کے ایثار، قربانی اور خدمات کو بڑا دخل تھا۔ گاندھی جی سے انہیں اتنی عقیدت تھی کہ گو وہ اعلیٰ ذات کے ہندو (برہمن) تھے اور گاندھی جی کا درجہ حسب و نسب کے اعتبار سے اُن سے پست تھا کیونکہ وہ بنیے تھے، پھر بھی خاندانی رسم و رواج اور مذہبی پابندیوں کو ٹھکرا کر انہوں نے اپنی لڑکی گاندھی جی کے صاحبزادے مسٹر دیوی داس سے بیاہ دی۔ لیکن چونکہ وہ آزاد خیال تھے اور اپنے مسلک پر سختی سے قائم رہنے کے عادی تھے اس لیے کبھی بھی انہیں کانگرس میں وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو ہونا چاہیے تھا۔

(۲)

راجہ جی کی آزاد خیالی کا یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ جب انہوں نے دیکھا تقسیم ہند قبول کیے بغیر چارہ نہیں تو بے تامل خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی ہر دلعزیزی کو داؤں پر لگا کر پاکستان کی حمایت شروع کر دی۔ بمبئی کے ایک جلسے میں جب انہوں نے اپنے خیالات کا بے لاگ طریق پر اظہار کیا تو جہاسبھائی ہندوؤں نے اُن پر گندے انڈے پھینکے، تارکول پھینکا اور نہ جانے کس قسم کا کوڑا کرکٹ پھینکا، لیکن اُن کی استقامت میں فرق نہ آیا۔ ان مخالفانہ مظاہروں سے وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوئے اور اپنی روش پر قائم رہے۔

۳۔ ہندوستان کے تمام ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگرس کی وزارت قائم تھی مدراس میں بھی کانگرس وزارت برسرکار تھی اور راجہ جی وزیر اعظم تھے۔

راجہ جی نے مزید جرأت کا ثبوت دیا اور انہوں نے اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے جلسے میں پاکستان کی تجویز منظور کرا لی۔

اس واقعے سے کانگرسی لیڈر حد درجہ برہم تھے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ الٰہ آباد میں مولانا آزاد نے ورکنگ کمیٹی کا جلسہ طلب کیا۔ بمبئی سے سردار پٹیل اور راجہ جی سوئے اتفاق سے وہاں موجود تھے ایک ہی دن، ایک ہی ٹرین سے اور ایک ہی کمپارٹمنٹ میں روانہ ہوئے۔ لیکن راستے بھر سردار پٹیل نے راجہ جی سے گفتگو نہیں کی، وہ ان کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے تھے بات کرنا کس طرح گوارہ

کر لیتے؟"

الٰہ آباد پہنچنے کے بعد بیچارے پر اس درجہ یورش ہوئی کہ آخر کار انہیں ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے مستعفی ہونا پڑا۔

۴۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہو جانے کے بعد بھی اپنی طرف سے راجہ جی نے گاندھی جی اور دوسرے لیڈران کانگرس سے تعلقات منقطع نہیں کیے، گاندھی جی نے اس رویہ کا یہ جواب دیا کہ اُن پر پابندی عائد کر دی کہ کابینہ وفد کے ارکان سے نہ صرف ملاقات اور تبادلہ خیالات نہ کریں بلکہ سرے سے دہلی ہی نہ آئیں، مبادا کہ اُن کے آنے سے کوئی ایسی بات رونما ہو جائے جس سے مسلم لیگ کے موقف کو تقویت پہنچے۔

راجہ جی ایک زیرک آدمی ٹھہرے، انہوں نے گاندھی جی کو نظر انداز کر کے صدر کانگرس سے اپنے دہلی آنے کے ارادہ کا اظہار کیا، انہوں نے اجازت دے دی۔ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ اندر ہی اندر کیا ہو رہا ہے تب راجہ جی دہلی آتے مگر گاندھی جی کے عتاب سے نہ بچ سکے۔

---

(۱۷)

زلیخا بیگم ابوالکلام

مرضِ مزمن

گزشتہ چند سال سے میری اہلیہ بیمار چلی آرہی تھیں۔ سنہ ۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں تھا ان کی حالت بہت نازک ہو گئی تھی۔ رہا ہونے کے بعد میں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا، انہوں نے تبادلۂ آب و ہوا کی رائے دی، وہ رانچی چلی گئیں جہاں سے جولائی ۱۹۴۲ء میں واپس آئیں۔ اب ان کی حالت نسبتاً بہتر تھی لیکن اگست کے پہلے ہفتہ میں جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہوا تو ان کی صحت نے پھر سے تشویشناک صورت اختیار کرلی۔ ۹؍ اگست سنہ ۴۲ء کو میری گرفتاری کی خبر سن کر انہیں سخت دھچکا لگا۔ ان کی صحت جو پہلے ہی تشویشناک تھی اب اور زیادہ ابتر ہو گئی۔

تشویشناک اطلاعات

احمد نگر کے زمانۂ نظر بندی میں ان کی گرتی ہوئی صحت کی اطلاعیں برابر مجھے ملتی رہیں۔ ۱۹۴۴ء کے آغاز میں مجھے گھر سے اطلاع ملی کہ ان کی حالت بہت نازک ہے پھر پے بہ پے تشویشناک اطلاعات آنے لگیں، ان کے معالج سخت پریشان تھے، وہ ان کی زندگی خطرہ میں محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے بطورِ خود گورنر کو لکھا کہ مجھے ان سے ایک مرتبہ ملنے کی اجازت دی جائے کیونکہ ان کے بچنے کی اب کوئی امید نہیں ہے، حکومت نے ڈاکٹروں کے اس خط کو نظر انداز کر دیا، میں نے خود بھی وائسرائے کو لکھا لیکن ہماری مراسلت بے نتیجہ رہی۔

وفات

اپریل کا مہینہ تھا، دوپہر کے وقت پیتیا خاں تشریف لاتے، یہ بالکل غیر معمولی بات تھی، انھوں نے زبان سے کچھ نہ کہا، ایک تار میری طرف بڑھا دیا، یہ کلکتہ سے آیا تھا؛ اس میں تحریر تھا کہ میری اہلیہ وفات پا گئی ہیں، میں نے وائسرائے کو لکھا، حکومت آسانی کے ساتھ مجھے کلکتہ منتقل کر سکتی تھی، تاکہ آخری مرتبہ میں مرنے والی کو دیکھ لیتا، اس خط کا مجھے کوئی جواب نہ ملا۔

(ص ۹۱، ۹۲)

میری رہائی

جون کی ایک شام کو میں نے ریڈیو پر سنا کہ وائسرائے ہندوستان کا سیاسی مسئلہ طے کرنے کے لیے شملہ میں ایک کانفرنس منعقد کر رہے ہیں جس میں کانگرس، مسلم لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کے نمائندے مدعو کیے گئے ہیں، صدر کانگرس اور ورکنگ کمیٹی کی رہائی کے احکامات جاری کر دیے ہیں تاکہ وہ کانفرنس میں حصہ لے سکیں، دوسرے روز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھے رہائی کا حکم سنایا اور بتایا کہ کلکتہ ایکسپریس بنکورا سے پانچ بجے شام جائے گی۔ فرسٹ کلاس کا ایک ڈبہ میرے لیے ریزرو کر دیا گیا ہے، دوسرے روز میں صبح ہوڑہ پہنچ گیا۔

پلیٹ فارم اور ہوڑا اسٹیشن پر آدمی ہی آدمی نظر آ رہے تھے بدقت تمام میں اپنے کمپارٹمنٹ سے نکل کر کار تک پہنچا، بنگال کانگرس کی صدر مسز لبانیہ بربھاوت اور دوسرے مقامی لیڈر میرے ساتھ کار میں بیٹھے تھے۔

یادِ ماضی

جب کار ہوڑا برج سے گزر رہی تھی میرا دماغ ماضی کے مناظر میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا جب آج سے تین سال پہلے کانگرس کے جلسہ میں شرکت کے لیے میں بمبئی سے روانہ ہوا تھا۔ میری اہلیہ مجھے الوداع کہنے دروازہ تک آئی تھیں، آج تین سال کے بعد واپس آیا ہوں لیکن وہ میرا انتظار کرنے والی گھر کے بجائے قبر میں ہمیشگی کی نیند سو رہی ہے اور میرا گھر خالی ہے، بے ساختہ مجھے ورڈس ورتھ کا یہ شعر یاد آ گیا۔

"لیکن وہ اپنی قبر میں سو رہی ہے اور آہ!
یہ جدائی میرے حصہ میں ہے"

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

میں نے اپنے رفقا سے کار موڑنے کو کہا، کیونکہ گھر جانے سے پہلے میں اس کی قبر کی زیارت کر لینا چاہتا تھا، میری کار ہاروں سے ڈھکی ہوئی تھی، میں نے ایک ہار اُٹھایا اور اس کی قبر پر رکھ دیا، پھر فاتحہ پڑھا اور چلا آیا۔ (۱)

(ص ۹۹، ۱۰۰)

---

(۱)
زلیخا بیگم مولانا کی اہلیہ محترمہ کا نام تھا، مولانا اتنے زیادہ پر ملتفت نہیں تھے، جتنی یہ شوہر پر جان چھڑکتی تھیں، میں نے جب کراچی سے ۱۹۵۳ء سے ماہنامہ "ریاض" نکالا تو اس کے کاتب منشی جمیل احمد صاحب لکھنوی تھے، یہ عرصہ دراز تک مولانا کے پاس "الہلال" میں ملازم رہ چکے ہیں، مولانا ان پر بہت مہربان تھے، گھر میں بھی ان کی آمد و رفت تھی، جمیل صاحب سے ایک دن مولانا کا ذکر چھڑ گیا، وہ فرماتے تھے کہ زلیخا بیگم مولانا سے غیر معمولی محبت کرتی تھیں، کہنے لگے مولانا جب رانچی میں نظر بند کیے گئے غالباً ۱۹۱۶ء زلیخا بیگم ایک ہی سوال ہر شخص سے کیا کرتی تھیں۔

"مولانا اس وقت کیا کر رہے ہوں گے؟"

اپنی اہلیہ کے بارے میں مولانا نے غبارِ خاطر میں بھی اپنے تاثرات قلمبند کیے تھے، وہ چونکہ حادثہ کے فوراً بعد لکھے گئے تھے، اس لیے ان میں ایک خاص کیفیت ہے ضروری حصہ درج ذیل ہے:

جان ہار بیوی میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں میں جب نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویش خاطر کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا، مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا، رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیلی آب و ہوا کی ہوئی اور

وہ رانچی چلی گئی، رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا، جولائی میں آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آرہی تھی۔

اس تمام زمانہ میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی، ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است

خاموش گفتگو جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتے کے بعد کلکتہ واپس ہوا اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا، یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف اُمنڈنے لگے تھے، حکومت کے ارادہ کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام پر بھیج دیا جائے گا۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کام لے سکتی ہے، اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا، ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے اندر بسر کیے تھے اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے، میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے، اس لیے وہ بھی خاموش تھی لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے کم نہ تھی، ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سُن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

خُدا حافظ ۳ راگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسبِ معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا

واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے، اس نے خداحافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا، لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا، اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم!

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا، شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے وہ خداحافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا، اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

افکار و عقائد میں شریک اقدام و عمل میں مددگار

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی طور پر میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقع پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔

علالت کی پہلی اطلاع

۲۳ر مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلیگرام کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اسی مضمون کا ایک ٹیلیگرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلیگرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیے

یہ تار جو ۲۳ر مارچ کو یہاں پہنچا، فوجی خط رمز (CODE) میں لکھا گیا تھا سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا وہ اسے فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گیا، رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

ریڈیو اور اخبارات سے اطلاع

دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آچکا تھا۔ معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورت حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو پر سنتا تھا اور یہاں بعض رفقا سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

سپرنٹنڈنٹ کی ہمدردی

جس دن تار ملا اس سے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی، وہ صورت حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی، وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما پر کہی تھی۔

میرا سکون جاتا رہا

جونہی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی، میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کیا، انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں، پھر بھی یہ معمہ حل

نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گزری ہے کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقع پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

"تا دست رسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم!"

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جدّوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدّوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے، وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

ظاہر اور باطن کی کشمکش

اس زمانہ میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا، میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لوں، اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا۔ لیکن شاید باطن نہ ہو سکا، میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعلات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

صبر کا دکھاوا

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں ان میں فرق نہ آنے پاتے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرے سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرے میں جانا پڑتا ہے، چونکہ زندگی کے معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں، اس لیے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا، میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرے سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا، بھوک یک قلم بند ہو گئی تھی، لیکن چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی۔ اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا جتنی دیر تک وہاں

بیٹھتا تھا، جس طرح باتیں کرتا تھا اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

ضبط کی نمائش

اخبارات یہاں بارہ بجے سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر میرے پاس سیدھا میرے کمرے میں آتا ہے۔ جونہی اس کے کمرے سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی، دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی لیکن پھر میں فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی پلیٹھ دروازے کی طرف ہے، اس لیے جب تک ایک آدمی ..ر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جاتے میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوتے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر کچھ لکھنے میں مشغول ہو جاتا گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لیے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و قرار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔

بدہ یارب دلے کیں صورت بے جاں نمی خواہم

زہر غم کا پیالہ

بالآخر ۹ اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا

فان ما تحذرین فقد وقع

۲ بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار میرے حوالے کیا جس میں حادثے کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعے صبح ہی کو معلوم ہو گئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقا سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

۲۶ سال کی رفاقت کا خاتمہ

اس طرح ہماری چھبیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔ مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافل نیم ز راہ، ولے آہ چارہ نیست
ایں رہزناں کہ بر دل آگاہ می زنند!

مرثیہ یہاں احاطے کے اندر ایک پرانی قبر ہے، نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتے لگتا ہے جیسے ایک نئی طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہے کل شام کو دیر تک اسے تکتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا، بے اختیار یاد آگیا۔

لقد لامنی عند القبور علی البکاء — رفیقی لتذراف الدموع السوافک
فقال اتبکی کل قبر رأیتہ — لقبر ثوی بین اللوی فالدکادک
فقلت لہ ان الشجا یبعث الشجا — فدعنی فھذا کلہ قبر مالک

اب قلم روکتا ہوں۔

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

"غبارِ خاطر" کے اس اثر انگیز اقتباس کے بعد میں محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ کے ایک مضمون کا اقتباس بھی پیش کرنا چاہتا ہوں، حمیدہ سلطان کی والدہ اور زلیخا بیگم سے بہناپا تھا اور تعلقات عزیزانہ حد تک پہنچ گئے تھے، لہٰذا ان کی تحریر کے مستند ہونے میں شبہ نہیں۔

حمیدہ سلطان صاحبہ اپنے مضمون میں جو مولانا کی وفات کے بعد شائع ہوا ہے فرماتی ہیں:

یہ تھیں زلیخا بیگم نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، جبی بھویں، پگھلے ہوتے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ، یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لانبے بال، بوٹا سا قد، مائل بگداز دلآویز جسم، سفید کالی کنی کی سوتی باریک ساڑی بے پروائی سے لپیٹے، مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لیے میں نے اس دنیا کی حور کو دیکھا ہے۔ یہ مولانا ابو الکلام آزاد کی

رفیقۂ حیات زلیخا بیگم تھیں۔

فرض شناس بیوی ایک مرتبہ صبح دس بجے (میری والدہ) ان کے یہاں پہنچیں تو خلافِ عادت اس دن وہ پندرہ منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئیں اور معانقہ کرتے ہوئے کہا ”معاف کیجئے گا، آپ کو اتنی دیر میرا انتظار کرنا پڑا۔ میں مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی وہ بہت تھوڑا اور سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ دو چمچے اُبلے ہوئے چاول، تھوڑی دال، سبزی یا گوشت اور دہی، چونکہ بہت سویرے اُٹھ جاتے ہیں اس لیے دوپہر کے کھانے کے بعد بارہ بجے سے بھی پہلے لیٹ جاتے ہیں، پھر دو بجے غسل کر کے نماز پڑھتے ہیں، اس کے بعد کاموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔

وہ اندازِ حجاب بیگم آزاد کے بکھرے بالوں کی طرف اشارہ کر کے (والدہ) بولیں مگر ”بھاوج معلوم ہوتا ہے ہمارے بھائی کو آپ کی زلفِ پریشاں بہت پسند ہے جو آپ سر نہیں گوندھتیں“۔ وہ لجا کر بولیں ”اے نہیں جہیں یہ بات نہیں، ان کے بار بار جیل جانے سے میری طبیعت کچھ خفقانی ہو گئی ہے کہ چوٹی گوندھنے سے دل گھبراتا ہے“۔ وہ اندازِ حجاب آج بھی مجھے یاد ہے یا اس دن ان پر تنقید کرنے کی ٹھان کر گئی تھیں، پھر ان کی خالی کلائیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ”اے توبہ ایسی بھی کیا سادگی، دہم نہیں آتا۔ اللہ تمہارا سہاگ قائم رکھے ایک چوڑی ہاتھ میں ڈال لیا کرو۔“

دل بجھ گیا تھا انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا ”آخر ہیں نا آپ بھی نند، بالکل سسرال والوں کی طرح طعنے دے رہی ہیں، اچھا آئندہ میں آپ کی خوشی کا خیال رکھوں گی“، دوسرے ہفتے جو وہ ملنے آئیں تو پشت پر چوٹی لہرا رہی تھی چکن کا خوبصورت بلاؤز پہنے تھیں اور ہلکی دھانی ریشمی ساری زیبِ تن تھی، ہاتھوں میں سونے کی دو دو چوڑیاں تھیں، کانوں میں بندے، اچھے لباس اور ہلکی سی آرائش نے ان کی من موہنی صورت کو اور بھی دلربا کر دیا تھا یہ ان کو گلے لگا کر مسرور لہجے میں بولیں ”اے ہے کہیں بُری نظر نہ لگ جائے آج تو ماشاء اللہ چشم بد دور بہت اچھی لگ رہی ہو“ وہ حسبِ عادت لجا کر

بولیں ،، آپ کو خوش کرنا تھا، ورنہ مجھے تو اب رنگین کپڑے اور زیور پہنتے ہوئے شرم آتی ہے۔،، ارے ہے اور سنو! حد کر دی تم نے بھی! ابھی تمہاری عمر کون سی ایسی ہے سہاگنیں تو بڑھاپے میں بھی پیلا کپڑا پہنتی ہیں۔

شوہر پرست بیوی

ایک دن صبح جو ہم پہنچے تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں ڈورے دیکھ کر والدہ نے ان سے مسکرا کر کہا، کیا رتجگا کیا ہے بھاوج! آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں،، وہ ہنس کر بولیں، آپ کی تو عادت ہے ہی بنانے کی، آجکل مولانا قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں، رات کو دو بجے کے بعد اُٹھ بیٹھتے ہیں، جتنی دیر وہ لکھتے ہیں پنکھا جھلتی ہوں، موسم بہت گرم ہے، باہر بجلی جلتی ہی رہتا ہے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔

ستی ستونتی

مولانا آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی تو وہ بارہ سال کے معصوم لڑکے تھے اور زلیخا بیگم چھ سال کی ننھی منھی بچی تھیں، ان کے والد آفتاب الدین صاحب بغداد کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے، ان کا سلسلہ نسب حضرت صدیق اکبر سے جا ملتا ہے۔ آفتاب الدین صاحب مولانا کے والد بزرگوار کے خاص مریدوں میں سے تھے، زلیخا بیگم ان کی پانچویں صاحبزادی تھیں۔ ان کے پیدا ہوتے ہی انہوں نے پیر کے قدموں پر لاکر ڈال دیا۔ انہوں نے بہت محبت سے اس حسین پیاری بچی کو گود میں لیا اور زلیخا نام رکھا، بعد میں موہنی صورت والی بچی ان کو اتنی اچھی لگی کہ اس کو انہوں نے اپنی بہو بنا لیا، چھ سال کی بالی عمر میں زلیخا بیگم بیاہ کر آگئیں، ان کے ننھے سے دل پر اسی وقت سے ہی اپنے یوسف جمال شوہر کا قبضہ ہو گیا اور شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ اس عظیم انسان کی پرستش کرنے لگیں۔ مولانا کے ہر خیال کو انہوں نے سر آنکھوں پر رکھا، ہجر کی سختیاں بھی سہیں اور مالی سختیاں بھی سہیں اور مالی مشکلات بھی برداشت کیں مگر لب پر کبھی اُف تک نہ لائیں۔ مولانا کی مالی حالت سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کی وجہ سے کبھی اچھی نہیں رہی، ان کی رفیق حیات نہ اچھا کھاتی نہ اچھا پہنتی، ان تمام تکالیف کو محبت اور سکون سے برداشت کرتی جو شوہر کی

جدائی اور رسالی پریشانی کی وجہ سے اس پر گزر رہیں۔ زلیخا بیگم کا زیادہ وقت یادِ الٰہی اور مولانا کی کامیابی کی دعاؤں میں گزرتا، ہر وقت کڑھتے رہنے کی باعث ان کی صحت گر گئی تھی، مگر یہ ستی ستونتی اپنی دُھن میں مگن رہی، اپنی خرابیٔ صحت کا ذکر کبھی مولانا سے نہیں کیا جس وقت بھی اور جتنے دن بعد بھی وہ گھر آتے یہ پاک طینت بیوی ہمہ تن شوق بنی ان کا استقبال کرتی اور ہر طرح شوہر کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی۔

کمسنی کی شادی کا اثر مولانا فطری طور پر آزاد طبیعت اور والہانہ جذبات کے مالک تھے اس لیے اپنی کم عمری کی شادی سے ایک دوسرے بڑے فن کا غالب کی طرح خوش نہیں تھے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی اپنی باوفا محبت کرنے والی بیوی کا خیال نہیں تھا یا ان کی ازدواجی زندگی اچھی نہیں گزری۔

بسترِ مرگ پر شوہر کی یاد (بیماری کے زمانہ میں) ان کو بس دن رات مولانا کی سلامتی کی دعائیں مانگنے اور رونے کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا دوا انھوں نے بالکل چھوڑ دی تھی، غذا بھی برائے نام تھی، دق کا نامراد مرض دو سال سے پیچھا کیے ہوئے تھا، اب کمزور جسم پر اس نے بالکل تسلط جما لیا، ڈاکٹر بی سی رائے اور کلکتہ کے مشہور ڈاکٹروں نے ان کو دیکھا مگر مریض کو افاقہ کیسے ہوتا جبکہ نہ دوا تھی نہ غذا، وہ ہر ایک معالج سے یہی کہتی تھیں "بس خدا کے لیے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو"، ان کی حالت دیکھ کر اور التجا سن کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہر ڈاکٹر چارپائی سے اُٹھتا تھا۔

باوفا بیوی کی یاد (زلیخا بیگم کے انتقال کے بعد مولانا) ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ زلیخا بیگم کی زندگی میں ان کو یہ غالباً احساس نہ تھا کہ اس باوفا بیوی سے خود ان کو بھی دلی لگاؤ ہے لیکن مرنے والی کے جانے کے بعد جیسے ان کی زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا، اپنی زندگی کی یہ متاعِ عزیز بھی ملک و قوم پر وہ نچھاور کر چکے تھے۔ اس خدا کی بھری ہوئی دنیا میں ان کے لیے کاموں اور مرحومہ کی یاد کے علاوہ کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی، اللہ تعالیٰ نے جیسے اور بہت سی نوازشوں سے مولانا آزاد کو نوازا تھا وہاں ایسی باوفا نیک طینت پاکیزہ صورت بیوی بھی عطا فرمائی تھی، زلیخا بیگم کی ذات پر عالمِ نسواں جتنا فخر کرے بجا ہے۔)

معصوم اور فرشتہ صفت خاتون

میرا یہ کہنا تعلّی نہیں حقیقت ہے میری مرحومہ ماں حسن کی مورت تھیں۔ میں نے اور بھی حسین و جمیل خواتین کو دیکھا لیکن جیسی معصومیت اور تقدس بیگم آزاد کی صورت پر میں نے دیکھا ایسا پھر کبھی کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ اس دُنیائے آب و گل کی رہنے والی ہستی نہیں آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی پاکیزگی خیال کا یہ عالم تھا کہ کبھی ٹیلیفون کا ریسور اس لیے نہیں اٹھاتی تھیں کہ نہ جانے دوسری طرف کون اور کیسا آدمی بات کر رہا ہوگا، اس زمانے میں ایسی عفت مآب خواتین کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔

غم جانکاہ

۱۹۴۷ء کے بعد میں اکثر مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہوتی وہ مجھ پر شفقت فرماتے۔ ایک مرتبہ دوران گفتگو میں مرحومہ کا ذکر میں نے کیا۔ مولانا صاحب ایک دم اس طرح خاموش ہو گئے گویا اس ذکر نے ان کے نشتر لگا دیا وہ بہت دیر تک سرنگوں خاموش بیٹھے رہے۔ میں بھی دم بخود پشیمان سی بیٹھی ان کے اس جانکاہ غم کا اندازہ کر رہی تھی۔

---

(۱۸)

سی، آر، داس

نریمان سے بدسلوکی کا ذکر جب میں اس سلوک پر غور کرتا ہوں جو مسٹر نریمان کے ساتھ روا رکھا گیا تھا تو میری چشم تصور میں پچھلا زمانہ تازہ ہو جاتا ہے اور سی، آر، داس کی تصویر ابھر آتی ہے۔ سی، آر، داس، تحریک عدم تعاون کی چند غیر معمولی قوت رکھنے والی شخصیتوں میں سے ایک،، (۱)

سی، آر، داس حقیقت پسند تھے ہماری قومی جدوجہد کی تحریک میں مسٹر سی، آر، داس ایک رتبۂ خاص پر فائز ہیں۔ ان کی نگاہ دُور بیں اور تخیلات وسیع تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ عملی دماغ کے مالک تھے جو ہر مسئلہ کو حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کا خوگر ہوتا ہے وہ اپنے خیالات و عقائد کا بے باکانہ اظہار کر سکتے تھے اور جب بات کو حق سمجھ لیتے تھے پوری بے خوفی کے ساتھ اس پر اڑ جاتے تھے۔ اس کی شخصیت سے میں بہت متاثر تھا۔ (۲)

داس کی غیر معمولی صلاحیتیں جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ مسٹر داس عملی دماغ کے آدمی تھے سیاسی مسائل پر وہ اس طرح سوچتے تھے کہ تجویزات کی جاتے وہ مناسب بھی ہو اور قابل عمل بھی، اُن کا فیصلہ تھا کہ اگر ہندوستان گفت و شنید کے ذریعہ آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے تو یہیں یہ مقصد قدم بہ قدم حاصل کرنا پڑے گا۔ جب معاملہ طلب و التجا پر آ ٹھہرا تو یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ

مکمل آزادی فوری طور پر حاصل ہو سکے گی۔ ان کی پیش گوئی تھی کہ سب سے پہلے ہمیں پراونشل اٹونومی (صوبائی خود مختاری) حاصل ہوگی وہ اس بات سے مطمئن تھے کہ محدود اختیارات بھی اگر ہمارے ہاتھ میں ہو تو آزادئ ہند کی طرف یہ اقدام ہوگا اور ہندوستانیوں میں زیادہ گراں ذمہ داریوں کو نباہنے کی استعداد، جب اور جیسے بھی کوئی موقع حاصل ہوا پیدا ہو جائے گی۔ مسٹر داس کی دوربینی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی وفات کے دس سال بعد انہی کی بتائی ہوئی لائن پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نافذ ہوا۔

(ص ۱۶)

سوراج پارٹی (داخلہ کونسل کی حامی کانگریس پارٹی)

مسٹر داس کی وسعت قلب نے مرکزی اسمبلی اور صوبائی کونسلوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ سوراج پارٹی کی نمایاں تر امتیازی کامیابی یہ تھی کہ (جداگانہ انتخاب کے باعث) جو نشستیں مسلمانوں کے لیے مخصوص تھیں (ان کا بڑا حصہ بھی) اس نے جیت لیا۔ یہ نتیجہ تھا مسٹر داس کی حقیقت پسندی کا، مسٹر داس نے بنگال کے مسلمانوں کے خدشات اور خطرات دور کر دیے اور اُن کے بھی لیڈر بن گئے۔ جس طرح مسٹر داس نے بنگال کی فرقہ وارانہ گتھی سلجھائی وہ ناقابلِ فراموش ہے اور آج بھی وہ مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

اجمال کی تفصیل بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن متعدد وجوہ و اسباب کے باعث وہ سیاسی اور تعلیمی طور پر پسماندہ تھے۔ اگرچہ ان کی تعداد پچپن فی صد سے زیادہ تھی لیکن مشکل سے تیس فی صد سرکاری آسامیاں ان کے حصہ میں آتی تھیں، مسٹر داس حقیقت پسند شخص تھے انہوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ جب تک مسلمانوں کو ان کے اقتصادی مستقبل کی سلامتی سے متعلق ضروری تحفظات اور تیقنات نہ دیے جائیں۔ اُن سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ جوش اور ولولہ کے ساتھ کانگریس میں شرکت کریں گے۔ چنانچہ مسٹر داس نے اس سلسلہ میں ایک اہم اعلان شائع کیا جس سے نہ صرف بنگال کو بلکہ سارے ہندوستان کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ مسٹر داس نے اپنے اعلان میں بتایا کہ جب بنگال میں کانگریس عنان اقتدار اپنے

ہاتھ میں رہے گی۔ وہ سرکاری آسامیوں کا ساٹھ فی صد جملہ نئے تقررات میں مسلمانوں کے لیے مخصوص کردے گی، جب تک ان کا تناسب پورا نہ ہو جائے کلکتہ کارپوریشن کے سلسلہ میں انھوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مذکورہ اصول کے ماتحت جملہ نئے تقررات کا اسّی فی صد مسلمانوں کے لیے مخصوص کردیا، انھوں نے کہا جب تک ملازمتوں اور بلک عہدوں میں مسلمانوں کو پورا پورا حق نہیں ملے گا۔ اس وقت تک بنگال میں صحیح قسم کی جمہوریت وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔ ایک مرتبہ اگر غیر مساوی امتیازات (ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان) کا تدارک کر دیا گیا تو مسلمان دوسری ملتوں سے برابر کا مقابلہ کر سکیں گے اور پھر ان کے لیے کسی اختصاص کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی گی۔

کانگریسی داس سے خفا ہو گئے

مسٹر داس کے اس دلیرانہ اعلان نے بنگال کانگریس کی بنیاد ہلادی۔ بہت سے کانگریسی لیڈروں نے بپھرے ہوئے انداز میں اس تجویز کی مخالفت کی اور مسٹر داس کے خلاف باقاعدہ ایک مہم شروع ہو گئی۔ انہیں موقع پرست کہا گیا۔ ان پر مسلمانوں کی کورانہ حمایت کا الزام لگایا گیا، لیکن وہ چٹان کی طرح ثابت قدم رہے۔ انھوں نے سارے صوبے کا دورہ کیا اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ ان کے اس طرزِ عمل نے بنگال کے اندر اور بنگال کے باہر مسلمانوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔

تقسیمِ ہند کا پہلا بیج

مجھے یقین ہے کہ اگر قبل از وقت ان کی وفات نہ ہو گئی ہوتی تو وہ ملک میں ایک نئی فضا پیدا کر دیتے، افسوس کا مقام ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے متبعین نے انہیں غلط کار قرار دیا اور ان کے اعلان (اپنے عمل سے) تردید کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کے مسلمان کانگریس سے دور ہٹتے گئے اس طرح تقسیمِ ہند کا پہلا بیج بنگال میں پڑا۔

(ص ۲۱، ۲۰)

---

(۱)

مولانا نے مسٹر نریمان کا تذکرہ کیا ہے اُن کا مفصل ذکر اپنے موقعہ پر موجود ہے

اس جگہ ربط کلام کے لیے آتنا پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مسٹر نریمان، بمبئی صوبہ کانگرس کمیٹی کے صدر تھے اور کانگرس کے لیے بڑی قربانیاں کر چکے تھے۔ بار بار جیل گئے، بمبئی کے گورنر سر جارج لائڈ سے، سحر میں جس کے نام پر "لائڈ بیرج" مشہور ہے ٹکر لی لیکن ذرا ہراساں نہ ہوئے۔

انڈیا ایکٹ کے ماتحت جب کانگرس نے وزارت سازی کا کام شروع کیا، تو بمبئی میں اصولی اور اخلاقی ہر لحاظ سے نریمان صاحب وزارت عظمیٰ کے مستحق تھے۔ اصولی اعتبار سے اس لیے کہ صوبہ کانگرس کے برسہابرس سے صدر چلے آ رہے تھے اور اخلاقی اعتبار سے یوں کہ وہ اقلیت (پارسی قوم) کے ایک فرد تھے لہٰذا وہ ہر طرح کی حوصلہ افزائی کے سزاوار تھے۔

لیکن سردار پٹیل کا تعصب اسے گوارا نہ کر سکا کہ ہندوستان کے سب سے بڑے اور تجارتی وصنعتی صوبے کا وزیر اعلیٰ، ایک ہندو کے بجائے اقلیت کا کوئی فرد ہو چنانچہ انہوں نے راتوں رات مسٹر نریمان کو بغیر کسی وجہ کے معزول کر دیا، اور ان کے مقابلہ میں ایک نوآموز شخص مسٹر کھیر کو وزیر اعلیٰ بنا دیا۔

(۲) واقعی مسٹر سی، آر، داس جیسے لیڈر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا محمد علی مغفور بھی داس کے حب وطن، وسعت قلب، عالی ظرفی، بے تعصبی، رواداری اور شرافت وانسانیت کے بے حد قائل تھے۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر داس زندہ رہتے تو ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

مسٹر داس کے متبعین میں جے، ایم سین گپتا، سوباش چندر بوس، سرت چندر بوس اور دوسرے بہت سے لوگ تھے لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ سب لوگ بدل گئے اور فرقہ پرستوں کی نئی قسم "کانگرس فرقہ پرست" کے بانی بن گئے درحقیقت یہ ہے کہ اگر داس فارمولا عمل میں آتا تو نہ صرف بنگال میں ہندو مسلم اختلاف ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا بلکہ سارے ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دوست اور بھائی بن کر رہتے، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

---

(۳) مولانا نے یہ جو فرمایا ہے کہ داس کی وفات کے بعد ان کے متبعین نے ان کے اعلان

کی اپنے عمل سے تردید کر دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کے مسلمان کانگریس سے دُور ہٹتے گئے اس طرح تقسیم ہند کا پہلا بیج بنگال میں پڑا یہ غلط نہیں بالکل صحیح ہے۔

میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اس کے تعین میں سرت چندر بوس بھی تھے، جو آخر تک کانگرس کے مانے ہوتے لیڈر رہے، نہرو کابینہ میں بھی شریک تھے، ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں ایک کانگرسی لیڈر کی حیثیت سے انھوں نے وہ کیا کہ شاید جہا بھائی بھی اس کی جرآت نہ کر سکتا۔

۷ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر بوس نے کہا

"بنگال میں مرکزی اسمبلی کی مسلم نشستوں میں سے ہمیں پچاس فی صد مسلم نشستیں جیت لینے کی پوری اُمید ہے۔"

لیکن اس اُمید کی بنیاد کیا تھی؟

ایک نشست کے لیے مسٹر تمیز الدین (سابق اسپیکر پاکستان کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی) اور سر عبد الحلیم غزنوی میں مقابلہ تھا، بنگال میں کاشت کار اور کسان زیادہ تر مسلمان تھے زمیندار اور تعلقہ دار زیادہ تر ہندو۔

ان ہندو زمینداروں اور تعلقہ داروں کے نام مسٹر بوس نے ایک گشتی خط لکھا۔

"میرے دوست سر عبد الحلیم غزنوی مرکزی اسمبلی کے لیے اُمیدوار ہیں، انھوں نے ملک کی بیش بہا، خدمتیں انجام دی ہیں۔ مناسب ہے کہ اس مشکل وقت میں ان کے بہترین تجربات سے فائدہ اُٹھایا جائے اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مہربانی کر کے ان کی حمایت کریں اور اپنے مسلمان ملازمین اور کاشت کاروں کو ہدایت کریں کہ وہ سر غزنوی کو ووٹ دیں۔ اُن کی کامیابی کے لیے آپ "دوسری تدابیر" بھی اختیار کریں۔"

مسٹر بوس کانگرسی ذہنیت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

کانگرس ہمیشہ خان بہادروں اور سروں کو گالیاں دیتی رہی لیکن مسلم لیگ کی دشمنی میں اس نے حکومت برطانیہ کے ایک یار وفادار کو اپنا لیا۔ اس کی "بیش بہا" خدمات کا اعتراف کرنے لگی حالانکہ یہ بیش بہا خدمات ہمیشہ انگریزوں

کی تائید اور کانگرس کی مخالفت میں صرف ہوتے رہے تھے۔ کانگریس کے نزدیک آزادیٔ رائے کی کیا قیمت تھی، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وہ زمینداروں اور تعلقہ داروں کو ہدایت کر رہی ہے کہ اپنے "مسلمان" ملازمین اور کاشت کاروں کو مجبور کریں کہ وہ سر غزنوی کو ووٹ دیں۔

اور اس مکتوب گرامی میں ٹیپ کا بند یہ جملہ ہے

"سر غزنوی" کی کامیابی کے لیے آپ دوسری تدابیر بھی اختیار کریں!"

اگرچہ مسٹر بوس نے نہیں بتایا کہ "دوسری تدابیر" سے ان کی مراد کیا ہے لیکن بے بتائے ہوتے ہی کون نہیں جانتا کہ اس فصیح و بلیغ اشارہ کا مدعا، ترغیب اور تخویف ہی ہو سکتا ہے۔

کانگرس کی اس پستی پر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے آرگن نے نکتہ چینی کی تھی۔ مناسب ہو گا اگر اس کا ایک جھلک پیش نظر رہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء تک سر عبدالحلیم ہر ملکی مسئلہ کے متعلق کانگرس اور دیش بندھو (سی، آر، داس) کے مقابلہ میں حکومت کی حمایت (کونسل کے اندر اور باہر) کرتے رہے۔ مرکزی اسمبلی میں نمک پر ٹیکس بڑھانے میں سرکار کا ساتھ دیا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں جب حکومت بنگال نے انقلابیوں کو کچلنے کے لیے قانون فوجداری میں ترمیم کرنا چاہی تو اعتدال پسند رہنما بھی اس کی تائید کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے لیکن غزنوی کا نام ان رسوائے زمانہ لوگوں کی فہرست میں شامل ہے، جنہوں نے اس موقع پر حکومت کی تائید کی تھی۔

"سرت چندر بوس کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس کے مقابلہ میں سر عبدالحلیم کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔"

"لیگی امیدوار مولوی تمیز الدین نے عدم تعاون کی تحریک میں وکالت چھوڑ دی اور تحریک خلافت کے سلسلہ میں دو سال کی قید کاٹی، جیل میں انہیں کوڑے لگائے گئے اور ان کا بازو ٹوٹ گیا۔ رہا ہونے کے بعد وہ دانہ دانہ کو محتاج ہو گئے اور کئی دن تک کپڑا نہیچ کر پیٹ پالا۔ کانگریس

سے وہ اس وقت علیحدہ ہوتے جب بنگال کے کانگرسی رہنماؤں نے
دیش بندھو داس، (سی، آر، داس) کی مسلم دوست پالیسی سے منہ پھیر لیا
اس کے بعد وہ مسلم لیگ میں شریک ہو گئے"!"

پورن چندر جوشی نہ کانگرسی تھے نہ مسلم لیگی، وہ دونوں کے مخالف تھے، اس لیے کہ کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل تھے لیکن بنگالی ہونے کے سبب سیاسیات بنگال کے ماضی و حال سے واقف تھے۔ بنگال کے کانگرسی اور غیر کانگرسی رہنماؤں کا نامۂ اعمال اُن کے سامنے تھا۔ لیگ کے مخالف ہوتے ہوتے بھی وہ یہ برداشت نہ کر سکے کہ تمیز الدین جیسے سراپا ایثار اور آزمودہ کار، قومی کارکن کے مقابلہ میں، سر عبدالحلیم غزنوی جیسے دیرینہ کار غدّار ملک و قوم کو سہارا دیا جائے۔

لیکن کانگریس تو ہر قیمت پر مسلم لیگ کو شکست دینے پر تلی ہوتی تھی۔ اس سلسلہ میں اصول، شرافت، انسانیت، دیانت جو چیز بھی سنگ گراں بن کر حائل ہوتی اُسے ٹھکرانے کچلنے اور برباد کرنے کے لیے وہ تیار تھی، چنانچہ تمیز الدین کی مخالفت کر کے اور سر عبدالحلیم غزنوی کے "بیش بہا" خدمات کی داستان الف لیلیٰ سُنا کر وہ صرف یہ ثابت کر رہی تھی کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔

لیکن بنگال کے مسلمان قائد اعظم کے پرچم تلے متحد تھے ان میں سیاسی شعور بیدار ہو چکا تھا وہ دوست، دشمن کو پہچاننے لگے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراجہ قاسم بازار اور مہاراجہ بردوان اور دوسرے بڑے بڑے مہاسبھائی تعلقہ داروں اور زمینداروں کی سرپرستی حاصل کرنے کے بعد بھی کانگریس تمیز الدین کو شکست نہ دے سکی بیچارے سر غزنوی کی ضمانت تک ضبط ہو گئی۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو!

---

(۱۹)

سوبھاش چندر بوس

بوس کی روپوشی ۲۶ جنوری ۱۹۴۱ء کو یہ خبر منظرِ عام پر آئی کہ سوبھاش چندر بوس ہندوستان سے روپوش ہو گئے۔ تقریباً ایک سال تک ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ مارچ ۱۹۴۲ء میں برلن ریڈیو سے ان کی ایک تقریر نے تمام شبہات کا خاتمہ کر دیا، یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ جرمنی پہنچ چکے ہیں اور انگریزوں کے خلاف مصروفِ عمل ہیں۔ اس اثنا میں جاپان نے ہندوستان پر انگریزی تسلط کے خلاف زور شور سے پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ جاپان اور جرمنی کے اس مسلسل پروپیگنڈہ نے ہندوستانیوں کی بہت بڑی تعداد کو متاثر کیا۔ بہت سے لوگ جاپان کے مواعید سے متاثر ہوئے اور یقین کر لیا کہ جاپان، ہندوستان کی آزادی اور ایشیا کے استحکام کے لیے مصروفِ عمل ہے۔ (۱)

جاپان کے مرعوب کُن فتوحات ان لوگوں کا خیال تھا کہ جاپانی حملہ نے انگریزوں کی طاقت پارہ پارہ کر دی ہے۔ اس سے ہماری تحریکِ آزادی کو تقویت ملے گی۔ اس صورتِ حال سے ہمیں پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ملک میں روز بروز ان لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی جو جاپان سے ہمدردی رکھتے تھے۔

گاندھی جی جاپان کی فتح کا یقین رکھتے تھے گاندھی جی اب شدت کے ساتھ

محسوس کر رہے تھے کہ اتحادی جنگ نہیں جیت سکیں گے جرمنی اور جاپان کو فتح ہو گی۔ (۲)

گاندھی جی بوس سے مرعوب ہو گئے

میں نے یہ بھی دیکھا کہ ہندوستان سے سوبھاش چندر بوس کا جرمنی پہنچ جانا گاندھی جی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوا تھا اس سے پہلے وہ بوس کی بہت سی سرگرمیوں کی مخالفت کر چکے تھے لیکن اب اُن کا نظریہ بدل گیا تھا۔ وقتاً فوقتاً بوس کے بارہ میں جس طرح کے فقرے وہ استعمال کرتے تھے اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بوس کی ہمت اور جذبۂ عمل سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ خاص طور پر ہندوستان سے ان کا یہ صحیح سلامت نکل جانا ایسا کارنامہ تھا جس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ جب وہ سوبھاش چندر بوس کی تعریف کرتے تھے تو غیر محسوس طور پر ان کے خیالات جنگ کے بارہ میں بھی یہی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ (۳) (ص ۴۰، ۴۱)

---

(۱)

سوبھاش چندر بوس کے متعلق مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بالکل دُرست ہے بوس کلکتہ سے بھیس بدل کر، ایک مسلمان کے روپ میں داڑھی رکھ کر پشاور پہنچے یہاں سے افغانستان وہاں سے نہ جانے کس طرح جرمنی!

پھر جب انہوں نے محسوس کیا کہ جرمنی سے زیادہ وہ جاپان میں رہ کر ملک کی خدمت کر سکتے ہیں، جاپان چلے آتے، یہاں ان ہندوستانیوں کو جو جاپان کے ہاتھوں گرفتار ہوتے تھے، انہوں نے مجتمع کر کے ہندوستان کی قومی فوج بنا لی، اور ایک مرتبہ تو ان کی یہ فوجیں آسام کے حدود تک پہنچ گئیں۔

بوس جب تک ہندوستان میں رہے مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے، ان کی اور کانگرسی لیڈروں کی ذہنیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ صدر انڈین نیشنل کانگریس کی حیثیت سے وہ کئی بار قائد اعظم سے ملے لیکن وہ جرمنی اور جاپان پہنچے تو ان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی اور دل میں وسعت پیدا ہو گئی، انہوں نے محسوس کر لیا کہ جب تک سی، آر، داس کی پالیسی پر عمل نہیں کیا جائے گا، مسلمانوں کو نہیں جیتا جا سکتا، نہ ہندوستان آزاد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نیشنل آرمی میں مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جو آزاد ہند

حکومت بنائی اس میں بھی مسلمانوں کو بڑی گراں بار ذمہ داریاں سونپیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد ہند فوج کے مسلمان سپاہی آج بھی ان کے مداح اور ثنا خواں ہیں۔

(۲)

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ گو گاندھی جی کی قیادت کی بنیاد روحانیت پر تھی، لیکن عام سیاستدان کی طرح وہ پلٹے کھاتے رہتے تھے۔ جنگ میں انگریزوں کا ساتھ نہ دینے کا سبب وہ یہ بیان کرتے تھے کہ "عدم تشدد" کا عقیدہ شرکت جنگ کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اس عقیدہ پر وہ اس درجہ مُصر تھے کہ ہندوستان کی آزادی تک وہ عدم تشدد کو ترجیح دیتے تھے، لیکن اندرونی طور پر معاملہ یہ تھا کہ وہ انگریزوں کا ساتھ اس لیے نہیں دے رہے تھے کہ انہیں یقین کامل تھا کہ انگریز ہاریں گے اور جاپانی جیتیں گے۔ اس یقین کی بنا پر ان کی خیالی اور عملی ہمدردیاں جاپان کے ساتھ تھیں۔

(۳)

گاندھی جی اور بوس کے تعلقات پر ایک نظر ڈالی جائے تو کئی حقائق نظر کے سامنے آتے ہیں اور بر حقیقت اس راز کی پردہ کشا ہے کہ اگرچہ گاندھی جی کی قیادت "روحانیت" "اندرونی آواز" اور "تپسیا (ریاضت)" پر قائم تھی، لیکن پندار کا جہاں تک تعلق تھا ان میں اور ایک سیاستدان میں کوئی فرق نہیں تھا۔

مثال کے طور پر میں چند واقعات ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

(۱)

گاندھی جی نے جواہر لال کے کامیاب اور برابر کے حریف کی حیثیت سے بوس کی پیٹھ تھپکی اور بے تامل انہیں کانگریس کا صدر بنا دیا۔

(۲)

لیکن سال بھر کے تجربہ کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ جواہر لال جس طرح "باپو" کے سامنے جھک جاتے ہیں، بوس نہیں جھکتے، جواہر لال اپنے مسلّمہ اور معروف و مشہور سیاسی عقائد تک میں "باپو" کی خاطر لچک پیدا کر لیتے ہیں لیکن بوس اپنے کسی خیال اور نظریے میں ذرا بھی لچک گاندھی کی خاطر پیدا کرنے کو تیار نہیں — نتیجہ یہ ہوا کہ

گاندھی جی بوس سے رُوٹھ گئے۔

(۳)

۱۹۳۸ء میں جب کانگریس کی صدارت کا مسئلہ درپیش ہوا تو گاندھی جی نے ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیہ کو اس منصب بلند کے لیے نامزد کیا۔

اب تک کا معمول یہ تھا کہ کانگریس کی صدارت اس کے حصہ میں آتی تھی جسے گاندھی جی نامزد کردیں لیکن بوس نے اس رسم کہن کے پرخچے اڑا دیے۔ گاندھی جی کی طرف سے سیتارامیہ کی نامزدگی کے باوجود انہوں نے اعلان کیا کہ میں مقابلہ کروں گا۔ گاندھی جی کانگریس کے مالک نہیں ہیں۔ یہ فیصلہ صوبائی کمیٹیوں کو کرنا چاہیے کہ کون صدر ہو؟

بوس کے اس فیصلہ نے جمہوریت مآب کانگریس کے حلقہ میں تہلکہ مچا دیا۔ انہیں ہموار کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان سے التجا کی گئی کہ اپنا نام واپس لے لیں، لیکن وہ اپنے فیصلہ پر اڑے رہے۔

عام خیال یہ تھا کہ جسے گاندھی جی کی دُعائے خیر و برکت نہ حاصل ہو، وہ کسی حالت میں صدر کانگریس نہیں ہوسکتا، لیکن بوس نے یہ طلسم توڑ کر رکھ دیا، انہوں نے مقابلہ کیا اور سیتارامیہ کو شکست فاش دے کر دوبارہ صدر کانگریس مقرر ہوگئے۔

(۴)

گاندھی جی نے فوراً اعلان کیا کہ،

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ شکست پٹابھی سیتارامیہ کی نہیں میری ہی ہے!"

بوس نے اس اعلان کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔

(۵)

کانگریس سیشن کے موقع پر گاندھی نے شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ان کی عدم شرکت کی وجہ سے کانگریس کا اجلاس پھیکا رہے اور لوگ سمجھ لیں کہ کانگریس گاندھی جی کی دُعائے خیر و برکت سے محروم ہوچکی ہے۔

(۶)

لیکن بوس نے اس کی بھی کوئی پروا نہ کی، تیاریاں ہوتی رہیں، اجلاس شروع ہوگیا۔ گاندھی جی نے جب دیکھا کہ یہ داؤ بھی ناکام ہوا۔ تو وہ اپنے وطن راجکوٹ پہنچے

اور چھوٹے سے راجواڑے کے فرمانروا کی ایک مبینہ وعدہ خلافی پر احتجاج کرتے ہوئے مرن برت کا اعلان کر دیا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ سارے ہندوستان میں ہلچل پڑ جائے اور لوگ بوس اور کانگرس کے اجلاس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لیں۔

لیکن یہ مقصد پورا نہیں ہوا۔ کانگریس کا سیشن نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا، وائسرائے نے مداخلت کرکے اور چیف جسٹس آف انڈیا سر ماریس گائر کو ثالث بنا کر برت تڑوا دیا، لیکن بوس اس واقعہ سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔

(۷)

اصول یہ تھا کہ صدر کانگریس اپنی ورکنگ کمیٹی خود نامزد کرتا تھا۔

بوس کے لیے یہ مسئلہ بڑا نازک بن گیا، اگر ورکنگ کمیٹی نئے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے اور پرانے ممبر نکال دیے جاتے ہیں تو لوگ کہیں گے کہ بوس کو بھی گاندھی جی سے اور کانگریس کے ملنے ہوتے لیڈروں سے کد ہے، اور اگر ورکنگ کمیٹی میں پرانے ممبر لیے جاتے ہیں تو قدم قدم پر گاندھی جی کے اشارہ سے رکاوٹ ڈالیں گے، اور کام نہیں کرنے دیں گے۔

آخر بوس نے یہی فیصلہ کیا کہ پرانے ممبروں کو خارج نہ کیا جائے چنانچہ انہوں نے اپنی نئی ورکنگ کمیٹی میں، جواہر لال، سردار پٹیل، مولانا آزاد، کرپلانی، راجندر پرشاد وغیرہ کو نامزد کیا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا گاندھی جی خالص سیاستدان تھے۔ ان کے اشارہ سے یہ ورکنگ کمیٹی مستعفی ہو گئی۔

اب صورت حالات یہ تھی کہ بوس کانگریس کے صدر تھے لیکن کانگریس کے تمام پرانے اور چوٹی کے لیڈر، ان سے عدم تعاون کر رہے تھے۔ ان حالات میں بوس نے محسوس کیا کہ وہ کام نہیں کر سکتے، چنانچہ انہوں نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ جو فوراً بسر و چشم منظور کر لیا گیا اور ان کے حریف جواہر لال صدر منتخب کر لیے گئے۔

(۸)

لیکن انتقام کا چکر ابھی چل رہا تھا۔ مستعفی ہونے کے باوجود بوس کو معاف نہیں کیا گیا۔

سردار ولبھ بھائی پٹیل کے بڑے بھائی سردار وٹھل بھائی پٹیل، سابق صدر مرکزی اسمبلی بوس سے بہت متاثر تھے۔ ان کا انتقال امریکہ میں ہوا۔ اس وقت بوس بھی وہاں موجود تھے۔ وٹھل بھائی نے اپنی تمام املاک و جائداد ملک کے لیے وقف کر دی اور اس کا ٹرسٹی بوس کو بنا دیا۔

لیکن سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اس وصیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بمبئی ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا اور استدعا کی کہ انہیں ٹرسٹی بنایا جاتے۔ بوس کو ٹرسٹی بننے سے ذاتی فائدہ مقصود نہ تھا۔ یہ جھگڑا دیکھ کر انہوں نے عدالت میں مقدمہ کی پیروی نہیں کی اور ولبھ بھائی پٹیل تنہا ٹرسٹی بن گئے۔

(۹)

پھر جنگ کے بعد جب بوس جاپان پہنچے اور ان کی آزاد ہند فوج نے پر نکالنے شروع کیے۔ اتحادی ہٹنے لگے اور جاپان نے بیک چشم زدن برملا ملایا، سنگاپور، انڈونیشیا کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تو گاندھی جی کو یقین ہو گیا کہ وہ وقت جلد آنے والا ہے۔ جب بوس فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے اپنے وطن میں داخل ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے بوس کی تعریف و تحسین شروع کر دی، اور عدم تشدد کی آڑ لے کر اتحادیوں اور انگریزوں کی اخلاقی مدد تک کرنے سے انکار کر دیا۔

(۱۰)

لیکن جواہر لال گاندھی جی سے زیادہ مضبوط دل کے آدمی تھے۔ انہوں نے گاندھی جی کی طرح ہتھیار نہیں ڈالے۔ بوس کو زک دینے کے لیے علانیہ اتحادیوں کی تائید و حمایت شروع کر دی، جس پر بعض دفعہ صدر کانگریس کی حیثیت سے مولانا آزاد جز بز بھی ہوتے وہ بھی جواہر لال کے ہم خیال تھے، اور بوس کے بارے میں دونوں پورے طور پر متفق تھے لیکن وہ ذرا رکھ رکھاؤ کے ساتھ اتحادیوں کی تائید کرنا چاہتے تھے، جواہر لال جو بقول مولانا ذرا جذباتی قسم کے آدمی ہیں، انہوں نے بغیر کسی جھجک کے اپنے خیالات ظاہر کرنا شروع کر دیے چنانچہ جب چیانگ کائی شیک ہندوستان آئے تو جواہر لال نہ صرف ان سے ملے، بلکہ ان کی اس تجویز کے پورے طور پر ہمنوا ہو گئے کہ اس جنگ میں انگریزوں کا

ساتھ دینا چاہیے!"

ان حقائق کی روشنی میں اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ کے سلسلہ میں گاندھی جی اور جواہرلال کی پالیسی کا اختلاف صداقت پر اور اصول پر اتنا مبنی نہیں تھا جتنا سبھاش چندر بوس کی ذات کے گرد گھوم رہا تھا۔

---

(۲۰)

سر سکندر حیات

سر سکندر سے سر کرپس کی اُمیدیں ایک شام کرپس نے مجھے فون کیا کہ سر سکندر حیات خاں ان سے ملاقات کے لیے کل آرہے ہیں۔ کرپس نے یہ اُمید ظاہر کی کہ سر سکندر حیات خاں فرقہ وارانہ مسئلہ کا تصفیہ کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ پنجاب کا مسلم اکثریت رکھنے والے صوبوں کے لیے یہ ایک قابلِ تقلید اقدام ہوگا۔ میں نے کرپس سے کہا کہ مجھے اس میں شبہ ہے کہ سر سکندر حیات اس فرقہ وارانہ گتھی کو حل کر سکیں گے لیکن بہرحال وہ دہلی آرہے ہیں تو مجھے ان سے مل کر خوشی ہوگی۔

سر سکندر سے میری ملاقات سر سکندر حیات دوسرے دن دہلی آئے کرپس سے ملاقات کے بعد وہ مجھ سے آکر ملے، ان کا خیال تھا کہ تجاویز کرپس فرقہ وارانہ مسئلہ کا بہترین حل ہیں۔ وہ مطمئن تھے کہ اگر یہ مسئلہ ووٹ کے لیے پنجاب اسمبلی کے سامنے رکھا گیا تو اس کا فیصلہ قومی بنیاد پر ہوگا، نہ کہ فرقہ وارانہ لائن پر، میں نے ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اگر پنجاب اسمبلی سے ووٹ اب لیا جائے تو بے شک ان کی پیش گوئی صحیح ثابت ہو سکتی ہے لیکن اختتام جنگ کے بعد کیا ہوگا اس کے بارے میں نہ وہ کچھ کہہ سکتے، نہ میں!

پتے کی بات

میں سکندر حیات سے یہ بھی کہا کہ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ جو اثر و رسوخ انہیں اب حاصل ہے وہ انہیں جنگ کے بعد بھی حاصل رہے گا۔ (۱)

(ص ۵۸، ۵۹)

---

(۱)

سر سکندر حیات پنجاب کے نہایت ذہین، دور اندیش اور مدبر رہنما تھے، ذاتی طور پر نہایت شریف اور صفاتی طور پر قابلِ قدر، انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ماتحت صوبوں کو اندرونی خود مختاری ملی، تو سر سکندر پہلے وزیرِ اعلیٰ منتخب ہوئے، ان کی فراست، ذہانت اور تدبر کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ انہوں نے مختلف الخیال ہندو اور سکھ ممبران تک کا ایک ایسا مجموعہ تیار کر لیا تھا جو ہر وقت اُن کے کام آتا تھا اور اس سے جو کام چاہتے تھے وہ لیتے تھے۔ وہ طبعاً اور مزاجاً اور شاید روایاتِ خاندانی کے اعتبار سے بھی انگریزوں کے نیاز مند خصوصی تھے لیکن مسلم لیگ میں آنے کے بعد اور قائدِ اعظم کے فیضِ صحبت سے ان میں یہ حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر وقت اور مصلحت کا تقاضا ہو تو وہ نہ صرف انگریزوں کا بلکہ سب کا ساتھ چھوڑ کر صرف اپنی قوم اور ملت کے ہو رہیں۔

سر سکندر کو سب سے پہلی مرتبہ میں نے ۱۹۳۸ء میں دیکھا۔ میں پھر کچھ روز کے لیے بمبئی سے دہلی آیا ہوا تھا اور مولانا شوکت علی کے ساتھ مقیم تھا، ایک روز شام کو وہ موٹر میں بیٹھے مجھے ساتھ لیا اور نئی دہلی پہنچے اور ایک مکان میں داخل ہوئے۔

یہ مرکزی اسمبلی کے ایک ممبر میاں غیاث الدین کی قیام گاہ تھی۔ سر سکندر سے ملنے کے لیے چند مخصوص احباب کو انہوں نے مدعو کیا تھا، انہی میں مولانا شوکت علی بھی تھے اور ان کے ساتھ یہ ناخواندہ مہمان بھی حاضرین میں سر ضیاء الدین، بنگال کے خواجہ ناظم الدین احمد اور دوسرے اصحاب موجود تھے۔

سر سکندر بہت پریشان تھے ملک برکت علی مرحوم نے ان کے لیے ایک بڑی مشکل پیدا کر دی۔ انہوں نے ایک بل پیش کرنے کا نوٹس دیا تھا جس کی رُو سے مسجد شہید گنج سکھوں سے چھین کر مسلمانوں کو واپس مل جانی چاہیے تھی۔ سر سکندر اگر یو پی کے پمپورنانند کی طرح متعصب اور ناروادار وزیرِ اعلیٰ ہوتے تو بغیر بل پاس کرائے بھی مسجد

شہید گنج پر اس طرح مسلمانوں کا قبضہ ہو جانے دیتے جس طرح اجودھیا (فیض آباد) کی مسجد بابری پر ہندو بارہ سال سے جبراً قابض ہیں لیکن وہ مسلمان تھے با اصول تھے، مدبر تھے نتائج و عواقب پر نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے گورنر کو یہ مشورہ دیا کہ یہ بل پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائے، گورنر نے یہ مشورہ قبول کر لیا لیکن اس سے مسلمانوں کے جذبات میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس درد کا درمان تلاش کرنے وہ دلی تشریف لائے تھے کہ قائد اعظم کی تائید حاصل کرنے کے لیے ان کے چند مخصوص دوستوں سے ملنا ضروری تھا۔ یہ اجتماع اسی سلسلہ میں تھا، سر سکندر جب چاپ اور کھوئے سے بیٹھے تھے لیکن بہت جلد مولانا شوکت علی کے طنز و مزاح نے وہ فضا پیدا کر دی کہ سر سکندر بھی کھل گئے۔

مولانا شوکت علی میں ایک خاص وصف یہ تھا کہ علی گڑھ کے رشتے سے وہ ہر علیگ کے مستقل "بڑے بھیا" بن جاتے تھے۔ ان کی محبت اور خلوص کے پھندے سے کسی غیر علیگ کا نکلنا بھی آسان نہ تھا، علیگ بیچارہ تو روایات کہن کی پابندیوں میں اپنے آپ کو ایسا جکڑا ہوا پاتا تھا کہ سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی باقی نہ رہ جاتا تھا، چنانچہ سر سکندر حیات خاں بھی بڑے بھیا کے کشتگان وفا میں تھے۔ شوکت صاحب کو جب کوئی مالی دشواری (ذاتی سلسلہ میں نہیں قومی سلسلہ میں) پیش آتی وہ بے تکلف اپنے علیگ بھائیوں کو خط لکھتے کہ مقصد سے اتفاق ہو یا اختلاف، لیکن اگر مجھ پر بھروسہ کرتے ہو تو جو کچھ تھوڑا بہت بھیج سکتے ہو بھیج دو۔ ایک سے زائد بار میں نے سر سکندر کے چیک مولانا کی میز پر دیکھے۔

سر سکندر کو پنجاب میں وہ قوت حاصل تھی کہ وہ خضر حیات خاں کی طرح منتوب ملت ہوئے بغیر مسلم لیگ کو نظر انداز کر سکتے تھے، لیکن یہاں کا حد سے بڑھا ہوا جذبۂ ملی تھا کہ انہوں نے از خود مسلم لیگ سے وابستگی اختیار کی، ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا سیشن لکھنؤ میں منعقد ہوا، اس میں شرکت کی اور اپنے رفقا کے ساتھ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس کا بڑا اچھا اور خوشگوار اثر مسلم اکثریت کے دوسرے صوبوں پر پڑا۔

سر سکندر حیات کے کردار کا ایک شاندار پہلو یہ ہے کہ لارڈ لن لتھ گو وائسرائے تھے • کانگریس اور مسلم لیگ کے تعاون سے مایوس ہو کر وار کونسل قائم کی جس میں مسلمانوں، ہندوؤں اور دوسرے فرقہ کے لوگوں کو شریک کیا۔ مسلم لیگ نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ اب لارڈ لن لتھ گو نے ایک دوسرا کھیل کھیلا۔ پنجاب کے سر سکندر حیات خاں بنگال کے مسٹر

فضل الحق اور آسام کے سر سعد اللہ کو جو اپنے اپنے صوبوں کے وزیر اعظم تھے۔ مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک کیا لیکن ان سے یہ کہا کہ وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے وہ شریک کیے جا رہے تھے۔

قائد اعظم نے فوراً ایک اعلان شائع کیا کہ اگر کوئی مسلم لیگی شریک ہوا تو اس کے خلاف "تادیبی کارروائی" کی جائے گی۔ سکندر حیات، فضل الحق، سعد اللہ شریک ہو چکے تھے۔ اُن کے خلاف لیگ نے "تادیبی کارروائی" کرنے کے لیے بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ طلب کیا۔

جلسہ میں سر سکندر اور سر سعد اللہ بھی شریک ہوتے، فضل الحق اڑے ہوتے تھے کہ مسٹر جناح میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے میں شریک رہوں گا۔ سکندر حیات اور سعد اللہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ وائسرائے نے ہمیں مسلم قوم کے نمائندہ کی حیثیت سے نہیں، صوبائی وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے شریک کیا ہے لہٰذا شرکت پر ہم مجبور ہیں اگر مسلم نمائندہ کی حیثیت سے شریک کیا ہوتا تو ہم قطعاً استعفا دے دیتے۔ قائد اعظم نے سر راجہ خان گورنر بمبئی کا مکتوب دکھایا جس میں مسلم نمائندگی کا ذکر تھا یہ خط دیکھتے ہی سر سکندر اور سر سعد اللہ نے فوراً وائسرائے کی وار کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ فضل الحق نے نہیں دیا۔ وہ مسلم لیگ سے خارج کر دیے گئے یہ اُن کا بڑا یادگار اور غیر فانی کارنامہ ہے۔ توقع مسٹر فضل الحق سے تھی۔ لیکن کام سر سکندر حیات نے کر دکھایا۔

سکندر حیات خاں جس بنیاد پر کر پس تجاویز کی تائید کر رہے تھے۔ ان سے مسلمانوں کو فائدہ ہی تھا، نقصان نہ تھا وہ یہ بھی جانتے تھے۔ کانگریس ان تجاویز کو منظور نہیں کر سکتی کیونکہ یہ تجاویز بھی پاکستان ہی کی مترادف تھیں۔ جب ہر صوبہ کو آزادی کا حق دیا جاتا تو باکستان میں کسر کیا رہ گئی ؟۔

خان عبدالغفار خان

ضرورت سے زیادہ بھروسہ صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت ہے ۳۷ء، ۴۶ء میں وہاں کی وزارت کانگرس کے ہاتھ میں رہی، خان عبدالغفار خاں اور ان کے خدائی خدمتگار اس خوشگوار صورت حالات کے ذمہ دار تھے۔ صوبہ سرحد کے معاملات سے متعلق ہر بات میں ہم خان عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب پر بھروسہ کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ (۱)

سرحد میں مسلم لیگ کا زور مرکز میں جب عارضی حکومت قائم ہوئی تو احکامات جاری کر دیئے گئے کہ جنوبی وزیرستان کے قبائل پر فضائی بمباری کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ اس اثنا میں جواہر لال کو سرکاری طور پر رپورٹیں ملیں کہ سرحد کی آبادی کا بڑا حصہ کانگرس اور خان بھائیوں کے خلاف ہے مقامی حکام نے بار بار یہ اطلاع بھیجی کہ سرحد میں کانگرس عوام کی حمایت کھو بیٹھی ہے اور اب عوام کی وفاداری کانگرس کی بجائے مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔ جواہر لال کا خیال تھا، یہ رپورٹیں غلط ہیں اور انگریز افسروں کی گھڑی ہوئی ہیں جو ہمیشہ سے کانگرس کے خلاف رہے ہیں۔ لارڈ ویول کو جواہر لال کی رائے سے اتفاق نہ تھا۔ اگرچہ وہ بھی ان رپورٹوں کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ سرحد خان برادران اور مسلم لیگ کے مابین برابر بٹا ہوا ہے لیکن کانگرسی حلقوں کا تاثر یہ تھا کہ صوبے کی کثیر

آبادی خان بھائیوں کے ساتھ ہے۔ جواہر لال نے فیصلہ کیا کہ وہ سرحد کا دورہ کر کے خود رائے قائم کریں گے۔ (۲)

(ص ۱۶۹)

عبدالغفار خاں کی فریب کاری

خاں بھائیوں کا یہ دعویٰ غلط نہ تھا کہ باشندگانِ سرحد کا ایک بڑا طبقہ ان کا حامی ہے لیکن انسان اپنی قوت کے بارے میں ہمیشہ کچھ زیادہ ہی گمان رکھتا ہے۔ خاں بھائی ہم پر یہ اثر ڈالنا چاہتے تھے کہ دوسرے صوبوں کے مسلمان تو کانگرس کے مخالف ہیں لیکن صوبہ سرحد مکمل طور پر کانگرس کے ساتھ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک مضبوط اور طاقتور جماعت خان بھائیوں کے خلاف تھی۔ (۳) (ص ۱۷۰)

مسلم لیگ کے رحم وکرم پر

(۳ جون ۱۹۴۷ء اپنے سابقہ اعلانات کے برعکس ماؤنٹ بیٹن کی ترغیب سے متاثر ہو کر پٹیل، جواہر لال اور گاندھی جی تقسیم ہند کا اصول قربان کر چکے ہیں)

---

۱۳ جون کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور نئی صورت حالات پر غور کیا گیا، سب سے پہلے جو چیز زیر بحث آئی وہ صوبہ سرحد کے مستقبل کا مسئلہ تھا۔ ماؤنٹ بیٹن پلان نے اس صوبہ کو عجیب خلفشار میں مبتلا کر دیا تھا۔ خاں عبدالغفار خاں اور ان کے رفقاء ہمیشہ کانگرس کی حمایت اور مسلم لیگ کی مخالفت کرتے رہے تھے۔ لیگ انہیں اپنا پکا دشمن سمجھتی تھی۔ لیگ کی مخالفت کے باوجود خاں بھائیوں نے سرحد میں کانگریس وزارت قائم کر رکھی تھی۔ اور یہ کانگریسی حکومت اب تک وہاں برسر اقتدار تھی۔ تقسیم ہند سے خاں بھائیوں اور کانگریس پارٹی کو عجیب ناگوار حالت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اسکیم نے خان بھائیوں اور ان کی جماعت خدائی خدمتگار کو مسلم لیگ کے رحم وکرم پر ڈال دیا تھا۔ (۴)

کانگرس نے ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا

گاندھی جی نے ورکنگ کمیٹی میں تقسیم ہند کی حمایت کی، میں تو ان کے طرزِ عمل کو سمجھ ہی رہا تھا لہٰذا مجھے کچھ زیادہ تعجب ان کی تقریر سے نہیں ہوا، لیکن خان عبدالغفار خان

کے حالِ زار کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ وہ سُن کر رہ گئے کئی منٹ تک گم سُم بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے ورکنگ کمیٹی سے اپیل کی اور اسے یاد دلایا کہ وہ ہمیشہ کانگرس کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ اگر کانگرس نے انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا تو سرحد میں اس کا ردِ عمل نہایت خطرناک ہو گا۔ ان کے دشمن ان پر قہقہے لگائیں گے اور ان کے دوست کہیں گے کہ جب تک کانگرس کو سرحد کی ضرورت تھی وہ خدائی خدمتگاروں کی پشت پناہی کرتی رہی۔ جب کانگرس نے مسلم لیگ سے مصالحت کرنی چاہی تو سرحد کے رہنماؤں سے مشورہ لیے بغیر اس نے تقسیمِ ہند کی اسکیم منظور کر لی۔ خاں عبدالغفار خاں نے بارہا کہا کہ صوبہ سرحد کانگرس کے اس رویّے کو بے وفائی اور غداری پر محمول کرے گا۔ اگر اس نے خدائی خدمتگاروں کو بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا۔ (۵)

ماؤنٹ بیٹن سے سفارش

گاندھی جی عبدالغفار خاں کی اس اپیل سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سوال وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے اٹھائیں گے۔ انہوں نے ایسا کیا بھی، جب وہ وائسرائے سے ملے تو ان سے کہا کہ وہ تقسیم ہند کی تائید نہیں کریں گے۔ جب تک یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ خدائی خدمتگاروں کے ساتھ مسلم لیگ کا رویّہ شریفانہ رہے گا، بھلا وہ ان لوگوں کو بے یار و مددگار کیسے چھوڑ سکتے ہیں جنہوں نے مشکلات و مصائب کے دور میں ہمیشہ کانگرس کا ساتھ دیا ہے؟ (۶)

عبدالغفار خاں کی مسٹر جناح سے ملاقات

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا کہ اس معاملہ پر وہ مسٹر جناح سے گفتگو کریں گے، اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسٹر جناح خاں عبدالغفار خاں سے ملنے پر آمادہ ہو گئے، دونوں ملے، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا، اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہ تھی ایک مرتبہ جب کانگرس نے تقسیم کی اسکیم منظور کر لی، پھر خان عبدالغفار خاں اور ان کے رفقاء کے مستقبل کا سوال زیرِ بحث لانا بے کار تھا۔ ماؤنٹ بیٹن پلان کی بنیاد اس اصول پر تھی کہ مسلم اکثریت کے صوبے الگ کر دیے جائیں اور وہ اپنی ایک الگ حکومت بنائیں۔ سرحد میں مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت تھی، لہٰذا لازمی طور پر اسے پاکستان میں آنا تھا۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی یہ صوبہ پاکستانی رقبہ کے اندر تھا۔

ہندوستان سے وہ کسی طرح بھی رابطہ قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔

(ص ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴)

آزاد سرحد کا نعرہ

خان برادران نے جب یہ دیکھا کہ کانگرس تقسیم ہند کو تسلیم کر چکی ہے تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کریں۔ استصواب عام قبول کرنے سے یہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ انکار کا مطلب یہ ہوتا کہ اعتراف کر لیتے کہ سرحد کے عوام ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ یہ پشاور واپس آگئے اور احباب سے مشورہ کے بعد صوبہ سرحد کی آزادی کا نعرہ لگانے لگے۔ (۷)

کانگرس نے پٹھان اسٹیٹ کی تائید کی

کانگرس ورکنگ کمیٹی نے سرحد کانگرس کے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا اور خان عبدالغفار خاں کو اختیار دے دیا کہ جو مناسب قدم چاہیں اس سلسلے میں اٹھائیں۔ سرحد کانگرس کا مطالبہ اب یہ تھا کہ ایک آزاد پٹھان اسٹیٹ قائم کی جائے جس کا دستور اسلامی جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف پر مبنی ہو۔ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے خان عبدالغفار خاں نے کہا کہ سرحد کے پٹھان اپنی جداگانہ اور ممتاز ثقافت نیز تاریخ کے حامل ہیں، اور ان اقدام کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ مکمل طور پر آزاد ہو کر اپنے ان اداروں کو فروغ نہ دے سکیں، انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ استصواب عام اس پر نہیں ہونا چاہیے کہ سرحد پاکستان سے وابستہ رہے گا یا ہندوستان سے؟ ایک تیسری متبادل چیز یہ بھی ہونی چاہیے کہ دونوں سے الگ رہ کر اگر وہ آزاد ہونا چاہیے تو پختونستان قائم کرے۔ صرف اسی طرح استصواب باشندگان سرحد کے صحیح نمائندہ عزم کا منقسم ہو سکتا ہے اور اگر یہ بات منظور نہیں کی جا سکتی تو استصواب عام بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ کیونکہ پھر پختون پاکستان کے دوسرے عناصر میں جذب ہو کر رہ جائیں گے۔ (۸)

اے کاش

واقعی اگر استصواب عام میں آزاد پختونستان کا سوال بھی شامل کر لیا جاتا تو باشندگان سرحد کی بہت بڑی تعداد اس کی تائید کرتی کیونکہ انہیں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ پنجاب انہیں نگل نہ لے، صرف یہی اندیشہ انہیں پاکستان کے خلاف ووٹ دینے پر آمادہ کر دیتا۔ (۹) (ص ۱۹۴، ۱۹۵)

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی وضاحت

مسٹر جناح اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن میں سے کوئی بھی پختونستان کا مطالبہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ صوبہ سرحد ایک جداگانہ اور آزاد ریاست نہیں بن سکتا البتہ پاکستان یا ہندوستان میں جس کے ساتھ چاہے وابستہ رہ سکتا ہے۔ خان بھائیوں نے اعلان کر دیا کہ ان کی پارٹی استصواب عام میں کوئی حصہ نہیں لے گی۔ انہوں نے پٹھانوں سے اپیل کی کہ وہ استصواب کا بائیکاٹ کریں لیکن مخالفت کارگر ثابت ہوئی۔ استصواب عام ہوا اور باشندگان سرحد کی بھاری تعداد نے پاکستان کی حمایت میں ووٹ دیا۔ اگر خان برادران نے استصواب کا بائیکاٹ نہ کیا ہوتا اور ان کے حامیوں نے پوری پوری جدوجہد کی ہوتی تو آسانی سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ پٹھان کس تناسب سے پاکستان کے خلاف ہیں بہرحال استصواب کا نتیجہ مسلم لیگ کے حق میں رہا اور برطانوی حکومت نے اسے تسلیم بھی کر لیا۔ (۱۰)

تقسیم کے بعد خان برادران نے پلٹا کھایا

تقسیم ہند جب باقاعدہ طور پر عمل میں آگئی تو خان برادران نے حالات کے مطابق اپنا رویہ بدل دیا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ آزاد پختونستان کا مطالبہ ایک جداگانہ حکومت کی تشکیل کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ پاکستان کے ایک وحدہ کی حیثیت سے ایک خود مختار صوبہ کی تشکیل ہے، انہوں نے کہا کہ ان کا مقصد دستور پاکستان کو اس طرح مرتب کرانا ہے کہ وہ صحیح معنی میں وفاقی بن جائے اور اپنے ہر واحدہ کو مکمل اندرونی آزادی کی ضمانت دے تاکہ پٹھان سماجی اور تہذیبی زندگی سے پورے طور پر بہرہ ور ہو سکیں، جب تک اس طرح کے دستوری تحفظات نہ ہوں گے۔ پنجاب سارے پاکستان پر چھا جائے گا۔ (۱۱)

خان برادران کا مطالبہ معقول تھا

یہ ماننا پڑے گا کہ خان برادران کا یہ مطالبہ معقول تھا، خود مسلم لیگ کی تجویز لاہور بھی اس سے ہم آہنگ تھی اور اس تجویز میں مسلم لیگ نے کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ مسٹر جناح کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ خان برادران پر پاکستان سے منقطع ہونے کا الزام لگاتے۔ واقعہ یہ ہے کہ خان عبدالغفار خان نے کراچی میں کئی مرتبہ ان سے ملاقات کی۔

۔۔۔ مرحلہ پر تو ایسا نظر آ رہا تھا کہ گویا مفاہمت ہو جائے گی۔ پاکستان کے بعض سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ مسٹر جناح خان عبدالغفار کے اخلاص سے کافی متاثر ہوئے اور انہوں نے پشاور جا کر ان سے اور ان کے رفقاء سے تبادلۂ خیالات کا پروگرام بنا لیا۔ لیکن یہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آ سکا، بہت جلد خان بھائیوں کے سیاسی دشمنوں نے مسٹر جناح کا دماغ ان لوگوں کے خلاف مسموم کر دیا۔ خان عبدالقیوم خان جو سرحد میں اپنی وزارت بنا چکے تھے قدرتاً اس کے مخالف تھے کہ خان برادران اور مسٹر جناح میں معاملات رو براہ ہو جائیں انہوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ مفاہمت ناممکن ہو گئی۔

خان عبدالقیوم خان کی استبداد پسندی

واقعہ یہ ہے کہ خان عبدالقیوم خان کی حکومت نے معقولیت اور انصاف سے قطع نظر کر کے خدائی خدمتگاروں کو تمام غیر قانونی اور نامعقول ذرائع اختیار کر کے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ جمہوریت سرنگوں ہو گئی اور قوت، وقت کا سب سے بڑا فرمان بن گئی۔ خان عبدالغفار خان، ڈاکٹر خان صاحب اور خدائی خدمتگار، نیز جماعت کے دوسرے رہنما جیل بھیج دیے گئے جہاں تقریباً چھ سال تک بغیر کسی الزام یا عدالتی کارروائی کے محبوس رہے۔

عبدالقیوم خان سے عوامی برہمی

خان عبدالقیوم خان کا رویہ اتنا تلخ تھا کہ خود مسلم لیگ کا ایک گروہ اس کی علانیہ مخالفت کرنے لگا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ یا خان برادران پر مقدمہ چلایا جائے ورنہ انہیں رہا کر دیا جائے۔ اس طرح کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور قانون کے نام پر غیر قانونی استبداد کی کارفرمائی جاری رہی۔ (١٢) (ص ١٩٥، ١٩٦)

خان عبدالغفار خان کے بارے میں بھی مولانا کے پیش کردہ معلومات بڑے نادر اور قیمتی ہیں۔

(١)

درحقیقت اسی غلط مفروضہ نے حالات کو اتنا نازک اور پیچیدہ کر دیا، ایک طرف خان بھائی ہوا کے گھوڑے پر اڑنے لگے اور عوامی رابطہ کھو بیٹھے، دوسری جانب کانگرس نے صرف انہیں خوش رکھ کر یہ سمجھ لیا کہ پٹھان اس کی مٹھی میں ہیں، حقیقت کا مقابلہ کرنے کی نہ خان برادران

میں ہمت تھی، نہ کانگریس میں،

(۲)

لیکن مولانا شاید یہ بھول گئے کہ کانگریس کی عارضی حکومت نے جنوبی وزیرستان کے قبائل پر بمباری بند کرنے کا حکم کب دیا تھا؟ بمباری کے بعد!
واقعہ یہ ہے کہ جنوبی وزیرستان کے قبائل پر فضائی بمباری ہوئی اور اتنی ہوئی کہ خان عبدالغفار خاں جیسے وفادار ازلی کو پبلک طور پر اس کے خلاف احتجاج کرنا پڑا۔ اس کے بعد بمباری کا سلسلہ بند کرنے کا حکم جاری کیا گیا۔
مولانا اپنی منطق سے ہر جگہ کام لینے کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ مشکل سے کوئی ایسا واقعہ بیان فرماتے ہیں جو "مغالطہ" کا شکار نہ ہو، جو شخص واقعات و حقائق سے ناواقف ہو یا مولانا کے حسنِ ظن کے مطابق جس کا حافظہ کمزور ہو وہ بڑی آسانی سے اس مغالطہ کا شکار ہو سکتا ہے۔

(۳)

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خان عبدالغفار خاں اور ان کے برادر بزرگ ڈاکٹر خان صاحب کی زندگی کا مقصد بس یہ رہ گیا تھا کہ کانگریس کو اپنی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ یقین دلائیں اور ملت کے احتجاج عام کی ذرا بھی پرواہ نہ کریں۔ گویا ان کا عمل

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کند با خلق عالم کار نیست

(۴)

بات تو یہی ہے!

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا!

(۵)

مولانا نے خان عبدالغفار خاں کے حالِ زار کا جو المناک نقشہ کھینچا ہے وہ حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہے،
خان عبدالغفار خاں کانگریس کی پشت پناہی کی بنا پر اپنی قوم اور اپنی ملت کو یکسر فراموش کیے ہوئے تھے، انہوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ بساط پلٹ سکتی ہے،

نقشہ بدل سکتا ہے، حالات پلٹا کھا سکتے ہیں۔ اب پہلی مرتبہ وہ کانگرس کی پشت پناہی سے محروم ہوئے تھے۔ اب پہلی مرتبہ انہیں اپنی قوم اور ملت کے سامنے حاضر ہونا پڑ رہا تھا جسے اب تک وہ ٹھکراتے رہے جسے وہ بالکل ہیچ سمجھا کرتے تھے۔

ہاں آج کانگرس انہیں بے یار و مددگار چھوڑ رہی تھی جو دوستی، خلوص و صداقت کے بجائے اغراض و مقاصد کی تابع ہوتی ہے، اس کا حشر یہی ہوتا ہے۔

خان عبدالغفار خاں کو اس کا ڈر تھا کہ "وہ ہمیشہ کانگرس کی حمایت کرتے رہے اور کانگرس نے انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا!" لیکن انہوں نے یہ کیوں فراموش کر دیا کہ ان کے خدمات لاکھ وقیع ہوں، لیکن اتنے تو نہ تھے جتنے نظام حیدرآباد اور دوسرے والیان ریاست کے۔ خان عبدالغفار خاں کے خدمات کی مدت تو صرف چند سال تھی۔ نظام اور دوسرے والیان ریاست تو پشت ہا پشت سے سرکار ابد قرار کے یار وفادار چلے آ رہے تھے۔ خان عبدالغفار خاں نے تو صرف "وفاداری" کی پونجی کانگرس کے قدموں پر نثار کی تھی اور روپیہ دیا نہیں لیا تھا۔ لیکن نظام اور دوسرے والیان ریاست نے وفاداری کے ساتھ ساتھ خزانۂ عامرہ کی تھیلیاں بھی ہر نازک موقع پر پیش کی تھیں، سپاہی بھی دیے تھے، ساز و سامان جنگ بھی پیش کیا تھا۔ آقایان فرنگ کی چشم و ابرو کا اشارہ پا کر اپنی رعایا کی گردنیں بھی کاٹی تھیں، پھر جب آج مطلب نکل جانے کے بعد انگریز گائیکوار بڑودہ، مہاراجہ سندھیا (گوالیار) کو ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کو اعلیٰ حضرت، سکندر صولت، دارا حشمت، فریدون مرتبت، کیوان منزلت، ارسطو فطرت، لقمان حکمت، قدر قدرت، بندگان عالی متعالی، ہز اگزالٹڈ ہائی نس حضور نظام کو اور دوسرے تمام چھوٹے بڑے فرمان روایان ریاست کو بے یار و مددگار چھوڑ رہے تھے، تو اگر کانگرس بھی خان عبدالغفار اور ڈاکٹر خاں کو مطلب نکل جانے کے بعد بے حقیقت سمجھ کر بے یار و مددگار چھوڑ رہی تھی تو حیرت کیوں؟ اور افسوس کس لیے؟ ذرا آگے پیچھے، دائیں بائیں نظر اٹھا کر خان عبدالغفار نے دیکھا ہوتا تو وہ ضرور محسوس کرتے اور کہہ اٹھتے:

بلبل خراب، شمع تباہ، سینہ چاک، گل
لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں!

انگریزوں کو اب والیانِ ریاست کی ضرورت نہ تھی۔ کانگرس کو اب خان برادران کی ضرورت نہ تھی۔ دونوں نے ایک جھٹکے میں اپنے وابستگانِ دامن سے پیچھا چھڑا لیا۔

(۶)

ستم ظریفی کی انتہا تھی، گاندھی جی کی یہ سفارش بھی:
کیا گاندھی جی یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ خان برادران کو پھانسی دے دی جائے گی؟ آخر اس سفارش کی ضرورت کیا تھی؟ اور اس میں وزن کیا تھا؟ اور تقسیم کے بعد ان کی سفارش نظرانداز کیا ہو سکتی تھی؟ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلم لیگیوں کو کانگرس کے دستِ جفا سے نہ بچا سکی؟ کانگرس کو مسلم لیگ سے اس طرح کی سفارش کا کوئی حق نہ تھا۔

یہ دوسری بات ہے کہ خلیق الزماں نے جب "انڈین نیشنل" کی حیثیت سے ہندوستانی جھنڈے کو سلامی دی تو فوراً سردار پٹیل نے انہیں ٹوکا۔

"میں ایک لمحہ کے لیے بھی اسے باور نہیں کر سکتا کہ ۲۴ گھنٹے میں اس طرح وفادار تبدیل ہو سکتی ہے!" لیکن پاکستان میں آج تک کسی کانگرسی کو، کانگرسی ہونے کے جرم میں ہدفِ ستم نہیں بنایا گیا اور ڈاکٹر خان صاحب کا ستارہ ایسا اوج پر آیا کہ کانگرس بھی انہیں وہ کچھ نہیں دے سکتی تھی جو انہوں نے پاکستان میں پا لیا۔

(۷)

آزاد سرحد کا جو پس منظر مولانا نے بیان فرمایا ہے وہ واقعی قابلِ غور ہے۔

(۸) واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے جو معلومات پیش کیے ہیں وہ بہت زیادہ نادر اور قیمتی ہیں۔
ذرا ملاحظہ فرمائیے، "عالمِ مایوسی میں خان عبدالغفار خاں "آزاد سرحد" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ کانگرس سمجھاتے اس کے انہیں سمجھاتے کہ یہ خودکشی ہے، سمجھوتہ کے خلاف ہے اور اسے حق نہیں کہ وہ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دے، ہاں عبدالغفار خاں اپنی ذمہ داری پر جو چاہیں کریں لیکن کانگرس کو اس سے سروکار نہ ہوگا، وہ کرتی یہ ہے کہ اس کی ورکنگ کمیٹی "سرحد کانگرس" کے اس فیصلہ کو تسلیم کر لیتی ہے اور خان عبدالغفار خاں کو اختیار دے دیتی ہے کہ اس سلسلہ میں جو قدم چاہیں اٹھائیں۔
کیا اس سے بڑھ کر بھی فتنہ انگیزی کوئی ہو سکتی تھی:

(۹) یہی بات خان عبدالغفار خاں اب بھی فرماتے رہتے ہیں،

(۱۰) لارڈ ماونٹ بیٹن نے جس اصول کے ماتحت سرحد کو یہ حق دیا تھا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان میں سے جس کے ساتھ چاہے الحاق کرے، اسی اصول پر حیدرآباد، مناودر، جوناگڑھ وغیرہ کے سلسلہ میں کیوں عمل نہیں کیا گیا۔

(۱۱) مولانا نے آج بارہ سال بعد خان برادران کے پلٹا کھانے کی جو داستان بیان فرمائی ہے اہل نظر پہلے دن سے اس کے رمز آشنا ہیں۔

(۱۲) اس سلسلہ میں واقعی پاکستان کے بہت سے لوگ جن میں راقم الحروف بھی تھا خان عبدالقیوم کی استبداد پسندی سے گھبرا اٹھے تھے، لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا اور پھر مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے ایک فیصلہ سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی کہ خان عبدالقیوم خاں کا موقف بالکل صحیح اور درست تھا۔

شیخ عبداللہ

نیشنل کانفرنس شیخ عبداللہ کی زیرِ قیادت باشندگانِ کشمیر کے سیاسی حقوق کے لیے مصروفِ جہد و پیکار تھی، جب کابینہ وفد نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو شیخ عبداللہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اور زیادہ شدت کے ساتھ اپنا مطالبہ پیش کرنا شروع کیا، جس طرح گاندھی جی نے "ہندوستان خالی کردو" کا نعرہ لگایا تھا اسی طرح شیخ عبداللہ نے "کشمیر خالی کردو" کا نعرہ لگایا، اور کشمیر کا مسئلہ کابینہ وفد کے سامنے پیش کیا، شیخ صاحب کا مطالبہ یہ تھا کہ مہاراجہ باشندگانِ کشمیر کو حکومت خود اختیاری عطا کریں، مہاراجہ کی گورنمنٹ نے اس مطالبہ کا جواب یہ دیا کہ شیخ عبداللہ اور ان کے رفقا کو گرفتار کر لیا۔ کچھ ہی عرصہ پہلے نیشنل کانفرنس کا ایک نمائندہ کشمیر کا وزیر بنا لیا گیا تھا اس سے امید ہو چلی تھی کہ شیخ عبداللہ اور مہاراجہ میں مفاہمت ہو جائے گی لیکن شیخ عبداللہ اور ان کے رفقا کی گرفتاری نے یہ امید ختم کردی۔ (۱)

(ص ۱۴۸)

---

(۱) شیخ عبداللہ کا واقعہ تاریخ ہند کا سب سے بڑا المیہ ہے، یہ جواہر لال کے دامن پر ایسا داغ ہے جو کبھی نہیں مٹ سکے گا، اس واقعہ نے جواہر لال کی شخصیت کو مجروح کر دیا

ان کی سیاست کو بے نقاب کر دیا، دُنیا کی رائے عامہ کی نظر میں وہ رُسوا ہوئے، بین الاقوامی سیاست میں انہوں نے جو وقار حاصل کر لیا تھا اسے خود اپنے ہاتھوں کھو دیا/ ۔

شیخ عبداللہ کی ساری زندگی آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد میں گزری، وہ جواہر لال نہرو کے ذاتی دوست تھے اور اتنے گہرے کہ اس دوستی پر انہوں نے اپنی ہر چیز قربان کر دی، صرف جواہر لال کی دوستی کے لیے انہوں نے پاکستان کو چھوڑا، ملتِ پاکستان سے رشتہ توڑا، اہلِ کشمیر کی نظر میں مشکوک ہوئے ۔

ہندوستان سے الحاق انہوں نے اس شرط پر کیا تھا کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ استصوابِ رائے عامہ سے ہو گا، اس دستاویز پر جواہر لال نے دستخط کیے تھے، گاندھی جی نے تائید کی تھی، لارڈ ماؤنٹ بیٹن گواہ بنے تھے ۔

شیخ عبداللہ کا شروع شروع میں یقیناً یہ ارادہ تھا کہ کشمیر کا ہندوستان سے الحاق کریں گے، اس لیے کہ انہیں جواہر لال سے اور ہندوستان سے بڑی اُمیدیں تھیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ کشمیر اپنی انفرادیت سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ ہندوستان کا سامراجی شکنجہ اسے اپنی گرفت میں لیتا جا رہا ہے تو وہ چونکے، بےشک انہیں جواہر لال سے بھی زیادہ عزیز تھی، انہوں نے اس کاغذی عہد نامہ کی تکمیل پر اصرار شروع کر دیا جو جواہر لال نے استصوابِ رائے عامہ کے سلسلہ میں کیا تھا، اب انہیں وضع کا نباہ اس درجہ عزیز تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ کشمیر کا الحاق پاکستان سے ہو، صرف یہ چاہتے تھے کہ جغرافیائی اہمیت کے لحاظ سے اس کی انفرادیت تسلیم کر لی جائے، حقِ خود ارادیت دیا جائے، اور پاکستان و ہندوستان دونوں اس کی آزادی تسلیم کر لیں،

جواہر لال یہ بھی نہ گوارا کر سکے، انہوں نے بے تامل شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا، اور ذرا نہ شرمائے، نہ اپنے ضمیر سے، نہ دُنیا کی رائے عامہ سے، تقریباً چھ سال تک مقدمہ چلائے بغیر انہیں نظر بند رکھا اور اب "بغاوت"، "سازش" اور "غداری" کے الزام میں ان پر مقدمہ چل رہا ہے، سرکار کی طرف سے ایک سے ایک بڑھ کر وکیل موجود ہے ناکردہ گناہ ملزم کی وکالت کے لیے کوئی سر برآوردہ وکیل سارے ہندوستان میں نہیں ملتا۔ شیخ عبداللہ بیچارے

جواہرلال سے شکوۂ دوستانہ بلکہ اس عنایتِ بے پایاں کا نہیں کر سکتے، کیونکہ

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

---

(۲۳)

کرن شنکر رائے

ناکردہ گناہوں سے انتقام

(۵ جون ۴۷ء تقسیم ہند کی تائید میں ورکنگ کمیٹی نے جو تجویز منظور کی تھی، آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سامنے بغرض توثیق پیش ہے۔ سندھ کے ہندو ممبر مسلم اکثریت سے ہراساں نظر آتے ہیں ان کی تسکین و دلدہی کے لیے نجی مجلسوں میں سردار پٹیل، اچاریہ کرپلانی وغیرہ متعدد کانگرسی لیڈر انہیں یقین دلاتے ہیں کہ اگر تم پر ذرا بھی زیادتی ہوئی تو ہم ہندوستان کے مسلمانوں سے اس کا پورا پورا انتقام لیں گے)

کانگرس کے بعض ممبروں نے محسوس کیا کہ یہ خیالات کتنے خطرناک ہیں، مجھے خاص طور پر یاد ہے کہ بنگال کے ایک سربرآوردہ کانگرسی لیڈر کرن شنکر رائے پہلے شخص تھے جو یہ واقعات میرے علم میں لائے، کانگرس کی مسندِ صدارت پر اب مسٹر کرپلانی فائز تھے، کرن شنکر رائے نے ان سے کہا کہ یہ بڑا خطرناک نظریہ ہے۔ اگر اس طرح کے احساسات کو پروان چڑھنے دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستان میں ہندو ہلاک اور برباد ہوں گے اور ہندوستان میں مسلمان موت کے گھاٹ اتریں گے اور تباہ ہوں گے۔

انتقام دغمال کا فتنہ

کسی شخص نے بھی کرن شنکر رائے کے معروضات اور انتباہ پر توجہ نہیں کی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ بیچارے نشانۂ

تضحیک و استہزا بنا لیے گئے۔ ان کی التجاؤں کے جواب میں کانگرسی لیڈروں نے کہا کہ جب ہندوستان تقسیم ہی ہو گیا تو ہمیں یرغمال کا نظریہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے۔ انہوں نے بحث کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ پاکستان کے ہندو صرف اسی طرح محفوظ رہ سکتے ہیں (۱)

بدترین خدشات پورے ہوئے

ان باتوں سے کرن شنکر رائے کی تشفی نہیں ہوتی وہ تقریباً روتے ہوئے میرے پاس آتے۔ انہوں نے ان یقین دہانیوں کو تسلیم نہیں کیا جو بعض کانگرسی لیڈروں کی طرف سے عمل میں آئی تھیں۔ کرن شنکر رائے کو زندہ رہ کر بالآخر اپنے بدترین خدشات کو پورا ہوتے دیکھنا پڑا۔ (ص ۱۹۸، ۱۹۹)

---

(۱)
نہ جانے کس دل سے کس عالم میں یہ الفاظ مولانا کے قلم سے نکلے ہوں گے۔ ذرا سوچیے تو سہی ایک شخص ہے جس نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ ایک جماعت کی بے لوث اور بے لاگ خدمت میں صرف کیا ہے جس نے اپنے علم و فضل، اپنی مشیخت، اپنی شخصیت، اپنے وقار ہر چیز کو قربان کر کے اس جماعت کا ساتھ دیا ہے اور اس جماعت کا ساتھ دے کر اپنی قوم کی گالیاں کھائیں، دشمنی مول لی، آج ان خدمات، ان قربانیوں اور وفاداریوں کا صلہ اسے یہ دیا جا رہا ہے کہ اس کے سامنے بیٹھ کر اس کی قوم کے ناکردہ گناہ لوگوں کو ہدف انتقام و یرغمال بنانے کے پروگرام بنائے جا رہے ہیں۔ انتقام و یرغمال کا نعرہ لگانے والی جماعت اس کے ان ہم قوموں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی جن سے اسے اختلاف ہے شکایت ہے۔ اس اختلاف و شکایت کا بدلہ معصوم اور بے گناہ ہم قوموں سے لینے کے منصوبے بن رہے ہیں، وہ یہ سب کچھ اپنے کانوں سے سنتا ہے لیکن خاموش ہے، اس موقع پر تو فولاد و آہن کا دل بھی پھٹ جاتا، اس شخص کا دل نہ جانے کس چیز کا بنا تھا کہ یہ داستان لکھنے کے لیے بارہ برس تک دھڑکتا رہا؟

---

(۲۴)

گاندھی جی

پرنس آف ویلز کی آمد مانٹیگو چیمسفورڈ، اصلاحات کے افتتاح کے سلسلہ میں اپنے وقت کے پرنس آف ویلز ۱۹۲۱ء میں ہندوستان آئے۔ کانگرس کا یہ فیصلہ تھا کہ شہزادہ کی تمام استقبالی سرگرمیوں کا سختی کے ساتھ بائیکاٹ کیا جائے۔ اس فیصلہ نے حکومت ہند کو پریشان کر دیا۔ وائسرائے حکومت برطانیہ کو یقین دلا چکے تھے کہ ہندوستان میں پرنس کا پُرجوش اور شایانِ شان استقبال کیا جائے گا۔ جب انہیں کانگرس کے فیصلہ کا علم ہوا تو انھوں نے بائیکاٹ کی تحریک کو ناکام بنانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ حکومت اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی اور پرنس آف ویلز جس شہر میں بھی گئے سرد مہری کے ساتھ ان کا استقبال ہوا۔ ان کا آخری پڑاؤ کلکتہ میں ہونا تھا جو اس وقت ہندوستان کا سب سے اہم شہر مانا جاتا تھا۔ دار السلطنت کلکتہ سے دہلی منتقل ہو چکا تھا لیکن وائسرائے بہادر کرسمس کے موقعہ پر کلکتہ میں نزول اجلال فرمایا کرتے تھے۔ کلکتہ میں ایک مخصوص تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ پرنس آف ویلز، "وکٹوریہ میموریل ہال" کا افتتاح فرمائیں۔ وسیع اور عظیم پیمانہ پر شہزادہ کے استقبال کی تیاریاں شروع کی گئیں۔ حکومت نے شہزادہ کے دورۂ کلکتہ کو کامیاب بنانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں تھا۔

حکومت کی طرف سے گول میز کانفرنس کی تجویز ہم سب علی پور جیل میں نظر بند

تھے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ حکومت اور کانگریس میں مفاہمت کے لیے کوشاں تھے، انہوں نے وائسرائے سے ملاقات کی اور اس تاثر کے ساتھ واپس آئے کہ اگر کلکتہ میں ہم پرنس آف ویلز کے بائیکاٹ کی تحریک واپس لے لیں تو حکومت کانگریس سے سمجھوتہ کر لے گی۔ پنڈت مدن موہن مالویہ علی پور جیل تشریف لائے کہ مسٹر داس سے اور مجھ سے مشورہ کریں۔ تجویز کی بنیاد یہ تھی کہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ ہم نے پنڈت مالویہ کو قطعی طور پر کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ ہم آپس میں صلاح و مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ ہم دونوں مسٹر داس اور میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ حکومت ہند کو جس چیز نے مفاہمت پر مجبور کیا ہے وہ ہماری جاری کردہ پرنس آف ویلز کے بائیکاٹ کی تحریک ہے۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور گول میز کانفرنس میں شریک ہونا چاہیے ہم اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ گول میز کانفرنس سے ہمارا مقصد (آزادیٔ ہند) پورا نہیں ہوتا، لیکن ہماری سیاسی جد و جہد کے میدان میں یہ ایک بڑا اہم اقدام ثابت ہوگا۔ گاندھی جی کے سوا تمام کانگرسی رہنما جیل میں تھے۔ ہماری تجویز یہ تھی کہ برطانوی پیشکش ہمیں قبول کر لینی چاہیے لیکن ہماری شرط یہ تھی کہ گول میز کانفرنس شروع ہونے سے پہلے تمام کانگرسی رہنماؤں کی رہائی عمل میں آجانا چاہیے۔

مالوی گاندھی ملاقات دوسرے روز جب پنڈت مالویہ پھر ہم سے ملنے آئے ہم نے اپنی رائے سے انہیں مطلع کر دیا۔ ہم نے ان سے یہ کہہ دیا کہ انہیں گاندھی جی سے مل کر ان کی منظوری بھی حاصل کر لینی چاہیے۔ پنڈت مالویہ نے صورتِ احوال سے وائسرائے کو مطلع کر دیا اور دو روز کے بعد وہ پھر ہم سے جیل میں آکر ملے۔ انہوں نے کہا کہ حکومتِ ہند ان تمام سیاسی رہنماؤں کو جیل سے رہا کرنے پر تیار ہے جو اس بحث میں حصہ لیں گے۔ اس فہرست میں علی برادران اور دوسرے بہت سے کانگرسی لیڈر شامل تھے، ہم نے ایک بیان تیار کیا جس میں ہم نے اپنے خیالات کا اظہار وضاحت سے کر دیا، پنڈت مالویہ نے یہ بیان لیا اور گاندھی جی سے ملنے بمبئی روانہ ہو گئے۔

گاندھی جی نے بہترین موقع کھو دیا ہمیں یہ معلوم کر کے بہت تعجب اور دکھ

ہوا کہ گاندھی جی نے ہماری تجویز نہیں مانی۔ انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ تمام سیاسی رہنما خاص طور پر علی برادران سب سے پہلے غیر مشروط طور پر رہا کر دیے جائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ گول میز کانفرنس کے مسئلہ پر ہم اسیران سیاسی کی رہائی سے پہلے غور نہیں کر سکتے ہم دونوں مسٹر داس اور میں اس پر متفق تھے کہ یہ مطالبہ غلط تھا۔ جب حکومت اس سے متفق تھی کہ کانگرسی رہنما گول میز کانفرنس سے پہلے رہا کر دیے جائیں گے، پھر خصوصی طور پر اس مسئلہ پر زور دینے کی کوئی وجہ نہیں تھی، پنڈت مالویہ ہمارا تبصرہ لے کر، پھر گاندھی جی کے پاس پہنچے، لیکن وہ اب بھی اپنی رائے پر قائم رہے نتیجہ یہ ہوا کہ وائسرائے نے اپنی پیش کش واپس لے لی، اس پیش کش کا اصل مقصد یہ تھا کہ کلکتہ میں پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ نہ ہو، لیکن چونکہ کوئی مفاہمت نہ ہوئی لہٰذا بائیکاٹ کی تحریک شاندار طور پر کامیاب ہوئی۔ مگر اس طرح ہم نے سیاسی مفاہمت کا ایک زریں موقع کھو دیا۔

گاندھی جی کی بے تدبیر سیاست

پھر گاندھی جی نے بمبئی میں سنکرن نائر کے زیر صدارت ایک کانفرنس طلب کی۔ اس کانفرنس میں گاندھی جی نے بہ نفس نفیس گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی۔ گاندھی جی کے شرائط تقریباً وہی تھے جو اس سے پہلے پنڈت مالویہ ان کے پاس لے کر گئے تھے اس اثنا میں پرنس آف ویلز ہندوستان سے واپس جا چکے تھے اور حکومت کو اس تجویز سے مزید دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے گاندھی جی کی تجویز پر کوئی توجہ نہیں کی اور اسے یکسر مسترد کر دیا۔ اس بات سے مسٹر داس بہت برہم ہوتے۔ انہوں نے کہا "گاندھی جی نے بہت بڑی غلطی کی ہے!"

میں مسٹر داس کے اس فیصلہ کو صحیح تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔

گاندھی جی کی ایک اور زبردست غلطی

پھر چوری چورا کے حادثہ کے باعث گاندھی جی نے تحریک ترک موالات معطل کر دی۔ ان کا فیصلہ سیاسی حلقوں میں سنگین ترین سیاسی ردِ عمل کا اور ملک میں بے حوصلگی پیدا کرنے کا موجب ہوا۔ حکومت نے صورت حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور گاندھی جی کو گرفتار کر لیا، انہیں چھ سال کی سزائے قید ہوئی اور تحریک ترک معاملات آہستہ

شائع کر رہے تھے لہٰذا انہوں نے ہماری ایک نہ سنی۔

(ص ۱۶۲)

"مولانا کیا آپ میرا ساتھ دیں گے؟" (جبکہ وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن جواہر لال اور سردار پٹیل کو تقسیم ہند پر رضامند کر چکے ہیں)

"اب کہ سردار پٹیل ہی نہیں جواہر لال تک تقسیم ہند پر راضی ہو چکے تھے، میری تنہا امید گاہ — گاندھی جی کی ذات تھی — وہ ۱۳۱ مارچ ۱۹۴۷ کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملنے دہلی آتے ہیں، فوراً اُن سے ملنے روانہ ہو گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا تقسیم ہند اب ایک خطرہ بن چکی ہے۔ ولبھ بھائی اور صرف وہی نہیں جواہر لال تک سپر انداز ہو چکے ہیں۔ بتائیے مولانا آپ کیا کریں گے؟ آپ میرا ساتھ دیں گے یا آپ بھی بدل چکے ہیں؟"

میں نے جواب دیا، میں تقسیم ہند کا مخالف پہلے بھی تھا، اب بھی ہوں، بلکہ اب سے زیادہ اس تخیل کا مخالف کبھی نہیں تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ جواہر لال اور سردار پٹیل نے شکست تسلیم کر لی ہے بلکہ آپ کے الفاظ میں سپر انداز ہو گئے ہیں، میری واحد امید گاہ آپ کی ذات ہے۔ اگر آپ تقسیم کے خلاف آمادہ عمل ہوں، تو ہم حالات کو اب بھی قابو میں لا سکتے ہیں لیکن اگر آپ بھی خاموشی اختیار کر لیں تو مجھے شبہ ہے کہ پھر ہندوستان ہاتھ سے گیا۔

گاندھی جی نے جواب دیا کہ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ اگر کانگریس تقسیم ہند قبول کر لینا چاہتی ہے تو یہ کارروائی میری لاش ہی پر ہو سکے گی؟ جب تک میں زندہ ہوں کبھی بھی تقسیم ہند پر رضامند نہیں ہو سکتا اور نہ میں کانگریس کو ایسا کرنے دوں گا۔

"مولانا! میں آپ کا ساتھ نہیں دوں گا" (اسی دن گاندھی جی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملے، دوسرے دن)

دونوں میں پھر ملاقات ہوئی اور ۲ اپریل کو پھر پہلی مرتبہ جب وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن

دشمن کی حیثیت سے نہیں بلکہ برطانیہ کے دشمن کی حیثیت سے آئے گی اور سردار پٹیل بھی یہی رائے رکھتے تھے اور شاید گاندھی جی کو وہی اس راہ پر لائے تھے، بہر حال ہمارا باہمی اختلاف واضح ہو چکا تھا۔

"ہندوستان خالی کر دو"

جولائی کے پہلے ہفتہ میں ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ وردھا میں ہوا، میں پانچ جولائی کو وہاں پہنچ گیا۔ اس موقعہ پر پہلی مرتبہ گاندھی جی نے مجھ سے "ہندوستان خالی کر دو" کی تحریک پر گفتگو کی۔ میں اس نئے تصور سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکا۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں ہر ایسی بات اور ہر ایسے کام سے باز رہنا چاہیے جو جاپان کی حوصلہ افزائی کا موجب ہو۔ یہ وہ وقت تھا جب جاپانی فوجیں برما پر قبضہ کر چکی تھیں اور آسام کی طرف بڑھ رہی تھیں، میرے نزدیک بہتر صورت یہ تھی کہ ہم انتظار کریں اور دیکھیں کہ جنگ کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے گاندھی جی نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا، انہیں اس پر اصرار تھا کہ وقت آ گیا ہے کہ کانگریس انگریزوں سے ہندوستان خالی کر دینے کا مطالبہ کرے۔ اگر انگریز یہ مطالبہ مان لیتے ہیں تو ہم جاپانیوں سے کہہ دیں گے کہ اب وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھیں، لیکن اس کے بعد بھی اگر ان کا اقدام جاری رہے تو یہ حملہ برطانیہ پر نہیں ہندوستان پر سمجھا جائے گا۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہوئی تو ہم اپنی پوری طاقت سے جاپان کا مقابلہ کریں گے۔

گاندھی جی کی گول مول باتیں

میں کہہ چکا ہوں کہ آغاز جنگ کے وقت میری یہ رائے تھی کہ برطانیہ کا منظم طور پر مقابلہ کیا جائے لیکن گاندھی جی نے میری اس رائے سے اتفاق نہیں کیا تھا لیکن اب کہ ان کی رائے تبدیل ہو چکی تھی، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دشمن جب ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھ چکا ہے تو برطانوی حکومت ایک منظم مخالفانہ تحریک کو کس طرح برداشت کر لے گی؟ گاندھی جی کا خیال تھا ضرور کر لے گی، جب میں نے ان پر زور دیا کہ وہ اپنے پروگرام کی تفصیل بتائیں تو وہ سوا اس کے کوئی واضح بات نہ کہہ سکے کہ سابقہ مواقع کے برعکس اس مرتبہ لوگ رضا کارانہ طور پر گرفتار نہیں ہوں گے، وہ گرفتاری کا مقابلہ کر لیں گے اور اس وقت گرفتار ہوں گے جب جسمانی طور پر مجبور کر دیے جائیں۔

(ص ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷،)

بغاوت کا اعلان، صُلح کی کوشش جب "ہندوستان خالی کر دو" کا ریزولیوشن پاس ہوگیا تو گاندھی جی کے سیکرٹری مہادیو ڈیسائی نے مس سلیڈ سے کہا کہ وہ جائیں، وائسرائے سے ملیں اور اس تجویز کا مدعا انہیں سمجھائیں۔ مس سلیڈ ایک برطانوی امیر البحر کی لڑکی تھیں، لیکن انہوں نے گاندھی جی سے متاثر ہوکر ہندوستانی طرزِ حیات اختیار کر لیا تھا اور عام طور پر میرابین کے نام سے مشہور تھیں۔ یہ گاندھی جی کی بڑی مخلص چیلی تھیں اور کئی برس سے ان کے آشرم میں رہ رہی تھیں۔ مس سلیڈ واردھا سے دہلی پہنچیں اور وائسرائے سے انٹرویو کی درخواست کی۔ وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری نے جواب دیا کہ چونکہ گاندھی جی اعلان کر چکے ہیں کہ وہ بغاوت کے پروگرام پر غور کر رہے ہیں لہٰذا وائسرائے ملاقات نہیں کر سکتے۔ سیکرٹری نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ جنگ کے زمانہ میں حکومت کسی قسم کی باغیانہ سرگرمی گوارا نہیں کرے گی خواہ تشدد پر مبنی ہو یا عدم تشدد پر، نہ گورنمنٹ کسی ایسی تنظیم کے نمائندے سے گفتگو کر سکتی ہے جو اس طرح کے خیال رکھتا ہو۔ اس کے بعد میرابین نے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری سے ملاقات کی اور دیر تک اُن سے باتیں کرتی رہیں۔ (ص ۸۰، ۱۰۱)

گاندھی جی کی خود اعتمادی متزلزل ہوگئی وائسرائے کا میرابین سے ملاقات کرنے سے انکار ایسا واقعہ تھا کہ گاندھی جی محسوس کرنے لگے۔ حکومت آسانی سے ہار ماننے والی نہیں۔ اس سلسلہ میں گاندھی جی کو جو اعتماد تھا وہ متزلزل ہوگیا۔ (ص ۹۲)

گاندھی جی ضرورت کے وقت بھول بھی جاتے تھے گاندھی جی کرپس سے مشن کے زمانہ میں جب پہلی بار ملے تو کرپس نے یاد دلایا کہ (دراصل) یہ وہی تجاویز ہیں جو کانگرسی رہنماؤں خصوصاً گاندھی جی کے مشورہ سے کرپس کے دوران قیام واردھا میں تیار کی گئی تھیں۔ یعنی جنگ کے دوران میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو پورے طور پر ہندوستانی بنا دینا اور جنگ کے بعد ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دینا۔

گاندھی جی نے کہا انہیں (واردھا والی تجاویز) کے بارے میں کچھ یاد نہیں (واردھا میں

کرپس سے ملاقات کے دوران میں اُن کی جو گفتگو ہوئی تھی، وہ سبزی خوری کے بعض پہلوؤں سے متعلق تھی کرپس نے جواب دیا کہ یہ میری بدقسمتی ہے کہ گاندھی جی غذائی باتیں تو یاد رکھیں اور وہ تجاویز فراموش کر دیں جو اُن کے رفقا اور خود ان کے مشورہ سے تیار کی گئی تھیں۔

(ص ۵۰)

میرا اور گاندھی جی کا اختلاف

گاندھی جی کا خیال تھا کہ جنگ اب ہندوستان کی سرزمین تک پہنچ چکی ہے، لہٰذا جیسے ہی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوگی، انگریز کانگرس سے صلح کر لیں گے اور اگر ایسا نہ ہوا تو بھی گاندھی جی کو یقین تھا کہ ایسی حالت میں جب جاپانی فوجیں ہندوستان کے دروازہ پر دستک دے رہی ہیں، انگریز کوئی سخت قدم نہیں اُٹھائیں گے، لیکن میری رائے یہ نہیں تھی میرا خیال تھا، جنگ کے اس نازک مرحلہ پر حکومت کسی عوامی تحریک کو برداشت نہیں کرے گی۔ انگریزوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ وہ تیزی سے اور سختی سے اپنا کام کر گزریں گے۔

میں اس خیال پر سختی سے قائم تھا کہ موجودہ حالات میں کوئی تحریک جو عدم تشدد پر مبنی ہو نہ کامیاب ہو سکتی ہے، نہ چلائی جا سکتی ہے۔

"مستعفی ہو جاؤ" گاندھی جی کا مجھ سے مطالبہ

ہماری بحث و گفتگو کا سلسلہ ۵ جولائی کو شروع ہوا، اور کئی دن تک جاری رہا۔ اس سے پہلے متعدد مواقع پر بعض مسائل سے متعلق میں گاندھی جی سے اختلاف رائے کر چکا تھا، لیکن اب ہمارے اختلافات بہت زیادہ نمایاں اور واضح تھے، صورتِ حال نقطہ عروج پر پہنچ گئی، جب گاندھی جی نے مجھے ایک خط بھیجا کہ میرا موقف ان سے اس درجہ مختلف ہے کہ اب ہم ایک ساتھ کام نہیں کر سکتے اگر کانگریس یہ چاہتی ہے کہ گاندھی جی اپنی تحریک چلائیں تو مجھے کانگرس کی صدارت اور ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ اسی طرح جواہر لال کو بھی استعفیٰ دے دینا چاہیے۔

پٹیل نے گاندھی جی کو سمجھایا

میں نے فوراً جواہر لال کو بلایا اور گاندھی جی کا خط دکھایا یہ خط پڑھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ وہ فوراً گاندھی

کے پاس پہنچے اور اس اقدام کے خلاف انہوں نے سخت احتجاج کیا۔ پٹیل نے کہا کہ اگر میں کانگرس کی صدارت سے مستعفی ہو گیا اور جواہر لال بھی الگ ہو گئے تو ملک خطرناک حالات سے دوچار ہو گا۔ نہ صرف قوم کے خیالات پراگندہ ہوں گے بلکہ کانگریس کی بنیاد بھی ہل جائے گی۔

گاندھی جی نے توبہ کر لی گاندھی جی نے ۷ر جولائی کی صبح کو یہ خط میرے پاس بھیجا تھا۔ دوپہر کے وقت انہوں نے مجھے یاد کیا۔ انہوں نے ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ صبح کو انہوں نے جو خط بھیجا تھا، یونہی جلدی میں لکھ دیا تھا، بعد میں انہوں نے اس مسئلہ پر مزید غور کیا اور اب وہ اسے واپس لینا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ بات مان لی، سہ پہر کو جب ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا تو گاندھی جی نے جو پہلی بات کہی وہ یہ تھی کہ گنہ گار توبہ کر کے مولانا کے حضور میں پھر حاضر ہے۔" (ص ۷۵، ۷۶، ۷۷)

گرفتاری کے بعد گاندھی جی کی اُداسی (گاندھی جی اور ممبران ورکنگ کمیٹی گرفتار ہو کر بمبئی سے پونا، اور احمد نگر لے جائے جا رہے ہیں)

مسز نائیڈو اپنے کمپارٹمنٹ سے ہمارے پاس آئیں، انہوں نے کہا، گاندھی جی ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم ان کے کمپارٹمنٹ میں پہنچے۔ گاندھی جی بہت زیادہ شگفتہ خاطر نظر آ رہے تھے، اتنا اداس اور مضمحل میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا، اس طرح یک بیک۔ گرفتار ہو جانا ان کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا، ان کا خیال تھا حکومت کوئی سخت اقدام نہیں کرے گی، ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اب وہ چکر میں تھے کہ کیا کریں۔

گاندھی جی کا دماغی توازن ایک منٹ کی گفتگو کے بعد گاندھی جی نے کہا جیسے ہی آپ منزلِ مقصود پر پہنچیں حکومت کو مطلع کیجئے کہ صدر کانگرس کی حیثیت سے آپ اپنا کام جاری رکھیں گے، مطالبہ کیجئے کہ آپ کا

پرائیویٹ سیکرٹری آپ اپنا کام جاری رکھیں گے، مطالبہ کیجئے کہ آپ کا پرائیویٹ سیکرٹری آپ کے ساتھ رہے اور دوسری ضروری سہولتیں آپ کو بہم پہنچائی جائیں اور اگر ضرورت ہو تو اس مسئلہ کو نقطہ جنگ بنا لیجئے۔

میں گاندھی جی سے اتفاق نہ کر سکا

میں گاندھی جی سے اتفاق نہ کر سکا میں نے کہا اب حالات بالکل بدل چکے ہیں ہم نے اپنا راستہ کھلی آنکھوں کے ساتھ منتخب کیا ہے اور اب ہمیں نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ بات میری سمجھ میں آ سکتی تھی کہ میں ان مسائل پر اڑ جاؤں جو کانگرس نے منظور کیے ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر یعنی ذاتی سہولتوں کے لیے میں کس طرح حکومت سے جھگڑ سکتا ہوں؟

ہم لوگ گفتگو کر رہے تھے کہ بمبئی کا پولیس کمشنر آیا جو ہمارے ساتھ جا رہا تھا اس نے مجھ سے کہا صرف مسز نائیڈو گاندھی جی کے ساتھ ٹھہر سکتی ہیں اور جواہر لال اپنے کمپاؤنڈ میں چلے آتے۔

(ص ۸۵، ۸۶)

گاندھی جی کی رہائی

(اپریل ۱۹۴۴ء) اسی زمانے میں ایک روز یک بیک اخبارات میں یہ خبر نظر سے گزری کہ گاندھی جی رہا کر دیے گئے، رہا ہونے کے کچھ عرصہ بعد تک وہ اتنے بیمار رہے کہ کوئی اثر انگیز اقدام اُن کے لیے ممکن نہ تھا، کئی ہفتے تک وہ زیر علاج رہے لیکن جیسے ہی حالت سنبھلی انہوں نے متعدد قسم کی سرگرمیاں شروع کر دیں۔

(ص ۹۲، ۹۳)

گاندھی جی کا عجیب و غریب بیان

گاندھی جی نے حکومت سے از سر نو گفت و شنید کی طرح ڈالی۔ یہ روش ان کے گزشتہ رویہ سے مختلف تھی۔ انہوں نے نیوز کرانیکل لندن میں ایک بیان شائع کر دیا کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے تو وہ رضاکارانہ طور پر انگریزوں کا ساتھ دے گا اور مسائی جنگ کی پوری پوری تائید اور پشت پناہی کرے گا، یہ بیان پڑھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔

(ص ۹۳)

گاندھی جی کا عجیب و غریب بیان

جب جنگ شروع ہوئی، میں نے بڑی کوشش کی تھی کہ کانگرس ایک حقیقت پسندانہ اور مثبت پہلو اختیار کرے۔ گاندھی جی اس وقت اس بات پر اڑ گئے تھے کہ گو بلاشبہ ہندوستان کی آزادی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن عدم تشدد کے عقیدہ پر قائم رہنا آزادی ہند سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اُن کی طے شدہ پالیسی یہ تھی کہ اگر ہندوستان کو صرف اس طرح آزادی مل سکتی ہے کہ جنگ میں شرکت کرے تو ایسی آزادی کو وہ دُور سے سلام کرتے ہیں، لیکن اب وہی گاندھی جی فرماتے تھے کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے تو مساعی جنگ میں وہ انگریزوں سے پورا پورا تعاون کرے گا۔ گاندھی جی کے سابقہ خیالات سے یہ نیا خیال بالکل برعکس تھا، اس اظہار خیال نے ہندوستان سے غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ ہندوستانی اس بیان سے اُلجھن میں مبتلا ہو گئے۔ انگریزوں پر اس نے جو اثر کیا، وہ بھی ناخوشگوار ہی تھا، بہت سے انگریزوں کا خیال تھا کہ جب تک جنگ کا نتیجہ مشکوک رہا، گاندھی جی انگریزوں کی امداد سے کتراتے رہے۔ ان کی موجودہ پیش کش کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ چونکہ اتحادیوں کی فتح یقینی ہے، لہٰذا وہ مفت میں انگریزوں کی ہمدردی حاصل کر لینا چاہتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی کو اپنی پیش کش سے جو توقع تھی وہ رائیگاں گئی، برٹش گورنمنٹ نے اس پر ذرا بھی توجہ نہ کی۔

(ص ۹۳، ۹۴)

گاندھی جی تشدد اور عدم تشدد کو نظر انداز کر گئے

(جون ۴۵ء شملہ کانفرنس) ورکنگ کمیٹی نے طویل بحث مباحثہ کے بعد طے کیا کہ کانفرنس میں چند خاص مسائل پر زور دیا جائے (مثلاً)

برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں سے رائے لیے بغیر ہندوستان کے شریکِ جنگ ہونے کا اعلان کر دیا۔ کانگرس اس پوزیشن کو تسلیم نہیں کرتی۔ اگر حکومت سے تصفیہ ہوتا ہے اور ایک نئی ایگزیکٹو کونسل تشکیل پاتی ہے تو ضروری ہے کہ ہندوستان کی شرکت جنگ کی اجازت مرکزی اسمبلی سے لی جائے، ہندوستان جاپان کے خلاف جنگ میں ضرور حصہ لے گا لیکن اس لیے نہیں کہ برطانوی حکومت کا یہ فیصلہ ہے بلکہ اس لیے کہ اس کے قومی نمائندوں کی یہ رائے ہے۔

گاندھی جی ورکنگ کمیٹی کے اس جلسہ میں شروع سے آخر تک رونق افروز رہے - یہ فیصلہ ان کی رضامندی سے ہوا تھا - اس موقع پر انہوں نے یہ سوال بالکل نہیں اُٹھایا کہ شرکت جنگ کے معنی یہ ہیں کہ کانگرس عدم تشدد کے عقیدہ سے دستبردار ہو جائے دوسرے الفاظ میں ایک لمحہ کے لیے بھی انہوں نے تشدد یا عدم تشدد کا سوال نہیں اُٹھایا - (ص ۱۰۸)

گاندھی جی کی شاباش ۱۹۴۶ء پنجاب میں نئے انتخابات کے بعد مولانا آزاد کانگرس کی مدد سے خضر حیات خاں کو وزیراعظم بنا دیتے ہیں، جواہر لال اصولی طور پر اس کارروائی کی مخالفت کرتے ہیں اور مولانا آزاد کو ملامت کرتے ہیں

گاندھی جی نے پرزور طور پر میری تائید کی - انہوں نے کہا اگرچہ کانگریس پنجاب میں ایک اقلیت ہے لیکن اس کی آواز وزارت سازی اور وزارت کی کارگزاری کے سلسلہ میں ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے - انہوں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس کے نقطہ نظر سے اس سے بہتر کوئی اور فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا تھا -

جب گاندھی جی نے اس طرح صاف اور غیر مبہم طور پر میری حمایت کی تو ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں نے بھی میری تائید کی اور جواہر لال نے بھی خاموشی اختیار کر لی - (ص ۱۳۰)

گاندھی جی وفاقی دستور کے پرزور حامی (اپریل ۱۹۴۶ء فرقہ وارانہ حل کے سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کابینہ وفد کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں اور مرکز کو صرف دفاع، مواصلات اور امور خارجہ، وفد نے اس تجویز کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا کہ مسلم لیگ کی بدگمانی اور بداعتمادی کو دور کرنے کا یہی ایک واحد طریقہ تھا، لیکن کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں نے اس تجویز سے اختلاف شروع کر دیا -)

"حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی نے میرے بارے میں یہ کہہ کر مجھے بہت ممنون کیا

کہ میں نے اس فرقہ وارانہ مسئلہ کا ایسا حل دریافت کر لیا جس نے ہر شخص کو پریشان و سرگشتہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے میرے بارے میں کہا کہ میرا حل مسلم لیگ کے بدترین فرقہ پرستوں کے اس خوف کو بھی دُور کر دے گا جو ہندو اکثریت سے انہیں ہے اور دوسری طرف یہ حل قومی نقطۂ نظر کا ترجمان ہے نہ کہ فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کا، گاندھی جی نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں صرف وفاقی دستور ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔''

(ص ۱۴۱)

گاندھی جی نے میری طرف سے جواب دیا

سردار پٹیل نے مجھ سے دریافت کیا کہ آیا مرکزی حکومت صرف دفاع ''امور خارجہ اور رسل و رسائل ہی تک محدود رہے گی؟ پھر انہوں نے کہا اور بھی ایسی کتنی چیزیں ہیں مثلاً سکہ اور مالیات ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے مرکز کے تابع ہونا چاہئیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تجارت اور صنعت صرف آل انڈیا بنیاد ہی پر ترقی کر سکتی ہیں۔ یہی رائے ان کی تجارتی پالیسی کے بارے میں بھی تھی۔

پٹیل کے ان اعتراضات کا جواب مجھے نہیں دینا پڑا۔ گاندھی جی نے خود ہی میری طرف سے بات صاف کر دی۔ انہوں نے کہا، اس اندیشہ کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ صوبائی حکومتیں سکے اور کسٹم کے معاملہ میں مرکزی حکومت سے مختلف رویہ اختیار کریں گے۔

خود اُن کے مفاد کا تقاضا یہ ہو گا کہ ان معاملات میں متحدہ پالیسی پر کاربند ہوں، لہٰذا کوئی ضرورت نہیں ہے کہ سکہ اور مالیات کو مرکز کی لازمی فہرست اختیارات میں شامل کر لیا جاتے۔

(ص ۱۴۲)

گاندھی جی کس آسانی سے رائے بدل لیتے تھے

(سنہ ۳۷ء مولانا آزاد نے یوپی مسلم لیگ کو کانگریس سے اشتراک و تعاون پر آمادہ کر لیا تھا، لیکن جواہر لال نے وہ پیشکش مسترد کر دی، جو مولانا نے مسلم لیگ کے سامنے رکھی تھی)

''جب میں نے دیکھا کہ جواہر لال اپنا فیصلہ بدلنے پر آمادہ نہیں ہوتے تو گاندھی جی

کی ہدایت حاصل کرنے وارد ھا گیا، جب میں نے ساری صورت حال گاندھی جی کے سامنے واضح کی تو انہوں نے میرے ساتھ اتفاق کا اظہار کر لیا اور فرمایا کہ وہ جواہر لال کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنا فیصلہ بدل لیں، لیکن جواہر لال نے معاملہ کو دوسرے رنگ میں پیش کیا ۔ گاندھی جی جواہر لال کے ہمنوا ہو گئے اور اپنے وعدہ کے برخلاف اس معاملہ پر کوئی زور نہیں دیا ۔ (ص ۱۴۱، ۱۴۲)

کابینہ وفد کی سفارشات کی پُرزور تائید

(کابینہ وفد کا پلان اور اس پلان کی تجویز صوبائی گروپ بندی کانگرس منظور کر چکی ہے)

آسام کے کانگرسی لیڈروں نے صوبوں کی گروپ بندی پر اعتراض کیا، انہیں بنگال کی مسلم اکثریت سے خطرہ تھا، ان کا کہنا تھا، اگر بنگال اور آسام، ایک گروپ میں بندھ گئے تو سارے علاقے پر مسلمانوں کی حکمرانی ہو گی۔ یہ اعتراض آسام کے کانگرسی لیڈروں نے کابینہ وفد کے اعلان کے فوراً بعد اُٹھایا۔ گاندھی جی کابینہ وفد کا پلان منظور کر چکے تھے انہوں نے اعلان کیا کہ کابینہ وفد کے پلان میں وہ تخم ہیں جو دُکھ کی اس سرزمین کو ایسا خطہ بنا دیں گے جہاں نہ دُکھ ہو گا نہ مصیبت، گاندھی جی نے ہریجن میں یہ بھی لکھا کہ چار روز تک مسلسل دیدہ ریزی کے ساتھ کابینہ وفد کے پلان کا مطالعہ کرنے کے بعد میرا عقیدہ مجھے اس اعتراف پر مجبور کر رہا ہے کہ موجودہ حالات میں برطانوی حکومت اس سے بہتر کوئی دستاویز مرتب نہیں کر سکتی تھی ۔

گاندھی جی نے پھر رائے بدل دی

گوپی ناتھ باردولائی نے جو آسام کے وزیر اعلیٰ تھے اپنا اختلاف جاری رکھا۔ انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے بنگال کے ساتھ آسام کی گروپ بندی کے خلاف ایک میمورنڈم پیش کیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ گروپنگ کا مسئلہ از سر نو اب ہمیں نہیں اٹھانا چاہیے ۔

اسی اثنا میں گاندھی نے اپنی رائے تبدیل کر دی اور باردولائی کی حمایت شروع کر دی۔ چونکہ گاندھی جی اب ان کی پشت پر تھے اور ان کی تائید میں بیان پر بیان

آہستہ ختم ہو گئی۔

(ص ۱۶، ۱۷، ۱۸)

پیچیدہ شخصیت گاندھی جی نے لارڈ لنلتھگو سے کہا۔ برطانوی حکومت کو ہتھیار ڈال کر ہٹلر کا مقابلہ روحانی طاقت سے کرنا چاہیے۔ لارڈ لنلتھگو یہ سن کر ششدر رہ گئے اُن کے نزدیک یہ بڑی عجیب اور غیر معمولی تجویز تھی۔ عام طور پر ان کا معمول یہ تھا کہ گھنٹی بجا کر وہ اپنے اے، ڈی، سی کو بلاتے اور وہ گاندھی جی کو ان کی کار تک پہنچا آتا تھا لیکن اس موقع پر نہ انھوں نے گھنٹی بجائی نہ اے، ڈی، سی کو بلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی ایک گم سم اور حیران و پریشان وائسرائے کے سامنے سے اُٹھ کر تن تنہا اپنی کار تک آتے، گاندھی جی جب مجھ سے ملے تو انھوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور اس بات پر اظہار حیرت کیا کہ وائسرائے نے رسم و اخلاق کو بھی فراموش کر دیا، میں نے جواب دیا، آپ کی تجویز سے وائسرائے اتنا بھونچکا ہوا کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ معمولاً وہ کیا کرتا تھا، میری یہ توجیہہ سن کر گاندھی جی ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے۔

(ص ۳۶)

گاندھی جی جنگ کے زمانہ میں تحریک چلانے کے مخالف تھے کرپس کے رخصت ہو جانے کے بعد گاندھی جی کے رویہ میں بھی میں نے نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ میں بتا چکا ہوں کہ پہلے پہل دورانِ جنگ میں تحریکِ سول نافرمانی شروع کرنے کے وہ سخت مخالف تھے حقیقت یہ ہے کہ بڑی مشکل سے میں انہیں انفرادی ستیہ گرہ پر راضی کر سکا تھا اور اس کے لیے بھی انہوں نے بڑی کڑی شرطیں عائد کی تھیں۔"

۴۲ء میں تیار ہو گئے لیکن اب گاندھی جی منظم عوامی تحریکِ سول نافرمانی شروع کرنے کے لیے بے چین تھے، جون ۴۲ء میں میں واردھا ان سے ملنے گیا، تقریباً پانچ روز ان کے پاس مقیم رہا۔ اس عرصہ میں جو گفتگو ہوئی اس سے میں نے محسوس کیا کہ جنگ کے آغاز میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا تھا، اب وہ اس سے کہیں دُور اور بہت آگے جا چکے ہیں۔

سردار پٹیل کا گاندھی جی پر اثر گاندھی جی نے مجھ سے کہا کہ اگر جاپانی فوج نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو وہ ہمارے

سے مل کر واپس آئے تو فوراً ہی سردار پٹیل ان کے پاس پہنچے اور دو گھنٹے تک بیٹھے رہے اس ملاقات میں کیا باتیں ہوئیں؟ میں نہیں جانتا! لیکن جب دوبارہ میں گاندھی جی سے ملا تو میں نے ایسا محسوس کیا جو میری زندگی کا اہم ترین حادثہ ہے۔ میں نے دیکھا گاندھی جی بھی بدل گئے جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ صدمہ پہنچایا اور حیران کیا وہ یہ تھی کہ اب گاندھی جی بالکل سردار پٹیل کی زبان میں بول رہے تھے، دو گھنٹے تک میں انہیں ہموار کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔

آخر کار میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ نے بھی یہ خیالات قبول کر لیے ہیں تو پھر مجھے کوئی آس نہیں ہے کہ ہندوستان تباہی سے بچ سکے گا۔

گاندھی جی نے مجھے بتایا کہ پوزیشن ایسی ہے کہ اب تقسیم ہند کو ٹالا نہیں جا سکتا۔

سردار پٹیل کا کرشمہ

اب قابلِ تصفیہ جو بات تھی وہ صرف یہ کہ تقسیم کس طرح عمل میں آئے، یہی سوال تھا جس پر دن رات گاندھی جی کی کٹیا میں بحث ہوتی رہتی تھی۔ میں نے بہت غور کیا کہ گاندھی جی اتنی پھرتی سے اپنی رائے بدلنے پر کیسے راضی ہو گئے، میرا مطالعہ یہ ہے کہ سردار پٹیل کے اثر کا نتیجہ تھا۔

(ص ۱۸۶، ۱۸۷)

گاندھی جی کا مرن بھرت

(دلی میں مسلمانوں کا قتلِ عام جاری ہے۔ وزیر داخلہ سردار پٹیل مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے کوئی موثر قدم نہیں اٹھاتے)

گاندھی جی کی مصیبت روز افزوں ترقی پر تھی، ایک وہ زمانہ تھا کہ اُن کی معمولی خواہش پر قوم لبیک کہہ رہی تھی اور اب یہ وقت تھا کہ اُن کی دلگداز اپیلیں بھی بہرے کانوں سے ٹکرا کر واپس آجاتی تھیں۔ آخر کار حالات کی یہ رفتار اُن کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی، انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ ان کے پاس ایک ہی ہتھیار یعنی جب تک دہلی میں امن و بحال نہ ہو، فاقہ کرنا رہ گیا ہے جب یہ بات مشہور ہوئی، بہت سے لوگ جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے ندامت محسوس کر کے آمادہ عمل ہو گئے، انہوں نے محسوس کیا کہ اس عمر اور صحت کے اس عالم میں انہیں

فاقہ کشی سے باز رکھنا چاہیے، انھوں نے گاندھی جی سے اپیل کی کہ وہ فاقہ کشی کا ارادہ ترک کر دیں لیکن وہ اپنی جگہ چٹان کی طرح جمے رہے۔

(ص ۲۱۵، ۲۱۶)

برت توڑنے کیلیے گاندھی جی کے شرائط

بہت سے لوگ گاندھی جی کے پاس آئے، انھوں نے عہد کیا کہ وہ دلی کے گمشدہ امن کو واپس لاکر رہیں گے، لیکن گاندھی جی الفاظ کے طلسم میں پھنسنے والے نہیں تھے، تیسرے دن ایک پبلک میٹنگ صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے طلب کی گئی کہ گاندھی جی برت ترک کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

اس جلسہ میں جاتے ہوئے گاندھی جی سے ملا۔ میں نے اُن سے کہا، برت توڑنے کے شرائط بتائیے، یہ شرائط ہم جلسے میں پیش کریں گے اور لوگوں کو بتائیں گے کہ اگر گاندھی جی کے یہ شرائط مان لیے جائیں تو وہ برت ترک کر دیں گے۔

گاندھی جی نے کہا یہ ہے کاروباری بات! میری پہلی شرط یہ ہے کہ وہ تمام مسلمان جو ہندوؤں اور سکھوں کے حملہ سے مجبور ہو کر دلی چھوڑ گئے ہیں، انہیں دوبارہ آنے کی دعوت دی جائے اور انہیں دوبارہ اُن کے گھروں میں بسا دیا جائے۔

میں نے گاندھی جی کے ہاتھ پکڑ لیے اور ان سے التجا کی کہ اس بات پر اصرار نہ کریں دہلی میں جو ہندو اور سکھ اب مسلمانوں کے گھروں میں رہ رہے ہیں انہیں دوبارہ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دینا، نہ عملی طور پر ممکن ہے نہ اخلاقی طور پر مستحسن ہے۔ پہلے تو گاندھی جی اڑے رہے پھر نرم پڑ گئے، انھوں نے کہا اگر میں اس سے مطمئن ہو گیا تو وہ بھی مان لیتے ہیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، گاندھی جی نے برت ترک کرنے کے لیے حسبِ ذیل شرطیں لکھائیں:

(۱)

ہندو اور سکھ مسلمانوں پر حملے بند کر دیں اور مسلمانوں کو یقین دلائیں کہ آئندہ بھائی بھائی بن کر رہیں گے۔

(۲)

ہندو اور سکھ اس بات کی پوری کوشش کریں گے کہ اندیشہ جان و مال کے باعث

کی تعداد کو بھی ہندوستان سے جانے پر مجبور نہیں ہونا پڑے گا۔

(۳)

چلتی ٹرین میں مسلمانوں پر حملہ کا سلسلہ بند کیا جائے۔

(۴)

جو مسلمان درگاہ نظام الدین اولیا، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، نصیر الدین چراغ دہلوی اور دوسرے متبرک مقامات کے نزدیک رہتے تھے اور مجبوراً اپنا گھر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے انہیں واپس اپنے علاقوں میں لایا جائے اور پھر سے بسایا جائے۔

(۵)

درگاہ قطب صاحب کو فسادات میں نقصان پہنچا تھا۔ حکومت آسانی سے اس کی مرمت کر سکتی تھی لیکن اس سے گاندھی جی مطمئن نہیں ہو سکتے تھے، انہوں نے کہا، یہ کام ہندوؤں اور سکھوں کو بطور کفارہ کرنا چاہیے۔ ہندو اور سکھ فرقے کے لوگ یقین دلائیں کہ ان کے دل بدل چکے ہیں، تاکہ دوبارہ انہیں ایسے مسئلہ پر برت نہ رکھنا پڑے۔

عوام کی گاندھی جی سے ہمدردی

میں نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ یہ باتیں طے پا جائیں گی۔ میں جلسہ میں پہنچا اور حاضرین کے سامنے گاندھی جی کی شرطیں رکھیں، میں نے کہا میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ کیا باشندگان دہلی گاندھی جی کو ان کے بارے میں مطمئن کر سکتے ہیں؟ پچاس ہزار سے زیادہ کے مجمع نے یک زبان ہو کر نعرہ بلند کیا کہ "ہم گاندھی جی کی خواہشات پوری کریں گے"۔ دلی کے ڈپٹی کمشنر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک جتھہ جمع کیا اور انہیں لے کر درگاہ قطب صاحب کی مرمت کے لیے روانہ ہو گیا۔

دوسرے روز صبح میں نے دہلی کے نمائندہ لیڈروں کی ایک میٹنگ طلب کی۔ ہم اس فیصلہ پر پہنچے کہ یہ سب برلا ہاؤس جائیں اور انفرادی طور پر گاندھی جی کو یقین دلائیں۔ صبح دس بجے گاندھی جی کے پاس پہنچا، میں نے کہا کہ اب میں پورے طور پر مطمئن ہوں کہ ان کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ ان کے برت نے ہزاروں دلوں کو بدل دیں اور ان میں از سر نو انصاف اور انسانیت کا احساس پیدا کر دیا۔ میں نے گاندھی جی سے اپیل کی کہ اب وہ یقین دہانی کو مان لیں اور برت توڑ دیں۔

گاندھی جی کے چہرے سے مسرت نمایاں تھی لیکن ابھی تک انہوں نے ہماری درخواست قبول نہیں کی۔ سارا دن بحث و گفتگو اور ترغیب و تحریص میں گزر گیا۔ ان کے وزن اور قوت میں کمی آگئی۔ وہ اس قابل نہیں تھے کہ بیٹھ سکیں۔ وہ بستر پر دراز تھے۔ لیکن انہوں نے ہر ایک کی بات سنی، آخر میں انہوں نے کہا کہ وہ کل صبح جواب دیں گے۔

گاندھی جی نے برت توڑ دیا

دوسرے دن دس بجے صبح پھر ہم ان کے گرد میں جمع ہوئے، جواہر لال پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسین بھی حاضرین میں موجود تھے۔ انہوں نے باقاعدہ ان سے ملنے کی درخواست کی تھی۔ گاندھی جی نے انہیں بلا بھیجا اور وہ بھی آگئے، پٹیل کے سوا ساری کابینہ موجود تھی۔ گاندھی جی نے اشارہ کیا کہ جو لوگ ان کے سامنے عہد دہرانا چاہتے ہیں وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ دلی کے پچیس لیڈروں نے جو ہندوؤں اور سکھوں کے مختلف مکاتیب فکر کے نمائندے تھے۔ ایک ایک کر کے عہد کیا کہ وہ ان شرائط کو وفاداری کے ساتھ پورا کریں گے جو گاندھی جی نے رکھی ہیں، گاندھی جی نے اشارہ کیا ان کے حلقہ کے مرد اور عورتوں نے رام دھن بھجن گانا شروع کر دیا، ان کی پوتی نے نارنگی کا افشردہ پیش کیا، انہوں نے اشارہ سے کہا کہ گلاس مجھے دے دیا جائے، میں نے گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ گاندھی جی نے برت کھول دیا۔

(ص ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۵، ۲۳۰)

گاندھی جی کو دھمکیاں

صرف سردار پٹیل ہی گاندھی جی کے برت سے نالاں نہ تھے گاندھی جی نے جب سے امن کی مہم شروع کی تھی ہندوؤں کا ایک گروہ ان کے خلاف ہو گیا اور ان لوگوں کی یہ برہمی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ گاندھی جی کو اس بات پر ملامت کرتے تھے کہ وہ ہندوؤں کے مفاد کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ان کی پرارتھنا کے جلسوں میں بھی گڑبڑ کی، گاندھی جی کے حسب ہدایت پرارتھنا میں قرآن اور بائبل کی آیتیں اور ہندو شاستر کی عبارتیں پڑھی جاتی تھیں، ان میں سے کچھ لوگوں نے ایجی ٹیشن پرارتھنا کے جلسوں کے خلاف شروع کیا، ان کا کہنا تھا کہ قرآن اور بائبل کی آیتیں کسی طرح بھی سننا منظور نہیں ہیں، انہیں ہندو دشمن ثابت کرنے کے لیے وسیع پیمانہ پر پمفلٹ اور

ہینڈ بل تقسیم کیے گئے۔ ایک پمفلٹ میں تو یہاں تک لکھا تھا کہ گاندھی جی نے اپنا رویہ نہ بدلا تو انہیں ختم کر دیا جائے گا۔

پرارتھنا کے جلسہ میں بم

گاندھی جی کے برت نے اس گروہ کو اور زیادہ مشتعل کر دیا، انہوں نے گاندھی جی کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ برت کے بعد جب انہوں نے پھر اپنی پرارتھنا کے جلسے شروع کیے تو ان پر ایک بم پھینکا گیا۔ خوش قسمتی سے کوئی مجروح نہیں ہوا، لیکن سارے ہندوستان میں تہلکہ مچ گیا کہ کیا ہندوستان میں کوئی ایسا آدمی بھی ہے جو گاندھی جی پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے؟

گاندھی جی کی حفاظت سے پٹیل کی بے پروائی

کتنی عجیب بات ہے کہ پولیس یہ سراغ نہ لگا سکی کہ بم کس طرح برلا ہاؤس میں پہنچایا گیا، مزید تعجب کی بات ہے کہ اس حادثہ کے بعد بھی گاندھی جی کی حفاظت کے انتظامات نہیں کیے گئے۔ یہ بم اس بات کا ثبوت تھا کہ خواہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو لیکن ایک جماعت ہے جو گاندھی جی کو مار ڈالنے کا تہیہ کر چکی ہے۔ قدرتی طور پر دہلی کی پولیس (سی آئی ڈی) سے یہ توقع تھی کہ گاندھی جی کی حفاظت کے لیے وہ خاص انتظامات کرے گی، انتہائی شرم اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابتدائی احتیاطی اقدامات بھی بم کے انتباہی حادثہ کے باوجود عمل میں نہیں لائے گئے۔

گاندھی جی پر مہلک وار

چند دن اور گزر گئے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ڈھائی بجے دوپہر کو میں گاندھی جی سے ملنے گیا۔ بہت سے اہم مسائل تھے جن پر مجھے گفتگو کرنی تھی، میں اُن کے پاس تقریباً ایک گھنٹہ تک رہا پھر واپس آ گیا۔

ساڑھے پانچ بجے شام کو دفعتاً یاد آیا کہ بعض اہم مسائل پر اُن کی صلاح نہیں لے سکا تھا، میں فوراً برلا ہاؤس واپس گیا، مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دروازے بند ہیں، لان پر ہزاروں لوگ کھڑے ہیں اور سڑک پر جم غفیر جمع ہے میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ کیا معاملہ ہے؟ لیکن مجمع نے جب میری کار دیکھی تو راستہ دے دیا۔ میں دروازے پر

کار سے اُترا اور اندر چلا گیا۔ برلا ہاؤس کے دروازے اندر سے بند تھے۔ کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر ایک ملازم نے مجھے دیکھا، پھر وہ آیا اور مجھے اندر لے کر چلا گیا۔ جب میں داخل ہو رہا تھا کسی آدمی نے باچشمِ پُرنم کہا،

"گاندھی جی کو گولی ماردی گئی" وہ بے ہوش پڑے ہیں۔"

گاندھی جی مر گئے یہ خبر اتنی غیر متوقع اور لرزہ خیز تھی کہ میں بمشکل ان الفاظ کا مطلب سمجھ سکا، میں کھویا ہوا سا گاندھی جی کے کمرے میں پہنچا۔ اُن کا بے جان جسم فرش پر رکھا تھا، چہرہ زرد، آنکھیں بند، ان کے دو پوتے پاؤں کے پاس بیٹھے تھے اور رو رہے تھے۔

" میں نے گویا خواب کے عالم میں سُنا :-

"گاندھی جی مر گئے ؟"

یہ سارا مضمون " بلا تبصرہ " قابلِ مطالعہ ہے۔

گاندھی جی سے اندھی عقیدت رکھنے والے رہنما

راجگوپال اچاری

مسٹر سی۔ آر۔ داس، علی پور جیل میں، تقریباً ہر روز سیاسی معاملات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ اُن کی رائے تھی کہ گاندھی جی کا راست اقدام ناکام رہا۔ ان کا خیال تھا کہ عوام کا حوصلہ قائم رکھنے کے لیے دوسرے طریقے اختیار کرنا چاہئیں۔ اب سیاسی جنگ مجالسِ آئین ساز کے ایوان میں ہونی چاہیے۔

کیا کانگرس کے زمانۂ انعقاد میں مسٹر داس جیل سے رہا ہوئے۔ مجلس استقبالیہ نے انہیں صدر کانگرس منتخب کر لیا۔ مسٹر داس کا خیال تھا کہ ملک ان کے پروگرام کی پشت پناہی کرے گا۔ اس بات سے ان کی اور حوصلہ افزائی ہوئی کہ موتی لال نہرو، وٹھل بھائی پٹیل اور حکیم اجمل خاں ان کے ہمنوا تھے۔ اپنے خطبۂ صدارت میں مسٹر داس نے تجویز پیش کی کہ کانگرس کو داخلہ کونسل کا پروگرام قبول کر لینا چاہیے۔ اس موقع پر گاندھی جی جیل میں تھے۔ شری راجگوپال اچاری کی زیر سرکردگی کانگرس کا ایک گروہ اس بنیاد پر مخالفت کر رہا تھا کہ اگر مسٹر داس کا پروگرام قبول کر لیا گیا تو حکومت اس کا یہ مطلب لے گی کہ ہم گاندھی جی کی قیادت کے خلاف ہیں۔

(ص ۱۸، ۱۹)

راجندر پرشاد

شری راجگوپال اچاری، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دوسرے لوگوں نے مسٹر داس کی مخالفت کی اور انہیں شکست دے دی۔ کیا

کانگرس میں تفرقہ پیدا ہوگیا اور مسٹر داس نے صدارت سے استعفا دے دیا۔

(ص ۱۹)

سردار پٹیل

مسٹر داس، پنڈت موتی لال اور حکیم اجمل خاں اس گروہ کی قیادت کر رہے تھے جو داخلہ کونسل کا حامی تھا، راجہ جی، سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد اُن لوگوں کے ترجمان تھے جو داخلہ کونسل کے مخالف تھے۔

(ص ۱۹)

نکتہ چینیوں کی کامیابی

داخلہ کونسل کے مخالف گروہ کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اگر داخلہ کونسل کا پروگرام عمل میں آیا تو گاندھی جی کی قیادت عامہ کمزور پڑ جائے گی۔ لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان لوگوں کی یہ رائے صحیح نہ تھی۔ مرکزی مجلس آئین ساز (سنٹرل لیجسلیچر) میں سوراج پارٹی (داخلہ کونسل کی حامی جماعت جو انتخاب میں کامیاب ہو کر نمائندہ کانگرس کی حیثیت سے اب اسمبلی کی کارروائیوں میں حصہ لینے لگی تھی) نے ایک ریزولیوشن مرتب کیا جس میں گاندھی جی کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا تھا، قبل اس کے کہ یہ تجویز مرکزی اسمبلی میں منظور ہوتی، گاندھی جی رہا کر دیئے گئے۔

(ص ۲۰)

اچاریہ کرپلانی

ورکنگ کمیٹی کے ممبر (جواہر لال کے سوا) گاندھی جی کی مخالفت ایسی صورت میں بھی نہیں کرتے تھے جب کہ وہ ان کے دلائل سے مطمئن نہ ہوں۔ یہ میرے لیے نیا تجربہ نہیں تھا۔ جواہر لال کے علاوہ جو اکثر مجھ سے ہم آہنگ رہتے تھے۔ دوسرے ممبران ورکنگ کمیٹی عام طور پر آنکھ بند کر کے گاندھی جی کے پیچھے چلنے پر قناعت کرتے تھے۔ سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور اچاریہ کرپلانی جنگ کے بارے میں کوئی سوچی سمجھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ شاذونادر ہی بذاتِ خود کسی نتیجہ پر پہنچتے تھے ورنہ ہر حالت میں اس کے عادی ہو گئے تھے کہ اپنے فیصلے کو گاندھی جی کے فیصلے کا تابع رکھیں۔ اس صورت میں ان حضرات سے بحث و گفتگو قطعاً بے کار ثابت ہوتی تھی۔ ہماری ساری باتیں سننے کے بعد اُن کا قول صرف یہ ہوتا تھا کہ ہمیں گاندھی جی پر اعتقاد رکھنا چاہیئے۔ (ص ۵۵)

کیا گاندھی جی جادوگر تھے؟ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجویز جب شائع ہوئی، (۱۴ جولائی ۱۹۴۲ء) تو سارے ملک میں ایسا معلوم ہوا گویا بجلی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ لوگوں نے ذرا بھی اس پر غور نہیں کیا کہ اس تجویز کے مؤثرات کیا ہیں۔ عوام اور ورکنگ کمیٹی کے کچھ ممبران بھی گاندھی جی کی قیادت پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ گاندھی جی کے دماغ میں کوئی ایسی تدبیر ہے جو حکومت کو مفلوج کر کے اُسے آمادۂ مفاہمت کر دے گی۔

اس جگہ مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کا خیال تھا کہ گاندھی جی جادو کے زور سے یا ما فوق الانسانی حیثیت سے ہندوستان کو آزاد کرا دیں گے۔ اس عقیدہ کے ماتحت یہ لوگ ذاتی طور پر کچھ کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

(ص ۸۰)

آنکھ بند کر کے گاندھی جی کی پیروی میں ہمیشہ سے یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ میرے اکثر (کانگریسی) دوست اور رفیق بہت سے سیاسی مسائل پر اپنے دماغ کو سرے سے زحمتِ فکر دیتے ہی نہیں تھے۔ یہ آنکھ بند کر کے گاندھی جی کی پیروی کے خوگر تھے۔ جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوا یہ اس انتظار میں رہتے تھے کہ گاندھی جی کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ میں نہ کبھی پہلے نہ اب گاندھی جی کی تحسین اور محبت میں پیچھے رہا ہوں لیکن میں ایک لمحے کے لیے بھی اس پوزیشن کو تسلیم نہیں کر سکا کہ ہم آنکھ بند کر کے ان کی تقلید کریں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس مسئلے پر (عدم تشدد کے مسئلے پر) میرے یہ دوست (سردار پٹیل، راجندر پرشاد، اچاریہ کرپلانی) ۱۹۴۰ء میں ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہونے پر تیار ہو گئے تھے، ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے بعد یہ اس کے خلاف عمل پیرا ہو گئے۔

انہوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ حکومتِ ہند کو، عدمِ تشدد کے عقیدہ کے ماتحت، بغیر فوج اور بغیر دفاعی انتظامات کے چلانے کا انتظام کریں، نہ انہوں نے جنگ سے ایک پالیسی کی حیثیت سے دستبرداری اختیار کی، ورکنگ کمیٹی میں صرف جواہر لال ایک ایسے شخص تھے جو پورے طور پر میرے ہمنوا تھے اور بالآخر واقعات کی منطق نے ہمارے موقف کو صحیح ثابت کر دیا۔ (ص ۸۵)

خاموش! (جون ۱۹۴۵ء) شملہ کانفرنس، کانگریس ورکنگ کمیٹی شریکِ جنگ ہونے کا فیصلہ کرتی ہے، گاندھی جی بھی اس موقع پر موجود ہیں۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے وہ ممبر (پٹیل، کرپلانی، راجندر پرشاد وغیرہ) جنہوں نے اس سے پہلے عدم تشدد کے سوال پر استعفیٰ دے دیا تھا خاموش بیٹھے تھے۔

(ص ۱۰۸)

اس باب سے پہلے وہ باب دیکھئے جو ان مریدوں کے مرشدِ کامل کی ذات و صفات گوناگوں کا ترجمان ہے!

لیاقت علی خاں

(رفیع احمد قدوائی کی تحریک پر کانگرس یہ سمجھ کر مسلم لیگ کو مالیات کا محکمہ دینا منظور کرتی ہے کہ وہ اُسے چلا نہیں سکے گی۔ سردار پٹیل چونکہ وزارتِ داخلہ لیگ کو دینے پر کسی طرح رضامند نہ تھے لہٰذا وہ اس تجویز کی پُرزور تائید کرتے ہیں۔)

صیاد خود اپنے دام میں تمام ممالک میں وزیر مالیات حکومت میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں یہ منصب اور زیادہ اہم تھا کیونکہ برطانوی حکومت فنانس ممبر کو اپنے مفاد کا امین سمجھتی تھی۔ یہ وہ محکمہ تھا جس پر کوئی انگریز انگلستان سے لا کر فائز کیا جاتا تھا۔ فنانس ممبر ہر محکمے میں مداخلت کر سکتا اور اپنی پالیسی چلا سکتا ہے۔ جب لیاقت علی خاں فنانس ممبر بنے تو حکومت کی کنجی ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ ہر محکمے کی ہر تجویز محکمہ مالیات کے احتساب میں آتی تھی سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ وزیرِ مالیات کی حیثیت سے لیاقت علی خاں کو تنسیخ کا حق حاصل تھا کسی محکمے میں ایک چپراسی کا تقرر بھی محکمہ مالیات کی اجازت کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پٹیل مسلم لیگ کے ہاتھ کا کھلونا سردار پٹیل کو وزارتِ داخلہ پر قبضہ رکھنے کی بڑی دھن تھی۔ لیکن اب وہ محسوس کر رہے تھے کہ

محکمہ مالیات کی پیش کش کرکے وہ مسلم لیگ کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئے ہیں۔ جو تجویز بھی وہ پیش کرتے لیاقت علی خاں یا تو اُسے مسترد کر دیتے یا اس میں اتنی تبدیلی کر دیتے کہ وہ پہچانی نہ جاتی۔ لیاقت علی خاں کی مسلسل مداخلت نے ہر کانگرسی وزیر کو بے کار اور غیر مؤثر کر دیا۔ کابینہ میں اندرونی اختلافات پھوٹ پڑے اور دن بدن بڑھتے ہی چلے گئے۔

جواہر لال کی طرف سے دعوت عارضی حکومت کے قیام کے بعد اس بات پر سب متفق ہو گئے تھے کہ چونکہ وزراء کابینہ کے جلسے سے پہلے غیر رسمی طور پر آپس ہی میں مل لیا کریں کیونکہ یہ محسوس کیا گیا تھا کہ اگر ممبرانِ کابینہ غیر رسمی طور پر آپس ہی میں بحث مباحثہ کر لیا کریں تو اس طرح یہ روایت قائم ہو جائے گی کہ وائسرائے صرف ایک دستوری سربراہ ہے، یہ غیر رسمی اجتماعات باری باری مختلف ممبروں کے کمروں میں ہوا کرتے تھے لیکن اکثر جواہر لال دوسرے ممبروں کو اپنے ہاں چائے پر بلا لیتے۔ عام طور پر یہ دعوت نامہ جواہر لال کا پرائیویٹ سیکرٹری جاری کرتا۔

لیاقت علی خاں کی ڈانٹ لیکن جب مسلم لیگ کابینہ میں شامل ہوئی تو ایگزیکٹو کونسل کے دوسرے ممبروں کی طرح جواہر لال کے پرائیویٹ سیکرٹری نے یہ دعوت نامہ لیگی ممبروں کو بھی بھیج دیا۔ لیاقت علی خاں اس بات پر بگڑ گئے۔ انہوں نے کہا یہ میری توہین ہے کہ جواہر لال کا پرائیویٹ سیکرٹری مجھے چائے پر مدعو کرے۔ اس کے علاوہ اُن کا یہ خیال بھی تھا کہ جواہر لال ایگزیکٹو کونسل کے نائب صدر کی حیثیت سے ایسے غیر رسمی اجتماعات منعقد کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

عدمِ تعاون کی پالیسی اگرچہ لیاقت علی خاں نے جواہر لال کا یہ حق تسلیم نہیں کیا لیکن خود مسلم لیگی ممبروں کے غیر رسمی اجتماعات کرنے لگے۔ بظاہر یہ ایک معمولی بات ہے لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم لیگی نمائندے کانگرس سے عدمِ تعاون کے راستے پر کتنا آگے جا چکے تھے۔ (۱)

(ص ۱۴۶، ۱۴۹)

لیاقت علی خاں کا عوامی میزانیہ

(عارضی حکومت کے وزیر مالیات لیاقت علی خاں اسمبلی میں اپنا مرتب کردہ میزانیہ پیش کرتے ہیں جو سرمایہ داروں سے چھینتا ہے اور غریبوں کی جیب بھر دیتا ہے۔ کانگرس کی سرمایہ دارانہ ذہنیت اس بجٹ کو قبول نہیں کرتی)

کانگرس کی طے شدہ پالیسی تھی کہ اقتصادی عدم مساوات ختم کر دی جاتے اور سرمایہ دارانہ سوسائٹی آہستہ آہستہ اشتراکی سماج کا روپ دھارے۔

سرمایہ داروں کی درگت

لیاقت علی خاں نے اپنا بجٹ تیار کر لیا جو نمائشی طور پر کانگرس کے اعلانات سے ہم آہنگ تھا لیکن درحقیقت نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس میں کانگرس کو اس کے کریڈٹ سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیاقت علی خاں نے ایسے بھاری ٹیکس لگائے جو ہر امیر آدمی کو بھکاری بنا دینے کے لیے کافی تھے۔ اس بجٹ کی رُو سے صنعت اور تجارت کو غیر معمولی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس بجٹ میں ایک ایسے کمیشن کا قیام بھی شامل تھا جو صنعت کاروں اور تاجروں سے تحقیقات کے بعد وہ تمام ٹیکس وصول کرتا جو انہوں نے چھپا رکھے تھے۔

لیاقت علی نے اپنے جال میں پھانس لیا

ہم خود یہ چاہتے تھے کہ تقسیم دولت زیادہ سے زیادہ مساوی بنیاد پر ہو اور ٹیکس سے بچنے والے لوگوں کو ہرگز معاف نہ کیا جائے، لہٰذا بنیادی طور پر ہمیں لیاقت علی خاں کی تجویز سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ جب انہوں نے کابینہ میں یہ مسئلہ پیش کیا تو کہا کہ اُن کی تجاویز اُن اعلانات پر مبنی ہیں جو ذمہ دار کانگرسی لیڈروں کی طرف سے ہوتے رہے تھے۔ انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ یہ اعلانات زیادہ تر جواہر لال کے تھے لیکن انہوں نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ عام احساس پر ہم نے ان سے اصولی طور پر اتفاق کر لیا۔

اقدام و احتساب کا شکنجہ

اصولی طور پر ہماری منظوری لینے کے بعد انہوں نے اقدام و احتساب کا شکنجہ تیار کیا۔ یہ اقدام و

احتساب نہ صرف انتہا پسندانہ تھا بلکہ قومی اقتصادیات کے لیے حد درجہ مہلک بھی۔ لیاقت علی کے بجٹ نے ہمارے بعض رفقاء کو غرقِ حیرت کر دیا۔ ہمارے رفقاء میں ایسے لوگ بھی تھے جو صنعت کاروں سے دلی ہمدردی رکھتے تھے، کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کا خیال تھا کہ لیاقت علی کے یہ تجاویز اقتصادی بنیاد پر نہیں سیاسی بنیاد پر مرتب کیے گئے تھے۔ (۲)

لیاقت علی بجٹ کے لیے مہلک تھا

راجگوپال اچاریہ اور خاص طور پر سردار پٹیل اس بجٹ کے سخت مخالف تھے ان کا خیال تھا کہ لیاقت علی کے پیشِ نظر ملکی مفاد اتنا نہیں ہے جتنا صنعت کاروں اور تاجروں کو خوف زدہ اور ہراساں کرنا ہے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ لیاقت علی کا اصل مقصد تاجر پیشہ طبقے کو نقصان پہنچانا ہے کیونکہ اس طبقے کی اکثریت ہندو ہے۔ کابینہ کے اجلاس میں راجہ جی نے کھلے طور پر یہ بات کہی کہ وہ لیاقت علی کے بجٹ کے مخالف ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ تجاویز فرقہ وارانہ ہیں۔ (۳)

میں لیاقت علی بجٹ کا حامی تھا

میں نے اپنے رفقاء کو بتایا کہ یہ تجاویز کانگرس کے اعلان کردہ مقاصد سے بالکل ہم آہنگ ہیں لہٰذا اصولی طور پر ہم ان کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ البتہ ان کی ہمیں اچھی طرح جانچ پڑتال کر لینی چاہیے جو تجویز ہمارے اصول کے قریب ہو اُسے مان بھی لینا چاہیے۔ (۴)

(ص ۱۶۵، ۱۶۶)

لیاقت علی نے سب کو چکر میں ڈال دیا

لارڈ ویول جا چکے ہیں، لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہو کر آ گئے ہیں، مارچ ۴۷ء)

محکمہ مالیات کی باگ مسلم لیگ کے ہاتھ میں تھی گویا نظم و انصرام کی کنجی اس کے پاس تھی۔ محکمہ مالیات میں چند نہایت قابل اور سینئر مسلم حکام موجود تھے، انہوں نے لیاقت علی کو ہر ممکن امداد دی۔ اُن کے مشورے سے لیاقت علی ہر اس تجویز کو مسترد یا موخر کر دیتے تھے۔ جو ایگزیکٹو کونسل کے کانگرسی ممبران کی طرف سے پیش کی جاتی

تھی۔ سردار پٹیل نے خود ہی یہ انکشاف کیا کہ اگرچہ وہ وزیر داخلہ ہیں لیکن لیاقت علی کی مرضی کے بغیر وہ ایک چپراسی کا تقرر بھی نہیں کر سکتے۔ کانگرسی ممبروں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کریں؟ (۵) (ص ۱۸۲، ۱۸۳)

۱۔ گاندھی جی فلسفۂ "عدم تعاون" کے موجد تھے۔ کانگرسی لیڈر خاص طور پر جواہر لال، سردار پٹیل اور راجہ جی وغیرہ اس فلسفے کے ماہر خصوصی تھے۔ جملہ کانگرسی لیڈروں کی ٹریننگ عدم تعاون سے شروع ہوتی تھی اور عدم تعاون پر ختم ہوتی تھی۔ یہ سب حضرات زندگی بھر عدم تعاون کی تلوار سے انگریزوں کو ذبح کرتے رہے لیکن لیاقت علی خاں نے جس شان سے عدم تعاون کا مظاہرہ کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ گاندھی جی سے لے کر سردار پٹیل تک سب کہہ اُٹھے:

ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلے!

مرکز کی عارضی حکومت کا آغاز ہی کانگرس نے مسلم لیگ سے عدم تعاون کی بنیاد پر کیا تھا۔ مسلم لیگ نے بھی جواب با صواب سے دریغ نہیں کیا۔ کانگرسی رفقاءِ کابینہ کی شکایات کے جواب میں لیاقت علی بجا طور پر کہہ سکتے تھے۔

جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

۲۔ لیاقت علی نے یہ میزانیہ تیار کر کے کانگرس کو بے نقاب کر دیا۔

جواہر لال غریبوں کی ہمدردی میں اور سرمایہ داروں کی مذمت میں جو کچھ پبلک اسٹیج پر کہتے رہے، لیاقت علی نے عوامی بجٹ تیار کر کے اُن کے قول کو عملی جامہ پہنا دیا۔ لیکن چونکہ یہ قول صداقت سے معرا تھا اس لیے میزانیہ جب منظر کے سامنے آیا تو معلوم ہوا عوامی ہمدردی اور سرمایہ داری کی مذمت کا طبل کانگرس جتنا بلند بانگ تھا در اصل اتنا ہی ہیچ تھا۔ بھلا جو لوگ ٹاٹا اور برلا کے مداح اور ممدوح، میزبان اور مہمان محسن اور ممنون ہوں وہ اس عوامی بجٹ کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے؟

عوام کے ساتھ کانگرس کا یہ منافقانہ رویہ اور سرمایہ داروں کے ساتھ اس نیاز مندانہ برتاؤ پر اسی ہزار صفحے کی کتاب لکھ دی جاتی، ملک کے طول و عرض میں شعلہ نوا خطیب اور آتش نوا مقرر تہلکہ مچا دیتے تو بھی وہ اس طرح بے نقاب نہیں ہو سکتے تھے

جس طرح لیاقت علی خاں کے چند ورق کے اس میزانیہ نے کر دیا۔

ذرا غور تو کیجیے "سیکولر" کانگرس عوامی بجٹ کی مخالفت اس زور شور سے کرتی ہے کہ ایوان حکومت سے باہر نکل آنے کی دھمکی دے دیتی ہے۔ مولانا آزاد سے نہ صرف انتہا پسندانہ بلکہ قومی اقتصادیات کے لیے حد درجہ مہلک بھی قرار دیتے ہیں۔

بعض دوسرے کانگرسی لیڈر نجی مجلس میں نہیں علی الاعلان فرماتے ہیں:

کہ لیاقت علی کی یہ تجاویز اقتصادی بنیاد پر نہیں سیاسی بنیاد پر مرتب کیے گئے تھے، گویا سرمایہ داروں کے چنگل سے غریب عوام کو نجات دلانا اقتصادی مسئلہ نہیں سیاسی معرکہ تھا۔

راجگوپال اچاری اور مسٹر پٹیل جوش مخالفت میں اتنے بڑھ گئے کہ فرمانے لگے۔

"لیاقت علی کے پیش نظر ملکی مفاد اتنا نہیں تھا جتنا صنعت کاروں اور تاجروں کو ہراساں کرنا۔"

اور صنعت کاروں اور تاجروں کو ہراساں کرنا صرف یہ تھا کہ جنگ کے زمانے میں ان صنعت کاروں نے اربوں روپیہ ناجائز طور پر کما کر جو سرکاری ٹیکس دبا لیا تھا وہ اگلوا لیا جاتے۔

سردار پٹیل اور راجگوپال اچاری نے آخر اپنے چہرے کا نقاب نوچ کر پھینک دیا جب یہ کہا کہ:

"لیاقت علی کا اصل مقصد تاجر پیشہ طبقے کو نقصان پہنچانا ہے کیونکہ اس طبقے کی اکثریت ہندو ہے۔"

راجہ جی نے اور زیادہ صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا:

"یہ تجاویز فرقہ وارانہ ہیں"

گویا لیاقت علی نے بجٹ اس لیے بنایا تھا کہ برلا، والمیا، سنگھانیہ کو لوٹ کر غریب مسلمانوں کی جھولیاں بھر دیں۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت پٹیل اور راجگوپال اچاری کے منہ سے وہ الفاظ نہیں نکلوا سکتی تھی جو لیاقت علی خاں کے بجٹ نے نکلوا دیے۔

۴۔ مولانا کی یہ اخلاقی جرأت واقعی قابل داد ہے کہ انہوں نے اپنے رفقاء سے

کہہ دیا گیا تھا کہ علی میزانیہ کے:

"یہ تجاویز کانگرس کے اعلان کردہ مقاصد سے بالکل ہم آہنگ ہیں لہٰذا اُصولی طور پر ہم مخالفت نہیں کر سکتے۔"

یہ دوسری بات ہے کہ مولانا کے رفقاء نے اُن کی بات نہیں مانی وہ سُن بھی نہیں سکتے تھے! بلکہ حیرت ہے کہ مولانا کی اس صاف گوئی پر کانگرس نے اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کیوں نہیں کی؟

۵- خود کردہ را علاجے نیست!

(۲۷)

قائداعظم محمد علی جناح

(۱۹۴۴ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد)

گاندھی جی کی بہت بڑی غلطی

گاندھی جی نے ایک نئی کوشش مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے اور مسٹر جناح سے ملاقات کرنے کی شروع کی۔

میرا خیال ہے اس مرحلہ پر مسٹر جناح تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش گاندھی جی کی بہت بڑی سیاسی غلطی تھی۔ ان کی اس غلطی نے مسٹر جناح کو نمایاں اہمیت دے دی جس سے بعد میں انہوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ (۱)

گاندھی جی اور مسٹر جناح

حقیقت یہ ہے شروع ہی سے مسٹر جناح کے سلسلہ میں گاندھی جی کا رویہ کچھ عجیب سا ہو رہا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب مسٹر جناح کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تو وہ اپنی سیاسی اہمیت کھو چکے تھے۔ یہ گاندھی جی کی کارروائی اور قدر دانی تھی جس کے بعد مسٹر جناح نے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں از سر نو اہمیت حاصل کر لی۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مسٹر جناح یہ منزلت کبھی نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ اگر گاندھی جی نے انہیں موقع نہ دیا ہوتا۔ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ مسٹر جناح کو اور ان کی پالیسی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ گاندھی جی مسٹر جناح کے پیچھے پیچھے گھوم رہے ہیں، ان سے ملنے کا بار بار کرتے رہے ہیں تو

بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں از سرِ نو مسٹر جناح کی عظمت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے خیال کیا کہ مسٹر جناح ہی موزوں ترین آدمی ہیں جو فرقہ وارانہ تصفیہ حسبِ دلخواہ انجام دے سکتے ہیں۔ (۲)

قائداعظم کا لقب اس جگہ میں ایک اور بات کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں، یہ کہ گاندھی جی ہی تھے، جنھوں نے مسٹر جناح کے لیے قائداعظم کا لقب خوب خوب اچھالا۔ گاندھی جی کے آشرم میں ایک سادہ مزاج اور سادہ لوح خاتون مس امتہ السلام رہتی تھیں، انھوں نے بعض اردو اخبارات میں مسٹر جناح کے لیے قائداعظم کا لقب پڑھا، جب گاندھی جی نے ملاقات کے لیے مسٹر جناح کو خط لکھا تو امتہ السلام نے کہا اردو اخبارات انھیں قائداعظم لکھتے ہیں، آپ بھی اسی لفظ سے انھیں مخاطب کیجیے اس اقدام کے اثرات و نتائج کو یکسر نظرانداز کر کے گاندھی جی نے جھٹ مسٹر جناح کو قائداعظم لکھ دیا، فوراً ہی یہ خط اخبارات میں شائع ہو گیا، جب ہندوستانی مسلمانوں نے دیکھا کہ گاندھی جی بھی مسٹر جناح کو قائداعظم کہہ کے مخاطب کرتے ہیں تو انھوں نے محسوس کیا کہ واقعی وہ قائداعظم ہی ہیں (۳)

آزادیٔ ہند اور مسٹر جناح جولائی ۴۴ء میں جب میں نے یہ رپورٹ پڑھی کہ گاندھی جی مسٹر جناح سے خط و کتابت کر رہے ہیں اور ان سے ملنے کے لیے بمبئی کا رختِ سفر باندھ رہے ہیں تو میں نے اسی وقت اپنے رفقا سے کہہ دیا کہ گاندھی جی بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ ان کے اس اقدام سے معاملہ سلجھے گا نہیں کچھ اور زیادہ الجھ جائے گا۔ مسٹر جناح نے صورتِ حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا لیکن اپنے کسی قول و عمل سے آزادیٔ ہند کے مقصد کو انھوں نے ذرا بھی تقویت نہیں پہنچائی۔ (۴)

مسٹر جناح گرفتارِ فریب نہ ہوئے (۱) کابینہ پلان والی گروپ بندی کی تجویز مسلم لیگ منظور کر چکی تھی، باوجود گاندھی جی جواہر لال اور کانگرسی لیڈر عارضی حکومت پر قابض ہونے کے بعد اس کی مخالفت کر رہے ہیں لیگ نے اس پیمان شکنی کے بعد عارضی حکومت میں شامل ہوتے ہوئے کابینہ پلان مسترد کر دیا،

---

(۱) لیگ کے استرداد نے ہمیں اضطراب میں مبتلا کر دیا، لیگ کے اعتراض کو دفع کرنے

کیے لیے۔ ۱۰ر اگست کو ہم نے ایک تجویز بھی منظور کی تھی، جس میں یہ اظہار کیا گیا کہ کابینہ مشن پلان کو مکمل طور پر ہم نے منظور کیا ہے لیکن مسٹر جناح کی اس سے تشفی نہ ہو سکی۔ انھوں نے کہا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی صاف اور واضح الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہتی کہ صوبے کابینہ مشن کے پلان کے مطابق گروپ بندی میں شریک ہوں گے۔ برطانوی حکومت اور لارڈ ویول اس حد تک مسلم لیگ سے متفق تھے۔" (۵)

مسٹر جناح کے دلائل وزنی تھے

"اہم ترین اختلاف گروپ بندی کے سلسلہ میں تھا مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ دستور ساز اسمبلی پلان کے ڈھانچے میں تبدیلی کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ گروپ بندی پلان کا ایک اہم حصہ ہے اور اس سلسلہ میں کسی طرح کی تبدیلی سمجھوتے کی خلاف ورزی ہے، اس پلان میں خود ہی یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ دستور بنانے کے بعد گروپ میں شامل کوئی صوبہ بھی اس میں شامل ہونے یا الگ رہنے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ یہ سہولت ہر صوبے کے اندیشہ کو رفع کر دیتی ہے کہ جس گروپ کے ساتھ وہ وابستہ کیا گیا ہے اس سے الگ ہو جائے۔ آسام کے کانگریسی لیڈروں کا کہنا تھا کہ دستور سے پہلے بھی ہر صوبے کو گروپ میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنا دستور جداگانہ طور پر بھی بنا سکتا ہے۔ کابینہ وفد نے اس خیال کا اظہار کیا کہ گروپ بندی کے سلسلہ میں لیگ کا موقف درست ہے۔ آسام کے کانگریسی لیڈر بہرحال اپنی روش پر اڑے رہے اور کچھ تامل کے بعد گاندھی جی نے ان کی تائید شروع کر دی۔ معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ میں یہ اعتراف کر لوں کہ مسٹر جناح کے دلائل وزنی تھے۔ ۶ر دسمبر کو برطانوی کابینہ نے ایک بیان شائع کیا، جس میں گروپ بندی کے سلسلہ میں مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی تائید کی گئی تھی لیکن اس کے باوجود مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان جو خلیج پیدا ہو چکی تھی وہ پاٹی نہیں جا سکی۔" (۶)

(ص ۱۷۴)

مولانا آزاد کی خود نوشت کے مختلف مقامات سے جو مرقع اس باب کی صورت میں تیار ہوا ہے وہ متعدد اعتبارات سے دلچسپ، سبق آموز اور قابل غور ہے۔ اس نزاعِ شدید

بحث کے بعض پہلوؤں پر گفتگو بسا ضروری اور ناگزیر ہے۔

(۱)

قائداعظم کی شخصیت کا صحیح اندازہ کر سکے اگر گاندھی جی نے بار بار ان سے ملنے اور انہیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی تو اُسے "بہت بڑی سیاسی غلطی" قرار دینے کے کچھ اسباب بھی مولانا کی منظر میں ہوں گے۔

مسٹر جناح نے جو خوب فائدے اُٹھائے وہ گاندھی جی کی نیاز مندی کے باعث نہیں، اپنے تدبر کے باعث وہ جس طرح ایک سیاستدان تھے۔ اسی طرح ماہر نفسیات بھی تھے، وہ جانتے تھے کس سے کس طرح گفتگو کرنی چاہیے، اسی چیز نے انہیں کامیاب بنایا، انہوں نے جو فائدے بھی اُٹھائے اپنے لیے نہیں اپنی قوم کے لیے اور ان کا اُٹھایا ہوا کوئی فائدہ بھی ایسا نہیں تھا، جسے اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے غلط اور ناواجب قرار دیا جا سکے۔

(۲)

ہندوستان کی سیاسی زندگی میں قائداعظم کی جو اہمیت حاصل ہوئی، اور سیاسیات ہند میں انہیں جو منزلت حاصل ہوئی نہ وہ گاندھی جی کا عطیہ تھی نہ گاندھی جی کی غلط کاری کا نتیجہ،

یہ بھی غلط ہے کہ مسلمانوں کا "بڑا" طبقہ مسٹر جناح کی پالیسی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، مسٹر جناح کے مسلک اور خیال سے اختلاف رکھنے والا ایک گروہ تو بے شک مسلمانوں میں ہمیشہ موجود رہا، اور اس گروہ کی تعداد میں کمی بیشی بھی ہوتی۔ لیکن ہندو اور مسلم رہنما بلا اختلاف جس چیز پر ہمیشہ متفق رہے، وہ مسٹر جناح کا بے داغ کیریکٹر، ان کی دیانت فکر، اصابت رائے، بے لوثی اور ان کا دلیرانہ رویہ تھا۔

یہ راقم کا چشم دید واقعہ ہے، تاج محل ہوٹل بمبئی میں ایک عصرانہ تھا، اس زمانہ میں مسز نائیڈو اکثر بمبئی میں رہتی تھیں اور ہوٹل کا ایک کمرہ ان کے لیے مخصوص تھا، عصرانہ میں زیادہ تر کانگریس کے سربرآوردہ مقامی اور غیر مقامی جو بمبئی میں اس وقت موجود تھے، یہ لیڈر شریک تھے۔

مسز نائیڈو ایک بلند آہنگ خطیبہ، ایک شاعرہ شیریں نوا اور کانگریس کی ایک

وقت رہنما کی حیثیت سے مشہور تھیں، سب ان کا بڑا ادب لحاظ کرتے تھے، لیکن جب کسی محفل میں پہنچ جاتی تھیں، سب کا مذاق اڑاتی تھیں، حاضر و غائب [illegible] کا ایسا خاکہ بھی محفلوں میں کھینچتی تھیں کہ بس ـــ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی [illegible] یہ ہے کہ گاندھی جی تک ان کے طنز لطیف کے تیروں سے نہیں بچتے تھے ـ باتوں باتوں میں مسٹر جناح کا ذکر چل نکلا، مخالفانہ اور معاندانہ رنگ میں، کیونکہ [illegible] میں ان کا ہمنوا شاید ایک ہی آدمی تھا، مخالف سب تھے ـ

دفعۃً مسز نائیڈو چپ ہو گئیں، ان پہ سنجیدگی طاری ہو گئی، انہوں نے کہا:

"جناح کے بارے میں جو چاہو کہو، لیکن یاد رکھو، وہی ایسا شخص ہے جو خریدا نہیں جا سکتا!"

گاندھی جی اس حقیقت کے رمز شناس تھے، زیادہ صحیح حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی قائد اعظم کے کردار و سیرت سے مرعوب تھے، وہ جانتے تھے یہ وہ شخص ہے جس نے بمبئی کے قہار اور جبار گورنر لارڈ ولنگڈن سے اس وقت ٹکر لی اور رو در رو اسے ایسی ایسی سنائیں اور شیرف آف بمبئی کے خلاف [illegible] کو اپنی نو مسلم بیوی کی رفاقت میں اس شان سے ٹاؤن ہال میں گھس کر مخالفوں [illegible] سپاہیوں کی مار کھا کر درہم برہم کر دیا، جب کسی معمولی انگریز سارجنٹ کے سامنے بڑے بڑے ہندوستانی سورماؤں کا پتہ پانی ہوتا تھا، وہ جانتے تھے، وہ جناح تھا جس نے ہوم رول کی تحریک اس شد و مد سے چلائی کہ تنزلنل [illegible] کسری [illegible] یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے انہی شاندار اور لازوال کارناموں کی یادگار وہ "جناح میموریل ہال" ہے جو کانگرس نے اپنے صرف سے تعمیر کرایا تھا،

اور جس کی تعمیر کے بعد مسز نائیڈو نے مسٹر جناح کو جو لندن میں تھے تار دیا تھا

"تمہاری زندگی ہی میں قوم نے اس کی قدر پہچان لی!"

یہ وجہ تھی کہ گاندھی جی اس کے پیچھے پیچھے گھومتے تھے، ورنہ مولانا بھی اس [illegible] سے واقف ہیں کہ گاندھی جی وہ بت بے پیر تھے جنہوں نے محمد علی جیسے گاندھی ساز، شوکت علی جیسے مسیحائے کانگرس، [illegible] کانگرس سے یک چشم زدن رشتہ توڑ لیا [illegible]

ایک بار انہوں نے کہہ دیا تھا کہ آپ سے نباہ نہیں ہو سکتا، استعفا دے دیجیے، (تفصیل کسی دوسری جگہ موجود ہے) بھلا ایسا شخص خواہ مخواہ مسٹر جناح کے پیچھے پیچھے گھوم سکتا تھا؟

اور مولانا نے یہ بڑی دلچسپ اور عجیب و غریب بات کہی کہ.

"گاندھی کو مسٹر جناح کا تعاقب کرتے دیکھ کر بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں از سر نو مسٹر جناح کی عظمت پیدا ہو گئی!"

جو مسلمان گاندھی جی کے اتنے عقیدت مند تھے کہ ان کی وجہ سے مسٹر جناح کی عظمت کرنے لگے، انہوں نے براہ راست گاندھی جی کے سامنے سر عقیدت کیوں نہیں جھکا دیا۔ مولانا نے شاید یہ کہتے وقت یہ نہیں سوچا کہ وہ کتنی مہمل بات ارشاد فرما رہے ہیں؟ اس سے یہی نتیجہ تو نکلتا ہے کہ گاندھی جی کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ نے مسٹر جناح کو زعیم کبیر مانا اور مسٹر جناح کی وجہ سے گاندھی جی سے منحرف ہو گئے، مولانا کی قدیم و جدید منطق پر گہری نظر تھی۔ ان کے یہ ارشاد کس منطق کی ذیل میں آتا ہے؟ یہ وہی بتا سکتے تھے۔

(۳)

گاندھی جی نے مسٹر جناح کو "قائد اعظم" اس لیے لکھا تھا کہ وہ چاہتے تھے، قائد اعظم اپنے مراسلات میں انہیں "مسٹر" کے بجائے مہاتما لکھا کریں، اپنے ایک خط میں گاندھی جی نے ان الفاظ میں "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کا منظر پیش بھی فرمایا تھا لیکن قائد اعظم نے یہ کہہ کر انہیں ساکت کر دیا۔

"گلاب کے پھول کو جس نام سے بھی پکارو، وہ گلاب کا پھول ہی رہے گا!"

(۴)

قائد اعظم کی پہلی اور آخری شرط یہ تھی کہ تم مسلمانوں کی انفرادیت تسلیم کر لو، ان کا حق خود ارادیت مان لو، اس کے بعد مسلمانوں کی جیب کی آخری پائی اور خون کا آخری قطرہ آزادی ہند کی راہ میں لے لو، مسلمانوں سے صلح کیے بغیر بظاہر انگریزوں سے لڑتے ہو لیکن حقیقتاً مسلمانوں سے برسر پیکار ہو، مسلمان اتنے سادہ لوح نہیں کہ اس جنگ زرگری میں کسی فریق کا بھی ساتھ دے کر اپنا نقصان کریں، اگر دیانتداری

کے ساتھ مسلمانوں کی خیر سگالی اور تعاون کے متمنی ہو تو ان کے جائز اور مبنی بر انصاف مطالبات تسلیم کرو، لیکن ان کے مطالبات تسلیم کیے اور انہیں مطمئن کیے بغیر آزادی کا نام لے کر انہیں دھوکا نہیں دے سکتے کم از کم وہ دھوکا نہیں کھا سکتے۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ الفاظ کے طلسم میں اسیر ہو کر سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تھے، لیکن اب وہ دور ختم ہو گیا۔ اب وہ حقیقت پسند ہیں اور اپنے مطالبہ میں اتنے ہی سخت اور بے لچک جتنے تم خود ہو

(۵)

قائد اعظم کا یہ اعتراض اتنا وزنی تھا کہ اس کا کوئی جواب نہ کانگرس سے بن سکا نہ عمائدین کانگرس، مولانا آزاد، اور نہ فدایان کانگرس، گاندھی جی، جواہر لال اور [illegible] پٹیل۔

قائد اعظم کھرے اور بے لاگ آدمی تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ یعنی مکمل طور پر کانگرس کابینہ اسکیم کو تسلیم کرتی ہے تو اقرار کرے کہ وہ صوبائی گروپ بندی کو بھی تسلیم کرتی ہے اور دستور ساز اسمبلی بن جانے کے بعد اس موقف سے انحراف نہیں کرے گی۔ لیکن یہ اعتراف نہ کرنا اور منظوری کی رٹ لگاتے جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ کانگرس یہ مکمل ذہنی تحفظ کے ساتھ اس اسکیم کو منظور کرتی ہے اور موقع پاتے ہی [illegible] کا سلسلہ شروع کر کے اپنے اس موقف پر آ جائے گی کہ ہم گروپ بندی کو تسلیم نہیں کرتے چنانچہ آخر وقت تک کانگرس نے گروپ بندی کو تسلیم نہیں کیا۔

کتنی عجیب بات تھی کہ آسام جیسے چھوٹے سے صوبہ کے لیے جس کی آبادی چند لاکھ نفوس سے زیادہ نہیں، کانگرس عارضی طور پر بھی بہ جبر [illegible] طور پر گروپ بندی میں اس کی شرکت برضا [illegible] نہیں تھی، صرف اسی لیے متحدہ ہندوستان سے دستبردار ہو کر منقسم ہندوستان قبول کرنے پر باہزاراں حسرت والم اسے مجبوراً ہونا پڑا، لیکن مسلم ہندوستان کو جس کی تعداد ۹ کروڑ کے لگ بھگ تھی، عارضی طور پر نہیں مستقل طور، ہندوستان میں شرکت کرنے پر مجبور کر رہی تھی جو حق اس نے آسام کو دیا تھا وہ حق آج تک اس نے ۱۲ سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی کشمیر کو نہیں دیا۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی جواب ہے اس اصول پرستی کا؟

(۶) مولانا آزاد نے کہیں تو قائد اعظم کے دلائل میں وزن محسوس کیا۔! شکریہ،

متفق گردید رائے بوعلی با رائے من

لارڈ ماؤنٹ بیٹن

مسٹر اٹیلی کا ہدایت نامہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جنگ کے زمانہ میں شہرت حاصل کی، چند ماہ تک وہ ہندوستان میں رہے، پھر اپنا ہیڈ کوارٹر سیلون میں منتقل کر لیا، جب جنگ ختم ہوئی وہ برطانیہ چلے گئے، پھر لارڈ ویول کے مستعفی ہونے کے بعد ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ وہ مسٹر اٹیلی کی اس واضح ہدایت کے ساتھ آئے کہ تیس جون ۴۸ء تک انتقال اختیارات کی کارروائی مکمل ہو جائے۔

کوئی حل پیدا کرو ماؤنٹ بیٹن ۲۲ مارچ کو دہلی پہنچے، ۲۴ مارچ کو انہوں نے ایک مختصر سی تقریر کی، جس میں اس بات پر زور دیا کہ چند ماہ کے اندر کوئی نہ کوئی حل پیدا ہو جانا چاہیے۔

ماؤنٹ بیٹن سے میری پہلی ملاقات اس تقریب کے بعد میں پہلے پہل لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا۔ اس ملاقات میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ برطانوی حکومت انتقال اختیارات کا تہیہ کر چکی ہے، انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ایک آخری اور فیصلہ کن کوشش اس دشواری کو حل کرنے کی ضرور کرنی ہوگی۔

نا اتفاقی ابتر تھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے متعدد بار مجھے ملنے کا موقع ملا، میں نے

محسوس کیا کانگرس اور لیگ کے اختلافات ایسے مرحلے پر پہنچ گئے ہیں کہ اب صرف ثالثی ہی سے مسئلہ طے ہو سکتا ہے میری رائے یہ تھی کہ گروپ بندی کا مابہ النزاع مسئلہ ہم لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر چھوڑ دیں لیگ اور کانگرس ان کا فیصلہ تسلیم کر لیتی لیکن اس تجویز سے نہ جواہر لال نے اتفاق کیا، نہ سردار پٹیل نے گاندھی جی نے بھی اس تجویز پر زیادہ زور نہیں دیا۔

حالات نازک تر ہونے لگے اس اثنا میں روز بروز حالات نازک تر ہوتے جاتے تھے۔ کلکتہ کے بعد نواکھالی اور بہار جو رنجیدگی بعد ازاں پنجاب فرقہ وارانہ ہنگامہ آرائیوں کا مرکز بن گئے۔ ۲۰ مارچ کو پنجاب کی وزارت عظمیٰ سے خضر حیات خاں نے استعفیٰ دے دیا۔ ۴ مارچ کو لاہور میں پاکستان کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے۔ ۱۲ آدمی ہلاک اور بہت سے مجروح ہوئے۔ بہت جلد فرقہ وارانہ جھگڑے صوبے کے دوسرے مقامات تک پھیل گئے۔ خاص طور پر امرتسر، ٹیکسلا اور راولپنڈی میں۔

نظم مملکت کی بربادی ایک طرف فرقہ وارانہ جذبات انتہا کو پہنچے ہوئے تھے دوسری طرف نظم حکومت برباد ہو رہا تھا۔ یورپین سرکاری ملازمین کا دل کام سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ صرف وقت گزاری کر رہے تھے۔ ایگزیکٹو کونسل میں مسلم لیگ اور کانگرس کے تعطل نے حالات زیادہ خراب کر دیے تھے، مرکزی حکومت مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔

(ص ۱۸۱ تا ۱۸۲)

محکمہ مالیات کی وجہ سے تقسیم کا پودا بڑھا کانگرس نے مسلم لیگ کو محکمہ مالیات سونپ کر بہت بڑی غلطی کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حالات نے بڑی افسوسناک صورت اختیار کر لی۔ اس جمود نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو تقسیم ہند کے لیے فضا ہموار کرنے میں بڑی مدد دی۔(۱)

(ص ۱۸۳)

سردار پٹیل کو ماؤنٹ بیٹن نے رام کر لیا لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جس بات نے سردار پٹیل پر اثر ڈالا وہ

یہ بھی کو صرف مسلم لیگ کے اعتراضات رفع کرنے کے لیے کانگرس ایک کمزور مرکز پر رضامند ہو گئی ہے، اور صوبوں کی مکمل اندرونی آزادی اس نے تسلیم کر لی ہے۔ لیکن ایک ایسا ملک جو زبان، فرقہ اور تہذیب کے لحاظ سے پہلے ہی سے منقسم ہو وہ ایک کمزور مرکز کا حامل ہو گا، ضرور افتراق انگیز رجحان کی حوصلہ افزائی کا موجب ہو گا۔ لیکن اگر مسلم لیگ میدان سے ہٹ جائے تو ہم ایک مضبوط مرکزی حکومت کا نقشہ بنا سکتے ہیں، ہم ایسا دستور بنائیں گے جو وحدت ہند کے لحاظ سے پسندیدہ ہو گا، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ بہتر صورت یہ ہے کہ زمین کا ایک چھوٹا سا رقبہ شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلم لیگ کو دے دیا جائے اور پھر ہم ایک متحدہ ہندوستان کی بنیاد استوار کریں، سردار پٹیل ان باتوں سے بہت متاثر ہوتے و یہی نہیں جواہر لال بھی، سردار پٹیل نے اپنے بیانات میں ان دلائل کو دہرایا بھی (؟)

(ص ۱۸۶، ۱۸۸)

ماؤنٹ بیٹن کا جھوٹ

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کی اسکیم کر لی، اسکیم منظور کرانے کے لیے انہوں نے لندن جانے کا فیصلہ کر لیا میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ تقسیم ملک کے نتائج کو وہ اپنے سامنے رکھیں، ابھی تقسیم عمل میں نہیں آئی ہے۔ لیکن کلکتہ، نواکھالی، بہار، بمبئی اور پنجاب میں خونریزی کا دور دورہ ہے، ہندو مسلمان پر اور مسلمان ہندوؤں پر حملے کر رہے ہیں، اس فضا میں اگر ملک تقسیم ہوا تو ملک کے مختلف اطراف میں خون کے دریا بہنے لگیں گے اور اس کی ذمہ داری صرف انگریزوں پر ہو گی۔

ایک لمحہ بھی تامل کئے بغیر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا میں آپ کو قطعی یقین دلاتا ہوں کہ ایک قطرہ خون بھی نہیں گرنے دوں گا، نہ فساد ہونے دوں گا، میں ایک سپاہی ہوں، ایک مرتبہ جب تقسیم کا اصول طے پا گیا میں فوراً ہی احکام نافذ کر دوں گا کہ ملک کے کسی مقام پر بھی فرقہ وارانہ گڑبڑ نہ ہونے پائے، میں بحری اور ہوائی فوج کو حکم دوں گا کہ وہ برسرِ عمل ہو جائے، میں ٹینک اور طیارے استعمال کر دوں گا تاکہ ہر وہ شخص کچل دیا جائے جو ذرا بھی فساد کرنا چاہے۔"

ساری دنیا جانتی ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس دلیرانہ اعلان کا انجام کیا ہوا جب واقعی طور پر تقسیم ہند عمل میں آگئی تو ملک کے بڑے حصے میں خون کی ندیاں بہنے

گئیں، معصوم مردوں، بچوں اور عورتوں کا قتل عام کیا گیا اور کوئی مؤثر قدم بے گناہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو قتل و ہلاکت سے بچانے کے لیے نہیں اُٹھایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہ خیال کرنے پر مجبور ہوں کہ لارڈ ویول کی رائے درست تھی۔ (۳)

(ص ۱۸۹، ۱۹۰)

آزادیٔ ہند کی قیمت

لارڈ ماؤنٹ بیٹن برطانوی حکومت سے تقسیم ہند کی اسکیم منظور کرا کے ۳۰ مئی کو دہلی واپس آ گئے۔ ۲ جون کو نمائندگان لیگ و کانگرس سے انہوں نے گفتگو کی۔ ۳ جون کو تقسیم ہند کی تفصیلات کے ساتھ قرطاس ابیض شائع ہو گیا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے بدترین اندیشے واقعہ بن گئے۔ آزادیٔ ہند کی قیمت دو حکومتوں میں ہندوستان کی تقسیم تھی۔ (ص ۹۱)

ہندو فوجیوں کے کارنامے

(اگست ۱۹۴۷ء، ہندوستان تقسیم ہو چکا ہے)

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے غصّے کے لہجے میں کم، اور افسوس کے لہجے میں زیادہ مجھ سے کہا کہ مشرقی پنجاب میں فوج کے ہندو ممبر مسلمانوں کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن انگریز افسروں نے بدقت تمام انہیں اس سے باز رکھا۔ (۲۴)

(ص ۲۰۲)

قائداعظم کے گورنر جنرل ہونے پر حیرت

("تقسیم ہند کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں مملکتوں میں گورنر جنرل کون ہو؟")

ہمارا فیصلہ یہ تھا کہ فوری تغیر بہتر نہیں ہو گا۔ ہم نے محسوس کیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا تقرر پالیسی اور نظم و انصرام کی یکسانیت میں مدد دے گا۔ عام خیال یہ تھا کہ پاکستان کا انتخاب بھی یہی ہو گا۔

ہم نے اعلان کر دیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہمارے پہلے گورنر جنرل ہوں گے، ہمیں توقع تھی کہ لیگ بھی انہیں کو منتخب کرے گی، لیکن لیگ کے اس اعلان نے ہم سب کو

حیرت زدہ کر دیا کہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مسٹر جناح ہوں گے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جیسے ہی یہ خبر سنی انہوں نے ہم سے کہا کہ اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ ان کی تجویز تھی کہ ہم اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں اور کسی ہندوستانی کو گورنر جنرل بنا دیں، لیکن ہمیں اپنا فیصلہ بدلنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہ آئی۔ ہم اپنے اس اعلان پر قائم رہے کہ انڈین ڈومینین کے پہلے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی ہوں گے۔ (۵)

(ص ۲۰۶، ۲۰۵)

(۱)

جو کام دلائل و براہین سے، افہام و تفہیم سے، عرض و التجا سے نہ ہو سکا، وہ لیاقت علی کے ہاتھ میں محکمہ مالیات آنے سے چٹکی بجانے میں سرانجام پا گیا۔ بعض بڑے بڑے تاریخی حوادث کا پس منظر کتنی معمولی سی بات بن جاتی ہے:

(۲)

لیکن آزادی کے بعد کے گجرات کا خونیں ہنگامہ، مرہٹہ اسٹیٹ کا مطالبہ، پنجابی صوبہ کے قیام پر اصرار، جنوبی ہند کی اندھرا، اور کیرالہ کی صورت میں تقسیم، ماؤنٹ بیٹن اور پٹیل کی خوش فہمی کا مایوس کن جواب ہے۔

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

(۳)

ماؤنٹ بیٹن نے امن و امان قائم رکھنے کا وعدہ محض مولانا کے پاس خاطر سے کر دیا تھا ورنہ ان کا ارادہ وہی تھا جو انہوں نے کیا، یعنی کچھ نہیں کیا۔
جب لارڈ ویول اور خود مولانا تو بھلا پٹیل کے سامنے ویول کی اور گاندھی جی، جواہر لال پٹیل کے سامنے مولانا کی کیا چل سکتی تھی

حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

(۴)

بے شک انگریز افسروں نے فوج کے ہندو ممبروں کو مسلمانوں کے قتل سے باز رکھا ہوتا

لیکن گلیاں کہیں ورنہ بھارت کی راجدھانی دہلی ہے جہاں ان ہندو غنڈوں نے مسلمانوں کو جس
طرح کچلا اور غارت کیا اس کے شاہد عینی خود مولانا بھی ہیں۔

قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

(۱۰)

اگر مسلم لیگ کانگرس کے جال میں پھنس گئی ہوتی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس نے اپنا
پہلا گورنر جنرل بنایا ہوتا تو واقعی پاکستان ختم ہو جاتا۔ ریڈکلف نے تو صرف نشتر لگایا
تھا، ماؤنٹ بیٹن کند چھری سے پاکستان کو ذبح کر دیتے۔ قائداعظم کے تدبر کا یہ نتیجہ
ہے کہ وہ اس دام ہمرنگ زمین میں گرفتار نہیں ہوسکے۔

مسٹر ایم این رائے

(صدر کانگرس کا انتخاب سنہ ۳۹ء)

میرا حریف ناکام

"کانگرس کے منصب صدارت کے لیے مقابلہ حقیقی نوعیت کا نہیں تھا، میرے مقابلہ میں مسٹر ایم این رائے کھڑے ہوئے تھے جو غیر معمولی اکثریت سے ناکام ہوئے۔"

(ص ۳۱)

کمیونسٹوں کی پُر فریب تکنیک

جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو کمیونسٹ نقصان میں تھے۔ کیونکہ اسٹالن اور ہٹلر نے باہمی طور پر غیر جارحانہ معاہدہ کر لیا تھا۔ کمیونسٹ نازی سوویٹ معاہدہ سے پہلے تک ہٹلر پر حملہ کرنے میں اور نازی فلسفۂ حیات کی برائیاں کرنے میں پیش پیش تھے۔ ہندوستان کے کمیونسٹ دل میں اس حقیقت کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ اسٹالن نے یہ معاہدہ کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے لیکن دنیا کے دوسرے کمیونسٹوں کی طرح انہیں بھی اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ اپنے اختلافات کا اظہار کر سکیں لہٰذا انہوں نے اس معاہدہ کو جنگ کی وسعت محدود کرنے کی ایک کوشش قرار دیا۔ جسے یہ اب تک امپیریلزم کی جنگ کہتے چلے آتے تھے۔ اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کر کے انہوں نے کہنا شروع کر دیا۔ شہنشاہیت پسندوں کے مقابلہ میں یہ ایک چھوٹی برائی

جسے ادا کر لینا چاہیے۔ اس نقطۂ نظر کے ماتحت انہوں نے اتحادیوں کی کوئی مدد نہیں کی اور مساعیٔ جنگ کے سلسلہ میں ہندوستان کی غیر جانبداری کی پرزور تائید کرتے رہے لیکن جب ہٹلر نے روس پر حملہ کر دیا تو کمیونسٹوں نے ایک زبردست قلابازی کھائی انہوں نے اس جنگ کو قومی جنگ کا نام دیا اور دل و جان سے برطانیہ کی امداد و تعاون میں سرگرم کار ہو گئے۔

کمیونسٹ برطانیہ کی گود میں چلے گئے ہندوستان میں کمیونسٹوں نے علانیہ جنگی پروپیگنڈہ میں حصہ لینا شروع کر دیا اور مساعیٔ جنگ میں برطانیہ کی ہر طرح سے امداد کی۔

روپیہ بھی وصول کیا مسٹر ایم این رائے نے علانیہ حکومت سے روپیہ وصول کیا اور جنگ کی تائید میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مختلف طریقوں سے کمیونسٹوں نے حکومت کی امداد حاصل کی، اب تک کمیونسٹ پارٹی پر جو پابندی عائد تھی، وہ اٹھا لی گئی اور یہ لوگ جنگ کی تائید و حمایت میں پروپیگنڈہ کرنے لگے۔

کمیونسٹوں کی موقع پرستی کانگرس نے جب ہندوستان خالی کر دو کی تحریک شروع کی تو بہت بڑی تعداد میں کانگرسی کارکن گرفتار کر لیے گئے اور کمیونسٹ جو پہلے گرفتار یا روپوش تھے، اپنی پارٹی کا پرچم لے کر میدان میں آ گئے۔ (ص ۱۳۲)

ڈاکٹر سید محمود

ایک غیر متوقع حادثہ (جون ۴۴ء کا آغاز قلعہ احمد نگر کا جیل)

ایک غیر متوقع حادثہ اسی دوران میں پیش آیا، ایک روز چیتیا خاں آیا، اور اس نے کہا کہ اُسے ڈاکٹر سید محمود کو رہا کر دینے کا حکم ملا ہے۔ ہم سب کو یہ خبر سن کر حیرت ہوئی، ہم میں سے کسی کی سمجھ میں بھی یہ بات نہ آئی کہ آخر اس سلوک میں وہ منفرد کیوں ہیں؟

ہیضہ پھوٹ پڑنے کا اندیشہ

چند ماہ پہلے احمد نگر میں وبائی طور پر ہیضہ پھوٹ پڑنے کا خطرہ پیدا ہو گیا، چیتیا خاں نے مشورہ دیا کہ ٹیکہ لگوا لیں، ہم میں سے پانچ — جواہر لال، پٹابھی سیتارامیہ، آصف علی، ڈاکٹر سید محمود اور میں، اس کے مشورے پر عمل پیرا ہوئے باقی چار، سردار پٹیل، اچاریہ کرپلانی، شنکر راؤ دیو اور ڈاکٹر پرفلا گھوش، اپنے ضمیر کے خلاف ٹیکا لگوانے پر رضامند نہ ہو سکے

بیماری کے زمانہ میں کیوں رہا نہ ہوئے

ٹیکے کے ردِ عمل کے طور پر مجھے خفیف سی حرارت ہو گئی لیکن ڈاکٹر سید محمود طبعاً ٹیکے کے خلاف زیادہ حساس تھے لہٰذا انہیں تقریباً پندرہ روز

تک بخار نے خوب خوب جھنجھوڑا، ہم سب ان کی صحت کے بارے میں فکرمند تھے اور جواہر لال اپنی طبعی دوست داری اور اخلاص کے باعث نرس کے فرائض انجام دینے لگے۔ ان کے مسوڑھوں سے جریانِ خون کی شکایت قائم رہی۔

رہائی کے وقت تندرست تھے چیتا خاں ان کے معالج تھے۔ جب ان کی رہائی عمل میں آئی تو وہ بالکل تندرست ہو چکے تھے لہٰذا اس رہائی کا سبب ان کی علالت بھی نہیں قرار دی جا سکتی تھی۔

رہائی کی اصل علّت ہمارا خیال تھا کہ شاید حکومت کی طرف سے تبدیلی کرنے کی یہ ایک علامت ہے، وہ اب نرم رویہ اختیار کرنا چاہتی ہے، اسی لیے اس نے ڈاکٹر محمود کو رہا کر دیا، بعد میں اس رہائی کی اصلی علّت مجھے معلوم ہوئی لیکن اب اتنے سال بعد میں سمجھتا ہوں کہ اس ناخوشگوار حادثہ کی تفصیلات میں جانا غیر ضروری سا ہے (۱)

(ص ۹۵، ۹۶)

(۱۹۴۶ء کے عام انتخابات کے بعد وزارت سازی کا مرحلہ!)

تشکیلِ وزارت کے سلسلہ میں جب میں بہار پہنچا تو مختلف کانگرسی گروہوں کی باہمی رقابت نے صورتِ حالات پیچیدہ کر رکھی تھی، مزید مصیبت یہ تھی کہ بعض سربرآوردہ کانگرسیوں کا باہمی ذاتی عناد بھی اپنا کام کر رہا تھا۔ ڈاکٹر سری کرشنا سنہا اور ڈاکٹر انوگرا نرائن سنہا کی دیرینہ اور مزمن رقابت بھی نقطۂ عروج پر تھی۔ ایک اہم سوال ڈاکٹر سید محمود کا بھی درپیش تھا۔ بعض کانگرسی قلعہ احمد نگر کی جیل سے پُراسرار رہائی کے باعث ان کے سخت مخالف تھے، بہرحال آخر کار یہ تینوں اصحاب شریکِ وزارت کر لیے گئے۔ (۲) (ص ۱۲۷)

۱۔ مولانا کے ایک دوسرے بیان کے مطابق جب احمد نگر کی مدّتِ اسیری دراز سے دراز ہوتی گئی تو سید محمود نے فال سے دلچسپی لینی شروع کی اور ایک مرتبہ فال دیکھنے کے بعد انھوں نے لارڈ ویول کو خط لکھ دیا کہ میں درحقیقت کانگرس ورکنگ کمیٹی سے

مستعفی ہو چکا تھا لیکن قبل اس کے کہ میرے استعفیٰ کا اعلان ہوتا، میں گرفتار کرلیا گیا۔ یہ انصاف نہیں ہے۔

لارڈ ویول نے رہائی کا فرمان صادر کردیا۔ ڈاکٹر صاحب بمبئی تشریف لائے۔ اخبارات نے یہی سمجھا اور لکھا کہ ڈاکٹر صاحب کی رہائی خرابی صحت کی بنا پر عمل میں آئی ہے۔ نمائندگان اخبارات خیریت مزاج دریافت کرنے پہنچے، یہ اپنی خیریت کا حال بتلاتے رہے۔

لیکن حکومت کانگریس کو رسوا کرنے کا کوئی موقع اس وقت ہاتھ سے دینا نہیں چاہتی تھی۔ ڈاکٹر محمود کے بارے میں جب بمبئی کرانیکل اور ٹائمز آف انڈیا وغیرہ نے یہ رپورٹ شائع کی کہ خرابی صحت کی بنا پر رہا کیے گئے ہیں تو فوراً حکومت ہند نے ایک کمیونکے شائع کرکے "پُراسرار رہائی" کا راز فاش کردیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمود بمبئی نہیں ٹھہرے سیدھے پٹنہ پہنچ کر دم لیا۔

۲۔ ظاہر ہے اس حرکت سے کانگریسی ہندوؤں کا خفا ہونا بالکل طبعی تھا لیکن کانگریس کو اس جنس نایاب ___ مسلمان ___ کی ضرورت بھی تھی، لہٰذا اگر محمود صاحب کانگریس سے خارج کردیے جاتے تو کم از کم بہار کی حد تک وہ کہہ سکتے تھے۔

ہم اٹھ گئے تو کیا ترا محفل میں رہ گیا؟

لہٰذا گاندھی جی کی لیپ پوت اور مولانا کی مہربانی سے انہیں وزارت عارضی طور پر مل گئی؛ اور بات دب گئی اور اب "پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں!"

---

(۳۱)

بیچارہ نریمان

کانگرس کی فرقہ پرستی اس موقعہ پر اصولوں میں کانگرس کے وزارت قبول کر لینے کے موقعہ پر، ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جس نے صوبائی کانگرس کمیٹی (بمبئی) کے طرزِ عمل کے بارے میں ایک ناخوشگوار فضا پیدا کر دی، کانگرس نے ایک قومی تنظیم کی حیثیت سے نشو ونما کے مراحل طے کیے تھے اس نے مختلف قومیتوں کے افراد کو حصول قیادت کے یکساں مواقع بہم پہنچائے تھے، بمبئی میں مسٹر نریمان، مقامی کانگرس کے تسلیم شدہ زعیم تھے، جب صوبائی حکومت کی تشکیل کا سوال پیدا ہوا تو مسٹر نریمان کے مرتبہ اور خدمات کے پیش نظر عام توقع یہی تھی کہ وہی وزارت کی تشکیل کریں گے، لیکن بہرحال ایسا نہیں ہوا۔ سردار پٹیل اور ان کے رفقاء نریمان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر بی، جی کھیر، ہندو، عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ نریمان فرقہ دارانہ بنیاد پر نظر انداز کر دیئے گئے یہ الزام اگر صحیح نہ ہو تو بھی اسے غیر مدلل قرار دینا آسان نہیں ہے۔ (۱)

جواہر لال نے اپیل مسترد کر دی اس فیصلہ نے مسٹر نریمان کو حواس باختہ کر دیا، انہوں نے کانگرس ورکنگ کمیٹی میں یہ سوال چھیڑا، جواہر لال اب تک صدر کانگرس تھے اور بہت سے لوگوں کو امید تھی کہ چونکہ وہ فرقہ وارانہ ذہنیت سے آزاد ہیں، لہٰذا آسانی سے اس ناانصافی کا تدارک

کر دیئے گئے جو نریمان کے ساتھ روا رکھی گئی ہے۔ بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا، جواہر لال بہت سے معاملات و مسائل میں پٹیل سے مختلف رائے رکھتے تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ سردار پٹیل کا یہ فیصلہ بہر حال صرف فرقہ وارانہ بنیاد پر نہیں ہو سکتا اس سلسلہ میں ان کا رویہ غیر ہمدردانہ تھا۔ انہوں نے نریمان کی اپیل مسترد کر دی۔ (۲)

گاندھی جی کے دربار میں جواہر لال کے طرزِ عمل نے نریمان کو متحیر کر دیا۔ اب وہ گاندھی جی کے پاس پہنچے اور کہا میں اپنا معاملہ آپ کو سونپتا ہوں، گاندھی جی نے صبر و تحمل کے ساتھ نریمان کی باتیں سنیں اور ہدایت کی کہ سردار پٹیل کے رویہ کی تحقیقات کسی غیر جانبدار شخص کے سپرد کی جائے۔

پٹیل تحقیقات میں رکاوٹ بن گئے چونکہ نریمان ایک پارسی تھے، سردار پٹیل اور ان کے رفقا نے تجویز پیش کی کہ تحقیقات کا کام کسی پارسی کو سونپا جائے۔ ان لوگوں نے بڑی ہوشیاری سے اپنا کیس تیار کیا، لیکن اس طرح مسئلہ اور زیادہ الجھ گیا۔ علاوہ ازیں ان حضرات نے مختلف طریقوں سے اپنا اثر و رسوخ بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا تاکہ بیچارہ نریمان تحقیقاتی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی اپنا کیس ہار جائے۔

نریمان کی پبلک زندگی ختم ہو گئی واضح طور پر یہ ثابت کرنا مشکل تھا کہ نریمان کو صرف پارسی ہونے کی وجہ سے نظر انداز کیا گیا لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ سردار پٹیل کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا۔ بیچارہ نریمان دل شکستہ ہو گیا اور اس کی پبلک زندگی ختم ہو گئی۔ (۳)

(ص ۱۵، ۱۶)

کانگریس کی پبلک زندگی ہو گئی بہر حال ایک حقیقت میں واضح کر دینا چاہتا ہوں پراونشل مرکزی کمیٹی بمبئی نے مسٹر نریمان کی مسٹر نریمان کی مقامی قیادت قبول کرنے سے انکار کر کے غلطی کی اور مرکزی ورکنگ کمیٹی اتنی مضبوط نہ تھی کہ وہ اس غلطی کا تدارک کر سکتی۔ (۴)

(ص ۲۱)

"نریمان کا واقعہ کانگریس کے کٹر ہندو جماعت ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے

جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے، میں بمبئی کا مستقل مکین تھا اور روزنامہ خلافت کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے بمبئی کے خلافتی، کانگرسی اور لیگی حلقوں کے حالات سے براہِ راست مجھے واقفیت تھی۔

مسٹر نریمان گو پارسی تھے لیکن اپنا سب کچھ انہوں نے کانگرس پر قربان کر دیا تھا۔ ہزارہا روپیہ ماہوار کی پریکٹس ترک کر کے کانگرس کے لیے وقف ہو گئے۔ بارہا جیل گئے۔ پولیس کی لاٹھیاں کھائیں، طرح طرح کے مصائب برداشت کیے۔ جب کا طبقہ خواص اور سرمایہ دار گروہ انگریزوں کا نیاز مند تھا اور کانگرس سے بے تعلق، یہ نریمان اور عابد علی جعفر بھائی اور یوسف مہر علی تھے جنہوں نے بمبئی کے عوام میں کانگرس کی ساکھ پیدا کی، جب کبھی سول نافرمانی کا موقع پیش آیا، بمبئی کے عوام قید و بند کے مرحلہ میں پیش پیش رہے۔ پولیس کی لاٹھیاں کھانے میں کسی صوبہ سے پیچھے نہیں رہے۔ جب کبھی کانگرس کا کوئی سیشن یا جلسہ ہوا و ران کے رفقا نے اتنے شاندار انتظامات کیے کہ مخالف تک دنگ رہ گئے۔

صوبائی وزارت قبول کرنے پر جب کانگرس آمادہ ہوئی تو اصول یہ تھا اور یہی صحیح بھی تھا کہ اگر صوبہ کانگرس کا صدر، اسمبلی کا ممبر منتخب ہو جاتے تو وہی کانگرس پارلیمنٹری پارٹی کا لیڈر ہو گا اور پارلیمنٹری تعامل یہ ہے کہ جو شخص ایوان کی سب سے بڑی پارٹی کا لیڈر ہو، اسی کو تشکیل وزارت کی دعوت دی جاتی ہے۔

نریمان کئی سال سے بمبئی صوبہ کانگرس کے صدر چلے آ رہے تھے، کسی بڑے سے بڑے ہندو میں ہمت نہیں تھی کہ وہ ان کی ہر دلعزیزی کو چیلنج کر سکے، انتخابات میں وہ بڑی آسانی سے ممبر اسمبلی منتخب ہو گئے۔ قدرتاً پارلیمنٹری پارٹی کے لیڈر بھی وہی بنے، اصولاً گورنر نے انہی کو تشکیل وزارت کی دعوت دی تھی انہوں نے قبول کر لیا اور دوسرے دن فہرست پیش کرنے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔

اسی رات کو سردار پٹیل نے یہ فیصلہ اُلٹ کر رکھ دیا، ان کی ہندوانہ ذہنیت اسے گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اتنے بڑے صوبہ کا وزیر اعلیٰ کوئی غیر ہندو ہو، سردار پٹیل کے نیاز مند خصوصی کنہیا لال منشی (سابق ایجنٹ جنرل حیدر آباد و گورنر یوپی) تھے۔ پٹیل انہی کو چاہتے تھے، لیکن ان کی مخالفت اندرونی طور پر اتنی ہوئی کہ منشی کا وزیر اعلیٰ

بغنا : نفین ہو گیا۔

۱۔ پٹیل نے ایک شخص کو راتوں رات کانگرس پارلیمنٹری پارٹی کا لیڈر منتخب کرا دیا، جسے اب سے پہلے کوئی نہیں جانتا تھا، یعنی مسٹر بال گنگا دھر کھیر — کوئی شبہ نہیں کہ مسٹر کھیر بڑے شریف آدمی تھے اور اس منصب کے ہر طرح اہل ثابت ہوئے۔ ظاہر ہے کھیر اور نریمان کی خدمات، استحقاق اور اہلیت کے لحاظ سے کوئی مقابلہ نہیں تھا، لیکن نریمان کو پچھڑنا پڑا کہ نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح پہلے ہی مرحلہ میں کانگرس نے ثابت کر دیا کہ وہ بھی اتنی ہی فرقہ پرست ہے جتنی لیگ تھی!

۲۔ یہی موقع ہے پر جواہر لال کا رویہ اقلیت کے افراد کے ساتھ ہمیشہ یہی رہا ہے۔ گرچہ وہ غیر متعصب بھی ہیں اور فراخ دل بھی، سی، پی کے یوسف شریف کے ساتھ بھی جواہر لال کچھ نہ کر سکے۔

۳۔ سوال یہ ہے کہ نریمان کو اگر پارسی ہونے کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا گیا تو ان کا جرم کیا تھا؟ — اگر وہ مجرم تھے تو اب تک کانگرس کے صدر کیوں چلے آ رہے تھے؟ اگر دفعتہً ان میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی تو کھیر صاحب نے انہیں اپنی کابینہ میں وزارت کیوں پیش کی؟

میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ نریمان کو پارسی ہونے کے علاوہ کسی اور وجہ سے نظر انداز کیا گیا۔

۴۔ مولانا کا یہ جملہ بڑا بلیغ ہے کہ ورکنگ کمیٹی صوبہ کانگرس کی غلطی کا تدارک اس لیے نہیں کر سکی کہ وہ "اتنی مضبوط نہ تھی!"

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ کانگرس اصول کے مقابلہ میں مصلحت کو ترجیح دینے کی پالیسی پر ہمیشہ سے عامل رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں قائداعظم کو دیکھیے کہ جب اصول کا سوال سامنے آیا تو مسلم لیگ کے وجود تک کو خطرہ میں ڈال کر قائداعظم نے بے تامل فضل الحق، خضر حیات خاں، سر سلطان احمد وغیرہ کو اس طرح لیگ سے نکال دیا جیسے دودھ سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے۔

لارڈ ویول

کرپس کا مشورہ ملاقات سر اسٹیفرڈ کرپس نے متعدد بار لارڈ ویول سے جو کمانڈر انچیف تھے، ملاقات کی انہوں نے مجھے بھی ان سے ملنے کا مشورہ دیا میں بخوشی آمادہ ہوگیا۔

سپاہی یا سیاستدان کرپس مجھے اور جواہر لال کو لے کر خود لارڈ ویول کے پاس گئے رسمی تعارف کے بعد وہ رخصت ہوگئے لارڈ ویول سے گفتگو کا سلسلہ تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا، اس موقع پر ویول کا انداز گفتگو ایک سپاہی سے زیادہ ایک سیاستدان کا تھا۔ (ص ۵۶، ۵۷)

منجھا ہوا سیاستدان گفتگو کی اس ساری مدت میں جو کمانڈر انچیف سے ہوئی اور جس موقع پر متعدد فوجی حکام بھی موجود تھے، کسی ٹیکنیکل مسئلہ پر بات چیت نہیں ہوئی۔ گفتگو کا سارا دارو مدار سیاست پر تھا، میں ایک لمحہ کے لیے بھی محسوس نہ کر سکا کہ ایک فوجی ماہر سے گفتگو کر رہا ہوں، کیونکہ لارڈ ویول ایک منجھے ہوئے سیاستدان کی طرح گفتگو کر رہے تھے۔

(ص ۶۴)

ویول کی مجھ پر مہربانیاں (جون ۱۹۴۵ء شملہ کانفرنس)

دس بجے رات کو میں شملہ پہنچا۔ سیول اتے ہوٹل میں میرے قیام کا انتظام کیا گیا۔ لیکن جب لارڈ ویول نے میری گرتی ہوئی صحت دیکھی تو محسوس کیا کہ ہوٹل میرے لیے مناسب جگہ نہیں ہے انہوں نے وائسرائیگل لاج سے متعلقہ ایک مکان میرے حوالے کر دیا اور اپنے اسٹاف کو ہدایت کردی کہ میری راحت و آسائش کا خیال رکھے، میں اس عنایت سے بہت متاثر ہوا میں مزید یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے لارڈ ویول کو بہت زیادہ معقول اور شریف آدمی پایا جسے دوسروں کے دکھ درد کا خیال رہتا تھا۔ (۱)

(ص ۱۰۵)

سیاستدان نہیں سپاہی

وائسرائے کے انداز بیان سے میں نے یہ تاثر لیا کہ وہ صاف گو اور مخلص آدمی ہیں، ان کا طرز عمل ایک سیاستدان کا نہیں ایک سپاہی کا تھا۔ دوران گفتگو میں کسی طرح کا ایچ پیچ کیے بغیر براہ راست وہ اصل موضوع پر آ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کا رویہ سر اسٹیفرڈ کرپس سے بالکل مختلف ہے۔ کرپس نے اپنے تجاویز زیادہ سے زیادہ خوشگوار الفاظ میں امیدوں کا سبز باغ دکھاتے ہوئے پیش کیے تھے، لارڈ ویول نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی۔ سیدھے سادھے الفاظ میں اپنا مدعا بیان کر دیا۔ انہوں نے بغیر کسی تامل کے یہ تسلیم کر لیا کہ جنگ اب تک جاری ہے اور جاپان ایک ناقابل تسخیر دشمن ہے، ان حالات میں برطانوی حکومت کوئی دوررس قدم نہیں اٹھا سکتی، ایسے اقدام کے لیے اختتام جنگ کا انتظار کرنا ہوگا لیکن دوررس تغیرات کی بنیاد اب اور ابھی رکھی جا سکتی ہے۔ ایگزیکیٹو کونسل مکمل طور پر ہندوستانی ممبروں پر مشتمل ہوگی۔ ایک مرتبہ جب یہ ہو گیا تو ایک بالکل نئی صورت حالات پیدا ہو جائے گی اور اختتام جنگ کے بعد ترقی پسندانہ اقدام رسانی کے ساتھ ممکن ہوگا۔

ویول کے طلسمی الفاظ

لارڈ ویول سے میرے انٹرویو نے ایک بالکل نئی فضا پیدا کر دی اسی شب انہوں نے سرکاری طور پر شاندار ڈنر کا اہتمام کیا، میرے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ ڈنر کے دوران میں میرے متعلق انہوں نے بڑے اچھے الفاظ استعمال کیے۔ وائسرائے کا یہ ریمارک سارے شملہ میں مشتہر ہو گیا سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں اس نے ایک ہلچل سی پیدا کر دی، بہت سے لوگ

جو اب تک بڑے مہربان نظر آتے تھے، میرے وجود کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے، دفعتاً پُرجوش نیاز مند بن گئے۔ تحفے لے لے کر میرے پاس آنے لگے اور مجھ پر اثر ڈالنے کی کوشش کی کہ ہم تو سدا دل و جان سے کانگرس کے ساتھ رہے ہیں۔

میں ویول پیشکش کا مؤید تھا ۱۴ جون کو سردار ہرنام سنگھ کے دولت کدے پر جہاں گاندھی جی مقیم تھے ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ وائسرائے سے ملاقات کرنے کے بعد میں نے کہا کہ گو یا تجاویز کرپس سے مختلف نہیں ہیں تاہم ہمیں چاہیے کہ انہیں قبول کر لیں، کیونکہ یورپ میں جنگ ختم ہو چکی ہے اور جاپان کی جنگ بھی جلد ختم ہو جائے گی اور پھر برطانوی حکومت کے لیے ہمارے تعاون کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی۔ (ص ۱۰۷)

(شملہ کانفرنس جون ۴۵ء)

وائسرائے کا ہمت افزا جواب "لارڈ ویول کی اختتامی تقریر کے بعد میں نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کا نقطہ نظر پیش کیا۔ میرے پیش کردہ نکات سہ گانہ کا وائسرائے نے جو جواب دیا وہ ہمت افزا تھا۔ (ص ۱۰۹)

ویول سے میرا مطالبہ (جون ۴۵ء شملہ کانفرنس، کانگرس کی ضد کہ وہ مسلمانوں کی نامزدگی کا حق رکھتی ہے اور قائد اعظم کا اصرار کہ یہ حق صرف مسلم لیگ کو ہے)

"میں نے لارڈ ویول سے (کانفرنس کے اجلاس میں) مطالبہ کیا کہ وہ صاف اور واضح الفاظ میں بتائیں، آیا مسلم لیگ کا مطالبہ معقولیت پر مبنی ہے؟

لارڈ ویول نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ ہرگز مسلم لیگ کے مطالبہ کو معقولیت پر مبنی نہیں سمجھتے۔ (ص ۱۱۲)

مسٹر جناح سے ویول کی مایوسی وائسرائے نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کر لی، لیکن مسٹر جناح کو ہموار کرنے میں ناکام رہے جنہیں اس پر اصرار تھا کہ تمام مسلمان ممبر صرف لیگ ورکنگ کمیٹی کے نامزد کردہ ہوں، وائسرائے یہ مطالبہ نہیں منظور کر سکتے تھے لہٰذا اس نتیجہ پر

پہنچے کہ اب ان کی پیش کش پر مزید کارروائی جاری رکھنا بے سود ہے۔

(ص ۱۱۵)

وبول کی تعریف

(ستمبر ۱۹۴۵ء بمبئی کانگرس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ مولانا آزاد کی تقریر۔)

"اگرچہ شملہ کانفرنس ناکام ہو گئی لیکن ہمیں اس جذبہ کی تعریف کرنی چاہیے جس کا مظاہرہ لارڈ ویول نے کیا تھا۔"

(ص ۱۲۰)

عفو عمومی کا اعلان وائسرائے کی طرف سے

میں ابھی گلمرگ ہی میں تھا کہ لارڈ ویول نے ہندوستان میں عام انتخابات کا اعلان کیا، میں نے انہیں لکھا، اب وقت آگیا ہے کہ اسیران کانگرس کو عام معافی دی جائے۔ اگر حکومت ایک نئی سیاسی فضا پیدا کرنا چاہتی ہے تو چاہیے کہ جملہ اسیران سیاسی کو رہا کر دے۔

لارڈ ویول نے تار سے جواب دیا، انہوں نے لکھا میں آپ کی رائے سے اتفاق کا اظہار کرتا ہوں اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کے احکام صادر کر رہا ہوں۔

انہوں نے اسیران کانگرس کی بڑی تعداد رہا کر دی لیکن بائیں بازو کا کانگرسی گروپ بدستور اسیر زنداں رہا جس میں جے پرکاش نرائن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میں نے ایک طویل اور مفصل خط پھر لارڈ ویول کو لکھا جس میں تحریر کیا کہ اگر وہ ملک میں اچھی فضا پیدا کرنے کے متمنی ہیں تو اسیران کانگرس کے سلسلہ میں انہیں عفو عمومی کا اعلان کرنا چاہیے، آخر کار لارڈ ویول نے میری بات مان لی اور تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔

(ص ۱۲۰، ۱۲۱)

میرے لیے ویول کی ہدایت

عام انتخابات جب منعقد ہو چکے تو صوبوں میں وزارت سازی کا مسئلہ پیش آیا، میرے لیے ضروری ہو گیا کہ ہر صوبہ کے دارالحکومت میں جاؤں اور تشکیل وزارت اپنے سامنے کراؤں، میرے پاس وقت بہت کم تھا، جنگ کے زمانہ میں تمام فضائی سروسیں حکومت نے اپنے کنٹرول میں لے لی تھیں حتیٰ کہ مسافروں کی نشستوں کی الاٹ منٹ بھی حکومت کرتی

تھی، لارڈ ویول نے ہدایات جاری کیں کہ مجھے ہر سہولت دی جائے اور اب میرے لیے آسانی سے یہ ممکن ہو گیا کہ ہر صوبے کے دارالحکومت تک بسہولت پہنچ سکوں۔

(ص ۱۲۰)

نیشنل آرمی کے ماخوذین سے ویول کا شریفانہ رویہ

(برطانوی فوج کے جو ہندوستانی سپاہی سنگاپور، ملایا اور برما میں جاپانیوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے، انہوں نے سوبھاش چندر بوس کی قائم کی ہوئی انڈین نیشنل آرمی میں شرکت کر لی۔ پھر جب برطانیہ نے ان متذکرہ علاقوں پر دوبارہ قبضہ کیا تو انڈین نیشنل آرمی کے افسروں کو گرفتار کر کے غداری کے الزام میں ان پر مقدمہ چلایا۔)

"کانگریس نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر حکومت انڈین نیشنل آرمی کے افسروں پر مقدمہ چلانا چاہتی ہے تو یہ کارروائی کھلی عدالت میں ہونی چاہیے تاکہ کانگریس انہیں ضروری قانونی امداد مہیا کرنے کا انتظام کر سکے۔ میں نے اس سلسلہ میں لارڈ ویول کو ایک خط لکھا اور ان پر زور دیا کہ وہ کانگریس کا نقطۂ نظر تسلیم کر لیں۔ لارڈ ویول نے میری رائے سے اتفاق کیا اور احکام صادر کر دیے کہ لال قلعہ کے اندر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ اس مقدمے نے عوام میں بڑا جوش پیدا کر دیا، آخر کار تمام افسران رہا کر دیے گئے (یا عدالت کے حکم سے یا وائسرائے کی طرف سے ازراہ رحم و کرم)"

(ص ۱۳۳)

جواہر لال کے لیے ویول کا خاص طیارہ

(کابینہ وفد ہندوستان میں مقیم ہے۔ جواہر لال کو مہاراجہ کشمیر نے گرفتار کر لیا ہے۔)

"میں نے وائسرائے سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ ایسا انتظام کر دے کہ میں جواہر لال سے فون پر گفتگو کر سکوں جو ایک ڈاک بنگلے میں نظر بند ہیں، بہت جلد کنکشن مل گیا، میں نے جواہر لال سے کہا میری رائے ہے کہ جس قدر جلد

ممکن ہو وہ دہلی واپس آجائیں، موجودہ مرحلے پر مناسب نہیں ہے کہ وہ قانون شکنی کرکے داخلے پر اصرار کریں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ صدر کانگرس کی حیثیت سے خود اس معاہدہ کو اپنے ہاتھ میں لوں گا اور کوشش کروں گا کہ شیخ عبداللہ اور ان کے رفقاء رہا کر دیئے جائیں۔

"شروع میں تو جواہر لال نے میری اس درخواست پر اعتراض کیا لیکن تھوڑی دیر کی بات چیت اور میری یقین دہانی کے بعد وہ راضی ہو گئے، میں نے لارڈ ویول سے درخواست کی کہ وہ ہوائی جہاز کا انتظام کر دیں جو جواہر لال اور آصف علی کو واپس لے آئے سات بجے شام کو میں نے یہ درخواست کی تھی، تھوڑی دیر کے بعد وائسرائے نے طیارہ روانہ کر دیا جو تقریباً دس بجے رات کو سری نگر پہنچ گیا اور جواہر لال و آصف علی کو لے کر دو بجے رات کو دہلی واپس آگیا۔

اس سارے معاملہ میں لارڈ ویول کا رویہ بالکل دوستانہ رہا اور میں اسے سراہنے پر مجبور ہوں۔ (۲)

(ص ۱۴۸، ۱۴۹)

ویول اور اٹیلی کا اختلاف

(کانگرس اور مسلم لیگ کے اختلافات دور نہیں ہوتے کانگرس اپنے پیمان شکنی پر بضد ہے، مسلم لیگ نے عارضی حکومت میں تعطل پیدا کر رکھا ہے اور دستور ساز اسمبلی میں شرکت سے انکار کر دیا ہے۔)

مسٹر اٹیلی کا خیال تھا اب وقت آگیا ہے کہ تذبذب کی پالیسی ترک کر دی جائے، ضروری ہے کہ صاف اور واضح فیصلہ کر دیا جائے، چنانچہ انہوں نے طے کر لیا، ہندوستان سے برطانوی حکومت کے انتقال اختیارات کی ایک تاریخ معین کر دیں اور لارڈ ویول کو اس رائے سے اتفاق نہیں تھا، ان کی خواہش تھی کہ کابینہ وفد کے پلان پر قائم رہا جائے کیونکہ ہندوستانی مسائل کا اس سے بہتر حل کوئی اور ممکن نہیں، ان کا یہ بھی خیال تھا کہ برطانوی حکومت اپنے فرائض میں کوتاہی کی مرتکب ہوگی، اگر فرقہ وارانہ مسئلہ طے کرنے سے پہلے اس نے اقتدار حکومت منتقل کر دیا۔ ہندوستان میں جذبات اس شدت سے بھڑک چکے ہیں کہ ذمہ دار لوگ تک اس دھارے میں

بھتے چلے جا رہے ہیں، اس ماحول میں برطانوی حکومت کا اقتدار سے دستبردار ہونا ہندوستان
گیر فساد اور بدامنی پر منتج ہوگا لہٰذا ان کا مشورہ یہ تھا کہ موجودہ صورتِ حالات برقرار رکھی
جائے اور پوری کوشش لیگ اور کانگرس کے اختلافات رفع کرنے کی ہونی چاہیے
ان کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ یہ بڑی خطرناک اور نامناسب بات ہوگی، اگر کانگرس، لیگ
مفاہمت کے بغیر انگریز ہندوستان سے رخصت ہوگئے۔

اٹیلی نے ویول کی بات نہیں مانی مسٹر اٹیلی نے اس رائے سے اتفاق نہیں
کیا، ان کا خیال تھا کہ انتقال اختیارات
کی تاریخ اگر مقرر کردی جاتے تو ذمہ داری کا بوجھ خود ہندوستانیوں پر آپڑے گا جب
تک یہ نہیں ہوتا کوئی حل تلاش نہیں کیا جاسکتا، مسٹر اٹیلی کو اندیشہ تھا کہ اگر موجودہ
انتظام برقرار رکھا گیا تو ہندوستانیوں کا برطانوی حکومت پر سے اعتماد اُٹھ جائے
گا، اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو سختی کے ساتھ حکومت اپنے دورِ حکومت میں
توسیع کرسکتی ہے، لیکن اس کا انجام یہ ہوگا کہ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں
کے باعث برطانیہ کی تعمیر نو مشکل ہوجائے گی، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ انتقال اختیارات
کی تاریخ مقرر کردی جائے اور ذمہ داری کا سارا بوجھ ہندوستانیوں کے کندھے پر ڈال
دیا جائے۔

ویول کے استعفیٰ کا سبب لارڈ ویول ان دلائل سے مطمئن نہیں ہوئے وہ
اب تک یہ کہے جارہے تھے کہ فرقہ وارانہ مشکلات
نے تشدد کی صورت اختیار کی تو تاریخ برطانیہ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ انگریزوں
نے سو سال سے زیادہ ہندوستان پر حکومت کی، اب اگر شورش، تشدد اور بدنظمی
اس دستبرداری کے باعث پیدا ہوتی ہے تو اس کی ذمہ داری انگریزوں ہی پر ہوگی
جب انہوں نے دیکھا کہ وہ مسٹر اٹیلی کو قائل نہیں کرسکتے تو انہوں نے استعفیٰ
دے دیا۔

(ص ۱۷۷)

تاریخ ویول کے ساتھ ہے کوئی شخص بھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا
کہ لارڈ ویول کی رائے غلط تھی، ان کی چشم
دُور بین نے جن خطرات کا مشاہدہ کیا تھا وہ حقیقی تھے اور بعد کے واقعات نے

ثابت کر دیا کہ ان کا مشاہدہ غلط نہ تھا، یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ راستہ جو اٹیلی نے اختیار کیا، اور وہ جس پر لارڈ ویول قائم تھے غلط یا صحیح تھا اگر لارڈ ویول کا مشورہ قبول کر لیا جاتا اور ہندوستان کے مسئلہ کا حل سال دو سال کے لیے ملتوی کر دیا جاتا تو ممکن تھا حزب مخالف کی حیثیت سے مسلم لیگ تھک جاتی بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر مسلم لیگ کوئی مثبت رویہ نہ اختیار کرتی تو ہندوستان کے مسلمان عوام مسلم لیگ کی منفی پالیسی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے اور عین ممکن تھا کہ تقسیم ہند کا المیہ رونما ہوتا، یقین کے ساتھ تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن کسی قوم کی تاریخ میں سال دو سال کی مدت کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی یقیناً تاریخ کا فیصلہ یہ ہوتا کہ لارڈ ویول کے مشورہ پر عمل کرنا ہی بہترین پالیسی تھی۔

جواہر لال ویول کے خلاف تھے

جب یہ بات مشتہر ہو گئی کہ لارڈ ویول رخصت ہو رہے ہیں تو میں نے ایک بیان شائع کیا جس سے ان کے بارے میں میرے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے مجھے معلوم تھا کہ جواہر لال اور میرے دوسرے رفقا مجھ سے متفق نہیں ہیں۔ یہ لوگ لارڈ ویول کے خلاف تھے۔

میں نے اپنے بیان میں کہا تھا:

منظر سے پس منظر میں

ہندوستان اور انگلستان کے تعلقات کی تاریخ کا نیا باب لارڈ ویول نے شروع کیا تھا، مجھے افسوس ہے کہ وہ اب منظر سے پس منظر میں واپس جا رہے ہیں۔

ویول کے خلوص سے انکار نہیں کیا جاسکتا

مجھے نہیں معلوم کہ لارڈ ویول اور حکومت برطانیہ کے مابین مذاکرات کی نوعیت کیا تھی؟ بہرحال کچھ اختلافات تھے جو استعفیٰ پر منتج ہوئے، ہم لارڈ ویول کے انداز فکر و رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کے خلوص سے انکار نہیں کر سکتے، کرپس مشن کی ناکامی کے بعد چرچل گورنمنٹ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ زمانہ جنگ تک کے لیے ہندوستان کا مسئلہ کھٹائی میں ڈال دیا جائے، لیکن یہ کارنامہ صرف لارڈ ویول ہی کا ہے جنہوں نے بند دروازہ کھولا برطانیہ کی مخلوط وزارت

کے مخالفانہ طرزِ عمل کے باوجود لارڈ ویول ہی تھے جنہوں نے ترغیب و تحریص سے کام لے کر نئی پیشکش پر حکومت برطانیہ کو آمادہ کیا جس کا نتیجہ شملہ کانفرنس کی صورت میں ظاہر ہوا بلاشبہ شملہ کانفرنس ناکام ہوئی لیکن اس کے بعد سے اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ لارڈ ویول کے دلیرانہ اقدام کا منطقی نتیجہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ لارڈ ویول کی یہ شاندار خدمت ہندوستان کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔"

میرے بارے میں ویول کے تاثرات جس روز لارڈ ویول ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں کو الوداع کہہ رہے تھے ہو رہے تھے، ایک ڈنر کا اہتمام ہوا وہ میرے بیان سے بہت متاثر تھے، ایک دن مجھ سے انہوں نے کہا، مجھے مسرت ہے کہ ہندوستان میں کم از کم ایک آدمی تو ایسا ہے جس نے میرے موقف کو سمجھنے کی کوشش کی۔

آخری اثر انگیز تقریر جانے سے ایک روز پہلے لارڈ ویول نے آخری مرتبہ کابینہ کی صدارت کی جب کارروائی ختم ہو گئی تو انہوں نے ایک مختصر سی تقریر کی جس نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا، لارڈ ویول نے کہا میں نہایت سخت اور نازک موقعہ پر ہندوستان کا وائسرائے بنا، میں نے اپنی ذمہ داری کو زیادہ سے زیادہ خوبی کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کی، بہر حال ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ مجھے استعفیٰ دینا پڑا، اس کا فیصلہ تاریخ ہی کرے گی کہ میں نے استعفیٰ دے کر صحیح قدم اٹھایا ہے یا نہیں، آپ حضرات سے میری اپیل یہ ہے کہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کیجیے، آپ سب کے تعاون کا میں شکر گزار ہوں۔

ویول کی رخصت کا منظر اس تقریر کے بعد لارڈ ویول نے جلدی جلدی اپنے کاغذات سمیٹے اور ہم میں سے کسی کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر چلے گئے، دوسرے دن وہ دہلی سے رخصت ہو گئے۔

(ص ۲۸، ۱۷۹، ۱۸۰)

۱۔ مولانا اسی سلوک کے مستحق تھے لیکن اگر اتفاق سے یہ سلوک وائسرائے نے قائد اعظم سے کیا ہوتا تو کیا کیا کچھ نہ کہا جاتا؟ کیا یہ ثابت نہ کر دیا جاتا کہ وہ انگریزوں اور

انگریزان کے دستِ راست ہیں؟

۲- لارڈ ویول کے طرزِ عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کانگرس سے اور کانگرس رہنماؤں سے کتنے زیادہ متاثر تھے؟ جو بات بھی صدرِ کانگرس نے کہی بیچارے نے بے چون وچرا مان لی، ذرا سا اشارہ صدر کانگرس کا پایا اور اسیران کانگرس کو رہا کر دیا، پھر صدرِ کانگرس کی فرمائش پر تشدد کے مجرم اسیرانِ کانگرس بھی رہا کر دیے گئے۔ پھر صدرِ کانگرس کے ارشاد پر نیشنل آرمی کے ماخوذین پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلانا بھی منظور کر لیا اور جنہیں سزا ملی اپنے اختیاراتِ خصوصی کو کام میں لاکر انہیں پروانۂ رہائی بھی عطا کر دیا، صدرِ کانگرس کا مزاج ناساز دیکھا تو وائسرائیگل کا ایک مکان ارزانی فرما دیا۔ صدر کانگرس کو وزارت سازی کے لیے سفر میں دشواری پیش آئی تو ہوائی جہاز کی سہولتیں عطا کر دیں، صدر کانگرس نے جواہر لال کے لیے طیارہ سری نگر بھیجنے کی استدعا کی وہ منظور کر لی، راتوں رات طیارہ سری نگر گیا اور اسی وقت جواہر لال کو لیے ہوئے واپس آگیا۔

کتنی عجیب بات ہے ان تمام باتوں کا صلہ بیچارے کو یہ ملا کہ جواہر لال بھی ان سے خفا، پٹیل صاحب بھی ان سے نالاں، گاندھی جی بھی ان سے ناخوش، عجیب چیز ہیں یہ کانگرسی لیڈر بھی۔

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر!

---

(۳۴۳)

سردار ولبھ بھائی پٹیل

پٹیل کے بیٹے کا دوست مرکز کا وزیر (اگست ۴۶ء جواہر لال نے مرکز میں عارضی حکومت قائم کر لی ہے مولانا آزاد تجویز پیش کرتے ہیں کہ ایک پارسی بھی وزیر بنایا جائے)

کچھ بحث مباحثہ کے بعد میرے رفقا اس تجویز پر رضامند ہو گئے چونکہ پارسی فرقہ زیادہ تر بمبئی میں مرتکز ہے، ہم نے خیال کیا کہ سردار پٹیل کسی پارسی نمائندہ کے انتخاب کے سلسلہ میں زیادہ بہتر طور پر ہمیں مشورہ دے سکیں گے۔ یہ معاملہ ہم نے ان کے سپرد کر دیا، کچھ عرصہ بعد انہوں نے مسٹر سی، ایچ بھابھا کا نام پیش کیا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ مسٹر بھابھا سردار پٹیل کے فرزند ارجمند کے دوست ہیں اور کسی طرح بھی انہیں پارسی فرقہ کا لیڈر یا نمائندہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا انتخاب غلط ثابت ہوا۔ آخر کار انہیں کابینہ سے رخصت کر دیا گیا۔

(ص ۱۶۳)

تقسیم کی تجویز سب سے پہلے پٹیل نے منظور کی (مارچ ۴۷ء نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن مصروفِ کار ہیں)

"یہ بات میں ریکارڈ پر لے آنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں سب سے پہلے جس شخص نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقسیم ہند کی تجویز پر سر جھکایا وہ سردار پٹیل تھے۔

لیاقت کی وجہ سے سردار پٹیل کو تقسیم پر ایمان لانا پڑا، ایگزیکٹو کونسل میں مسلم لیگ کے پیدا کردہ تعطل نے سردار پٹیل کو آنا پریشان اور بدحواس کر دیا تھا کہ اب تقسیم ہند پر وہ مکمل ایمان لے آئے تھے۔ مسلم لیگ کو محکمہ مالیات تفویض کرنے کی ذمہ داری سردار پٹیل پر تھی، قدرتاً دوسرے لوگوں کے برعکس لیاقت علی خاں کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کر کے وہ بہت زیادہ چڑ جاتے تھے، جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کی تجویز یہ کہہ کر پیش کی کہ وہ موجودہ مشکل کا حل صرف تقسیم ہند ہی ہے تو سردار پٹیل نے فوراً آمنّا و صدّقنا کہنا شروع کر دیا۔ وہ اب علانیہ کہنے لگے تھے کہ اگر لیگ سے گلو خلاصی صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ہندوستان کا کچھ حصّہ اسے دے دیا جائے تو وہ بسر و چشم اس کے لیے تیار ہیں۔

سردار پٹیل اخروٹ کی طرح تھے لارڈ ماؤنٹ بیٹن غیر معمولی طور پر ذہین آدمی ہیں وہ اپنے تمام ہندوستانی رفقاء کے دل کا حال پڑھ چکے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ پٹیل ان کی تجویز سے قریب آ گئے ہیں تو انہوں نے سردار کو جیت لینے کے لیے اپنی شخصیت کی ساری سحر طرازی اور قوت داؤ پر لگا دی، اپنی نجی گفتگو میں سردار پٹیل کے متعلق وہ کہا کرتے تھے کہ سردار صاحب اخروٹ کی طرح ہیں جس کا خول نہایت سخت ہوتا ہے لیکن گودا نہایت ملائم۔ (ص ۱۸۳)

پٹیل نے دو قومی نظریہ بھی مان لیا میں نے سردار پٹیل سے دو گھنٹے تک بحث کی، میں نے کہا کہ اگر ہم نے تقسیم ہند قبول کر لی تو ہم ہندوستان کے لیے مستقل دشواریاں پیدا کر لیں گے، تقسیم ہند سے فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ مستقل اور پائدار صورت اختیار کرے گا۔ مسٹر جناح نے دو قومی نظریہ کا نعرہ بلند کیا، تقسیم ہند قبول کر لینے کے معنی دو قومی نظریہ قبول کر لینے کے ہیں، کانگریس کس طرح اس پر متفق ہو سکتی ہے کہ

ہندو مسلم بنیاد پر ملک کی تقسیم قبول کرے؟ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور بڑا دکھ پہنچا۔ جب سردار پٹیل نے کہا، خواہ ہم پسند کریں یا ناپسند، ہندوستان میں دو قومیں تو ہیں، اب ان کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم نہیں بن سکتے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، ہندو مسلم جھگڑا صرف اس طرح ختم ہو سکتا ہے انہوں نے مزید یہ بھی کہا کہ اگر دو بھائی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تو وہ جائداد تقسیم کر لیتے ہیں۔

(ص ۱۸۵)

لیاقت کے خطِ تنسیخ نے پریشان کر دیا

تقسیم ہند کے بعد جو ہولناک حوادث پیش آئے، ان کا ذکر اور ان پر تبصرہ۔

کانگرسی لیڈروں میں تقسیم کے سب سے بڑے حامی سردار پٹیل بن گئے۔ لیکن خود ان کا بھی یہ یقین اور عقیدہ نہیں تھا کہ ہندوستانی مسائل کا بہترین حل تقسیم ہے، انہوں نے اپنا پورا وزن تقسیم کی حمایت میں ڈال دیا لیکن برہمی اور ناکامی کے باعث! ہر قدم پر لیاقت علی خاں کا خطِ تنسیخ انہیں پریشان اور ان کی تجویز کو ناکارہ بنا دیتا تھا، انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر کوئی اور چارہ کار نہیں ہے تو تقسیم قبول کر لینی چاہیے۔

پٹیل کو یقین تھا پاکستان نہیں چل سکے گا

سردار پٹیل کو یقین کامل تھا کہ پاکستان کی نئی حکومت اپنا بوجھ نہیں سنبھال سکے گی، لہٰذا زیادہ دن نہیں چل سکے گی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کانگرس نے پاکستان قبول کر لیا تو یہ مسلم لیگ کے لیے ایک تلخ سبق ہوگا۔ بہت مختصر مدت میں پاکستان کی عمارت زمین پر آ رہے گی اور اس کے ملحقہ صوبے ناگفتہ بہ مشکلات و مصائب میں گرفتار ہو جائیں گے۔

(ص ۲۰۷)

دلی کا قتلِ عام

دلی میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کے قتل و غارت میں فوج کے سپاہی اور اسپیشل مجسٹریٹ بھی حصہ لے رہے ہیں۔ گاندھی جی نے یہ ساری مدت سخت ذہنی اضطراب کی حالت میں گزاری، وہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات بہتر بنانے اور مسلمانوں کی جان و مال کی

حفاظت کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

گاندھی جی کو اس بات سے بڑا دکھ ہوتا تھا جب وہ دیکھتے تھے کہ ان کی جدوجہد کا نتیجہ حسب دلخواہ برآمد نہیں ہوتا، اکثر وہ جواہر لال، سردار پٹیل اور مجھے بلا بھیجتے اور ہم سے پوچھتے کہ دلی کی صورتِ حالات اب کیا ہے؟ ان کا دکھ اور بھی بڑھ جاتا جب وہ یہ دیکھتے کہ ہم لوگ آپس میں اس درجہ مختلف ہیں کہ دلی کے حوادث کے سلسلہ میں ہمارا بیان بھی یکساں نہیں ہے۔

ہم باہم مختلف تھے

ایک طرف سردار پٹیل تھے، دوسری طرف جواہر لال اور میں مقامی نظم پر بھی اس کا بُرا اثر پڑتا تھا۔ یہ بات بالکل نمایاں تھی کہ دلی میں حکام بھی دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے، بڑا گروہ وزیر داخلہ سردار پٹیل کے اشارۂ چشم و ابرو پر چلتا تھا اور انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک بہت چھوٹا سا گروہ جواہر لال کے اور میرے ساتھ تھا، یہ جواہر لال کے احکامات کی تعمیل کرتا تھا۔

دلی کے بے بس چیف کمشنر

دلی کے چیف کمشنر ایک مسلمان خورشید احمد خاں تھے۔ یہ صاحبزادہ آفتاب احمد کے بیٹے تھے یہ مضبوط افسر نہیں تھے، پھر یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ اگر کوئی سخت اقدام اٹھایا تو الزام لگایا جائے گا کہ مسلمانوں کی طرفداری کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ صرف برائے نام سربراہ انتظام رہ گئے سارے کام اپنی مرضی سے ڈپٹی کمشنر کرتا تھا۔

سکھ ڈپٹی کمشنر کے مسلمان مداح

یہ ایک سکھ تھا لیکن سکھوں کے رسم و رواج کا پابند نہ تھا، اس نے داڑھی منڈالی تھی، سر کے بال ترشوا لیے تھے، بہت سے سکھ اسے لا مذہب سمجھنے لگے تھے۔ یہ قبل از تقسیم کے وقت سے دہلی کا ڈپٹی کمشنر چلا آرہا تھا۔ ۱۵ راگست سے پہلے ایک تجویز یہ زیرِ غور آئی کہ اس کی مدت پوری ہو چکی ہے، اسے پنجاب واپس بھیج دیا جائے، دلی کے سر برآوردہ شہریوں نے خاص طور پر مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ نے اس تجویز کے خلاف پرجوش احتجاج کیا، ان کا خیال تھا کہ یہ ایک کھلے دماغ اور مضبوط کردار کا افسر ہے اور ان نازک دنوں میں اس کا

کوئی موزوں بدل نہیں مل سکے گا۔

سکھ ڈپٹی کمشنر فرقہ پرست بن گیا چنانچہ اسے اس کے عہدہ پر برقرار رکھا گیا لیکن فرقہ وارانہ کھچاؤ کے زمانہ میں یہ سابقہ رویہ برقرار نہ رکھ سکا، مجھے برابر اطلاعات ملتی رہتی تھیں کہ بلوائیوں کے خلاف یہ کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھاتا، وہ مسلمان جنہوں نے سال بھر پہلے مطالبہ کیا تھا کہ اسے دہلی سے نہ بھیجا جائے اب وہ مجھ سے آکر شکایت کرتے تھے کہ یہ مسلمانوں کی حفاظت میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتا۔ یہ رپورٹ سردار پٹیل تک پہنچائی گئی، لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔

جواہر لال کی بیچارگی سردار پٹیل وزیر داخلہ تھے، چنانچہ دلی کا نظم و انصرام براہِ راست انہی کے ماتحت تھا۔ قتل و غارت کی فہرست جب زیادہ وسیع ہوتی تو گاندھی جی نے پٹیل کو بلایا اور پوچھا کہ وہ اس کشت و خون کے تدارک کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ سردار پٹیل نے انہیں یقین دلایا کہ جو اطلاعیں ان تک پہنچ رہی ہیں، وہ مبالغہ آمیز اور غلط ہیں بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مسلمانوں کے شکایت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ہم تینوں گاندھی جی کے پاس بیٹھے تھے۔ جواہر لال نے بڑے غم انگیز لہجہ میں کہا کہ دلی کا حال زار اب برداشت نہیں کیا جاتا، مسلمان کتے اور بلی کی طرح قتل کیے جا رہے ہیں، انہیں یہ کہتے شرم آتی ہے کہ وہ بے بس ہیں اور مسلمانوں کو بچا نہیں سکتے، ان کا ضمیر ایک لمحہ بھی انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا ان جگر خراش حوادث کی رپورٹیں لے کر لوگ جب ان کے پاس آتے ہیں تو وہ کیا جواب دیں؟

جواہر لال کا ضمیر جواہر لال نے کئی مرتبہ کہا کہ صورتِ حالات اب ناقابل برداشت ہے اور ان کا ضمیر انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔

سردار پٹیل کا دم خم جواہر لال کی ان باتوں کے جواب میں سردار پٹیل کا ردِ عمل دیکھ کر ہم سب دنگ رہ گئے، عین اس وقت جب روزِ روشن میں دلی کے گلی کوچے مسلمانوں کے خونِ ناحق سے لالہ زار ہو رہے تھے،

سردار پٹیل نے بڑے ٹھنڈے انداز میں گاندھی سے کہا، جواہر لال کی شکایات قطعاً ناقابلِ فہم ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ اکا دکا واقعات ہوتے ہوں، لیکن حکومت ہر ممکن اقدام مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے کر رہی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت اس طرح سردار پٹیل نے یہ ظاہر کر دیا کہ وزیر اعظم کی حیثیت سے جواہر لال حکومت کے رویہ پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کر سکتے۔

مسلمانوں کے بارے میں پٹیل کا انکشاف

چند لمحوں تک جواہر لال گم سم بیٹھے رہے پھر مایوسی کے عالم میں گاندھی جی سے کہا، اگر سردار پٹیل کے خیالات یہ ہیں تو وہ کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ اس زمانہ میں ایک دوسرا واقعہ رونما ہوا جس نے یہ منکشف کر دیا کہ سردار پٹیل کا دماغ کس منہج پر کام کر رہا ہے۔ انہوں نے محسوس کیا ہو گا کہ مسلمانوں پر ہر روز جو حملے ہو رہے ہیں ان کی کچھ توجیہہ تو کرنی ہی چاہیے، چنانچہ یہ نظریہ پیش کیا کہ شہر کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کے گھروں سے مہلک ہتھیار برآمد ہوتے ہیں۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ دلی کے مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر حملے کے لیے یہ ہتھیار جمع کیے تھے، اور اگر سکھوں اور ہندوؤں نے حملے میں پہل نہ کی ہوتی تو مسلمان ان کا قیمہ کر ڈالتے۔

مسلمانوں سے چھینے ہوئے ہتھیاروں کی نمائش

پولیس نے قرول باغ اور سبزی منڈی میں مسلمانوں کے گھروں سے جو ہتھیار برآمد کیے، سردار پٹیل کے حسب الحکم یہ ہتھیار گورنمنٹ ہاؤس میں اینٹ روم کے سامنے والے کمرے میں رکھ دیے گئے۔ ایک مرتبہ جب ہم سرکاری کمیٹی میں بیٹھے ہوئے تھے تو سردار پٹیل نے کہا بہتر یہ ہو گا کہ پہلے ہم مسلمانوں سے چھینے ہوئے ہتھیار چل کر دیکھ لیں۔ ہم ہتھیاروں کی نمائش گاہ میں پہنچے، ہم نے دیکھا کہ میز پر کئی درجن ترکاری کاٹنے والے چاقو رکھے ہیں، ان پر زنگ چڑھ چکا تھا، کچھ جیبی چاقو بھی تھے اور کچھ قلم تراش بھی، بعض پر دستے لگے ہوئے تھے، بعض پر نہیں، کچھ نوک دار لوہے کی سلاخیں جو پرانے مکانوں کے کاٹ کباڑ سے برآمد کی گئی تھیں۔ کچھ لوہے کے ڈھلے ہوئے واٹر پائپ سردار پٹیل کے خیال میں یہ وہ ہتھیار تھے جنہیں دلی کے مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کا صفایا کرنے کے لیے جمع کر رکھا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک چاقو

اٹھایا اور مسکراتے ہوئے کہا" ان ہتھیاروں سے دلّی فتح کر لینے کا خواب جو لوگ دیکھ رہے تھے واقعی انہیں دماغی توازن کھو بیٹھنے والوں میں شمار کرنا چاہیے۔"

(ص ۲۱۲، ۲۱۴، ۲۱۵)

گاندھی جی کے برت کا سبب پٹیل تھے

(دلّی کے مسلمانوں کے قتلِ عام سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے مرن برت رکھنے کا اعلان کر دیا۔)

اس فیصلہ کا ایک بڑا محرک سردار پٹیل کا رویہ تھا۔ سردار پٹیل کا شمار گاندھی جی کے اندرونی حلقہ کے لوگوں میں ہوتا تھا وہ گاندھی جی کے چیلے تھے، حقیقت یہ ہے کہ سردار پٹیل کا سیاسی وجود صرف گاندھی جی کا مرہونِ منت تھا۔ کانگریس کے رہنماؤں میں متعدد لوگ ایسے تھے جو گاندھی جی کے سیاسی میدان میں نمودار ہونے سے پہلے اپنی مستقل سیاسی زندگی رکھتے تھے، صرف دو آدمی ایسے تھے، سردار پٹیل اور راجندر پرشاد جو تمام تر گاندھی جی کی تخلیق تھے، تحریکِ عدمِ تعاون سے پیشتر گجرات کے بہت سے وکیلوں میں وکیل وہ بھی تھے، انہیں ملک کی عوامی زندگی میں نہ کوئی مقام حاصل تھا، نہ وہ خود اس سے دلچسپی رکھتے تھے۔ گاندھی جی نے جب احمد آباد میں مستقل اقامت اختیار کی، انہوں نے پٹیل کو چن لیا، اور ان کی تعمیر نو شروع کر دی، پٹیل ان کے دل و جان سے حامی بن گئے۔ میں کئی مواقع پر بتا چکا ہوں کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جوشِ عقیدت میں بے سمجھے بوجھے انہوں نے گاندھی جی کے سُر سے اپنا سُر ملا دیا۔ وہ گاندھی جی تھے جنہوں نے پٹیل کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنایا۔ پھر جب ۱۹۳۱ء میں وہ کانگریس کے صدر منتخب ہوتے تو یہ بھی گاندھی جی کی مہربانی تھی، گاندھی جی کے لیے یہ بات بڑی تکلیف دہ تھی کہ پٹیل نے وہ پالیسی اختراع کی تھی جو ان تمام باتوں کے برعکس تھی جن کے لیے وہ میدان میں آئے تھے۔

پٹیل کے خلاف گاندھی جی کا خاموش احتجاج

گاندھی جی نے کہا کہ خود ان کی آنکھوں کے سامنے دہلی کے مسلمان قتل ہو رہے ہیں اور یہ اس وقت ہو رہا ہے جب ان کے خاص الخاص

ساتھی ولبھ بھائی پٹیل گورنمنٹ آف انڈیا کے وزیر داخلہ ہیں اور صوبہ کے نظم و انصرام کے ذمہ دار ہیں۔ پٹیل نہ صرف مسلمانوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے تھے بلکہ نہایت سرد مہری کے ساتھ اپنے حضور میں پیش کیے گئے، اس سلسلہ میں ناکام رہے تھے بلکہ نہایت سرد مہری کے ساتھ اپنے حضور میں پیش کیے گئے اس سلسلہ کے شکایات کو مسترد بھی کر دیتے تھے۔ گاندھی جی نے کہا، اب ان کے لیے صرف یہی چارہ کار رہ گیا ہے کہ اپنا آخری ہتھیار یعنی برت استعمال کریں۔ انہوں نے ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء کو برت شروع کر دیا۔ اس احساس کے ساتھ کہ یہ سردار پٹیل بھی جانتے تھے کہ یہ ہتھیار انہیں کی وجہ سے بے نیام ہوا ہے، ہم نے گاندھی جی کو برت سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔

پٹیل کی گاندھی جی سے گستاخانہ گفتگو جس دن گاندھی جی نے برت شروع کیا شام کو جواہر لال، پٹیل اور میں ان کے بستر سے لگے بیٹھے تھے۔ سردار پٹیل دوسرے دن صبح بمبئی کے دورے پر جا رہے تھے، انہوں نے گاندھی جی سے بالکل رسمی لب و لہجہ میں گفتگو کی اور شکایت آمیز انداز میں کہا، بغیر کسی معقول وجہ کی انہوں نے برت رکھ لیا ہے، کوئی وجہ اس اقدام کو جائز نہیں ٹھہراتی انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کا یہ برت حکومت کے خلاف اور خاص طور پر خود ان کے خلاف ایک الزام ہے، انہوں نے بڑے تلخ لہجے میں کہا کہ گاندھی جی کے اس اقدام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے قتل عام کا ذمہ دار سردار پٹیل ہے۔

پٹیل کو گاندھی جی کا جواب گاندھی جی نے حسب معمول ٹھنڈے لب و لہجہ میں کہا میرا قیام چین میں نہیں دہلی میں ہے۔ نہ میں چشم و گوش سے محروم ہوں، اگر بہرے یہ کہتے ہو کہ اپنے مشاہدہ اور اپنی سماعت پر یقین کرنے سے انکار کر دوں اور یہ کہ مسلمانوں کے لیے کوئی وجہ شکایت نہیں ہے تو نہ میں تمہیں قائل کر سکتا ہوں اور نہ تم مجھے قائل کر سکتے ہو، ہندو اور سکھ میرے بھائی ہیں، وہ میرے جسم و جان کا حصہ ہیں اور اگر انتقام نے انہیں اندھا کر دیا ہے تو میں انہیں ملامت نہیں کرتا لیکن بہر حال اپنے تاثرات کا اظہار خود اپنی ذات پر دکھ جھیلتے ہوئے کر سکتا ہوں۔ مجھے امید ہے میرا یہ برت ان کی آنکھیں کھول دے گا اور وہ حقیقت کو دیکھنے لگیں گے۔

پٹیل سے میری التجا سردار پٹیل ایک لفظ کہے بغیر اس طرح اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے واپس جارہے ہیں، میں نے انہیں روکا اور کہا کہ اپنا پروگرام منسوخ کر دیجئے اور دہلی سے باہر نہ جایئے، کوئی نہیں کہہ سکتا واقعات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں، گاندھی جی کے برت کے دوران میں آپ کو یہیں رہنا چاہیے۔

پٹیل کی گاندھی جی پر خفگی پٹیل نے چیخ کر کہا میرے ٹھہرنے سے کیا فائدہ؟ گاندھی جی میری بات سننے کو تیار نہیں ہیں، انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دُنیا کے سامنے ہندوؤں کے نام پر سیاہی پھیر کر رہیں گے، اگر ان کا رویہ یہ ہے تو ان کے کیا کام آسکتا ہوں؟ میں اپنے پروگرام میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ بمبئی ضرور جاؤں گا۔

پٹیل کا تکلیف دہ لب ولہجہ الفاظ سے زیادہ سردار پٹیل کے لب ولہجہ نے مجھے تکلیف پہنچائی، میں سوچنے لگا ان الفاظ اور اس لب ولہجہ کا دیکھنا چاہیے، گاندھی جی پر کیا اثر پڑتا ہے، ہم نے محسوس کیا کہ اب کچھ کہنا بے کار ہے۔ سردار پٹیل چلے گئے۔

گاندھی جی کے لیے پٹیل کا دل پتھر ہو گیا تھا سردار پٹیل نے گاندھی جی کے لیے اپنا دل پتھر بنالیا تھا لیکن دہلی کے باشندوں کا یہ حال نہیں تھا: جیسے ہی خبر پھیلی کہ گاندھی جی نے برت رکھ لیا ہے نہ صرف دلی میں بلکہ سارے ملک میں تہلکہ مچ گیا، دہلی میں تو اس برت کا اثر وہ ہوا جو برقی رو کا ہوتا ہے، وہ گروہ جواب تک گاندھی جی کی علانیہ مخالفت کرتے تھے آگے بڑھے اور انہوں نے کہا کہ گاندھی جی کی قیمتی جان بچانے کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ (ص ۲۱۸، ۲۱۷)

گاندھی جی نے پٹیل کو معاف کر دیا (دلی کے ہندوؤں اور سکھوں نے گاندھی جی کے شرائط منظور کر کے ان کا برت تڑوا دیا)

برت کھولنے کے بعد توانائی کے بحال ہونے میں کئی دن لگ گئے سردار پٹیل بمبئی سے واپس آکر گاندھی جی سے ملنے گئے، اس موقع پر میں بھی موجود تھا۔ گاندھی جی کی

عظمت ایسے ہی موقعوں پر نمایاں ہوا کرتی تھی، انھوں نے پٹیل کا استقبال تپاک اور مہربانی سے کیا، ان کے انداز و اطوار میں کسی طرح کی خفگی و برہمی کا نشان تک نہ تھا۔

پٹیل کی بے چینی پٹیل نمایاں طور پر بے چین نظر آرہے تھے، ان کا طرزِ عمل اب بھی خشک اور رسمی تھا، وہ گاندھی جی سے خوش نہیں تھے گاندھی جی نے بحالی امن وامان کے لیے جو کچھ کیا تھا اسے بھی وہ پسند نہیں کرتے تھے،

(ص ۲۲۱)

پٹیل کی موت کا سبب گاندھی جی کی موت کو مشکل سے دو مہینے گزرے ہوں گے کہ سردار پٹیل کو دل کا دورہ پڑا، میرا اندازہ یہ ہے کہ اس جھٹکے کا نتیجہ تھا جو گاندھی کی موت سے انہیں پہنچا تھا، جب تک گاندھی جی زندہ رہے ان کے خلاف پٹیل کا غصہ بھی قائم رہا۔ جب گاندھی جی مار ڈالے گئے اور لوگوں نے علانیہ سردار پٹیل پر غفلت اور فرض ناشناسی کا الزام لگایا تو وہ غم اور شرم محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے، اس کے علاوہ ان کے لیے یہ فراموش کرنا بھی آسان نہ تھا کہ ان کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ گاندھی جی کا دیا ہوا تھا، گاندھی جی مسلسل پٹیل کے ساتھ جس مہر و محبت کا برتاؤ کرتے رہے تھے اس نے یہ صورتِ حال پٹیل کے لیے اور زیادہ تکلیف دہ بنا دی تھی، یہ تمام تاثرات ان کے دماغ میں گردش کر رہے تھے اور انہیں مبتلائے الم کر رکھا تھا یہاں تک کہ تھرامبوس کا مرض انہیں چھاپ بیٹھا وہ تقریباً چار سال اور زندہ رہے لیکن اپنی گمشدہ صحت نہ حاصل کر سکے۔

(ص ۲۲۵)

سردار پٹیل کے بارے میں مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس میں کسی اضافہ اور حاشیہ کی ضرورت نہیں۔

کشش حرفوں کی ایسی ہے کہ ہم بھی صاد کرتے ہیں۔

حرفِ آخر

انگریزی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت "آزادیِ ہند" INDIA WINS FREEDOM کے نام سے شائع ہوئی، میں نے اخبارات میں اس کا ذکر پڑھا، پھر بعض اخبارات میں اس کے کچھ حصے بھی نظر سے گزرے، اشتیاق پیدا ہوا کہ اسے دیکھوں لیکن یہ اشتیاق مایوسی سے بدلنے لگا۔ دفعتہً ۴ مئی ۱۹۵۹ء کو ایک دوست کے ہاتھ میں یہ کتاب نظر آئی، اشتیاق نے بے قراری کی صورت اختیار کرلی، میں ضبط نہ کرسکا، خلافِ عادت یہ کتاب مستعار مانگ لی، اس زمانہ میں کراچی سے ایک نہایت بے تکلف دوست آئے ہوئے تھے، جن کے ساتھ شب و روز کا اکثر حصہ صرف ہوتا تھا کتاب لا چکنے کے باوجود اسے پڑھنے کا وقت نہ ملا۔ ۶ مئی کو وہ رات کی گاڑی سے تشریف لے گئے اور میں کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ ۸ مئی کی شب تک کتاب ختم ہوچکی تھی۔

اس کتاب کے بارے میں خیال یہ تھا کہ پاکستان اور قائداعظم کے خلاف ہے اور اس قابل نہیں کہ اسے پاکستان میں درآمد کیا جائے لیکن اس کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ ان لوگوں کی رائے ہے جنہوں نے قطعاً یہ کتاب نہیں پڑھی۔

بے شک اس کتاب میں پاکستان، مسلم لیگ اور قائداعظم کے خلاف زہر چکانی ہے لیکن بہت مختصر کتاب ہے، کتاب کی ضخامت انڈکس سمیت ۲۵۱ صفحے ہیں، ایک صفحہ میں ۴۰ سطریں ہیں، اس میں مسلم لیگ، پاکستان اور قائداعظم کے خلاف جو کچھ ہے وہ مجموعی

حیثیت سے زیادہ سے زیادہ بارہ پندرہ صفحات پر مشتمل ہے ، باقی جو کچھ ہے وہ نہایت دلچسپ
سبق آموز اور عبرت انگیز انداز میں چہرہ کشائی ہے ، کانگرس کی بے اصولیوں کی ، متعدد
کانگریسی لیڈروں کے رازِ درون پردہ کی ، جب مولانا کانگرس کی بے اصولیوں اور
ہٹ دھرمیوں کی داستان بیان کرتے ہیں تو کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے قائدِ اعظم کی
زبان انہوں نے مستعار لے لی ہے ۔

اس کتاب میں مولانا نے کسی کو نہیں بخشا ہے ، شاید انہیں یہ احساس ہو گیا
تھا کہ کاروانِ حیات منزل کے قریب پہنچ گیا ہے ، ذرا بھی لگی لپٹی رکھے بغیر ،
انہوں نے اپنے تاثرات نہایت صفائی اور جرأت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں ،
بڑے سے بڑے اختلافی اور نزاعی مسئلہ پر مولانا کا عام اصول تھا کہ وہ لب کشائی
سے احتراز کرتے تھے ، اسی لئے مولانا محمد علی مغفور نے ان کا نام "ابوالکلام" کے
بجائے "ابوالسکوت" رکھ دیا تھا ، لیکن اس کتاب میں سُود در سُود سمیت مولانا
نے سارا حساب چکتا کر دیا ہے ، نہ کسی کو بخشا ہے نہ کسی کے ساتھ رعایت کی ہے
خواہ وہ گاندھی جی ہوں یا سردار پٹیل ، راجندر پرشاد ہوں یا راجگوپال اچاری ، جواہر لال
ہوں یا ڈاکٹر محمود ، سب کی غلطیاں بتائی ہیں ، سب کے پول کھولے ہیں ، سب کی اصول
پروری کی نقاب کشائی کی ہے ، لطف آجاتا ہے یہ واقعات پڑھ کر — ذکر اس
پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ۔

اس کتاب کے چند خصوصی پہلوؤں پر وضاحت کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں ۔

۱۔ مولانا نے کانگریسی زعماء کے جو پوست کندہ حالات لکھے ہیں ، کوئی شبہ نہیں
وہ بہت دلچسپ ہیں اور بالکل نئے ہیں ۔ اگر مولانا نے یہ کتاب نہ لکھی ہوتی تو شاید یہ
اہم ترین واقعات جو دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں اور مستقبل کے مورخ کے لیے حوالہ
کا کام دیں گے ۔ پردہ خفا میں مستور رہ جاتے ہیں ۔ یہ کتاب لکھ کر اور یہ واقعات برافگندہ
نقاب کر کے مولانا نے بہت بڑی خدمت انجام دی ہے ۔

اس سلسلہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کی یہ وسعتِ قلب اور عالی ظرفی قابلِ داد ہے کہ مولانا
کے انتقال کے بعد یہ کتاب اگرچہ آسانی کے ساتھ دبائی جا سکتی تھی اور جوشِ وفاداری سے
متاثر ہو کر اس کتاب کو انگریزی میں منتقل کرنے والے مسٹر ہمایوں کبیر نے پنڈت نہرو سے

استدعا بھی کی تھی کہ اسے اب شائع نہ کیا جائے لیکن پنڈت جی نے یہ استدعا منظور نہیں کی اور کتاب شائع کردی حالانکہ اس کی اشاعت ذاتی طور پر نہ ان کے لیے خوشگوار ہو سکتی تھی، نہ کانگرس کے لیے نہ ہندوستان کی ہندو اکثریت کے لیے اس لیے کہ سب ہی کو آئینہ دکھایا گیا ہے۔ پاکستان کو خاص طور پر مولانا کا اور پنڈت نہرو کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ مولانا نے یہ قابلِ قدر کتاب لکھی اور پنڈت نہرو نے اہم ترین تاریخی دستاویز شائع کرنے کی اجازت دے دی ورنہ بڑے قابل قدر اور کام آنے والی معلومات سے ہم محروم رہ جاتے۔

۲۔ کوئی شخص بھی جب کتاب لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ دوسروں کی ترجمانی نہیں کرتا، اپنی کرتا ہے، مولانا نے بھی اس کتاب میں اپنی ترجمانی کی ہے لہٰذا کسی کتاب کو ہمیں اس اعتبار سے دیکھنا چاہیے کہ ہمارے جذبات و احساسات سے کس درجہ ہم آہنگ ہے اس اعتبار سے دیکھنا چاہیے کہ لکھنے والے نے خود اپنے ساتھ کہاں تک دیانت برتی ہے؟ اگر وہ کتاب اس کی زندگی اور عمل سے ہم آہنگ ہے تو وہ سزاوارِ تحسین ہے اگرچہ پڑھنے والوں کو اس کے بعض مندرجات، خیالات، دلائل اور تعبیر سے کتنا ہی سخت و شدید اختلاف کیوں نہ ہو!

میں اگر گاندھی جی سے یا جواہر لال سے یا سردار پٹیل سے شکوہ کرتا کہ آپ نے تقسیم ہند کیوں قبول کرلی؟ تو میرا یہ سوال یا تو منافقت پر مبنی ہوتا یا دیوانگی پر، اس لیے کہ مجھے تقسیم سے کبھی اختلاف نہیں تھا، پھر تقسیم قبول کرنے والوں کا مجھے شکر گزار ہونا چاہیے نہ کہ گلہ مند!

لیکن اگر مولانا جو کانگرس کی وفاداری اور وحدتِ ہند کے عشق میں

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو اب ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

کے مصداق بن گئے تھے، ایک روز صبح بیدار ہو کر یہ دیکھیں کہ ان کے تمام ہندو رفقا اور ساتھی تقسیم ہند کے نہ صرف حامی بلکہ پُر جوش مبلغ اور داعی بن گئے ہیں اور کانگرس کے کیمپ میں وہ بالکل تنہا رہ گئے ہیں تو انہیں شکوہ کا حق بھی تھا اور نکتہ چینی کا بھی اور یہ کہنے کا بھی کہ ان لوگوں نے یہ تقسیم ذہنی تحفظ کے ساتھ قبول کی تھی۔"

یہ ارشاد فرمانے کا بھی کہ

"یہ پاکستان کے ہندوؤں کا انتقام ہندوستان کے مسلمانوں سے لینے کا فیصلہ کر چکے تھے" اس راز کو فاش کرنے کا بھی کہ

"ان کانگرسی رہنماؤں نے مسلمانانِ ہند کو یرغمال بنالیا تھا"

اور اگر دیانتداری سے غور کیا جائے تو ماننا پڑے گا، اپنے اس طرزِ عمل میں وہ حق بجانب تھے۔

بھلا اس شخص کی ذہنی کوفت کا اندازہ کیا جاسکتا جس نے دوستوں کی رفاقت میں اپنی عزت، اپنا وقار، اپنا علم، اپنی مشیخت، اپنی بزرگی، اپنی سجادگی، اپنا امام الہند ہونے کا دبدبہ، اپنی "حزب اللہ" کی دعوت، ہر چیز داؤں پر لگادی ہو ایک روز رات کو وہ حسبِ معمول اطمینان سے سوتے اور صبح جب اٹھے تو محسوس کرے کہ واقعی ان ساتھیوں کی نظر میں اس کی حیثیت "شوبوائے" کی تھی۔ وہ اس قابل بھی نہ تھا کہ اس کے جذبات کا پاس ولحاظ کیا جاتا، اس کی جس رائے کو اب تک وحی و الہام کا درجہ دیا جاتا رہا تھا۔ اب اسے کچھ بھی وقعت و اہمیت نہیں دی جاتی! یقیناً اس کے دل سے آہ کا دھواں اُٹھ رہا ہو گا۔

ایک ہم ہیں کہ ہوتے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے

اس کی کتاب پر یہ جو کالے کالے حروف نظر آتے ہیں یہ حروف نہیں اس کی آہِ جگر سوز کا دھواں ہے۔

۳۔ کانگرس، گاندھی جی اور دوسرے رہنمایانِ کانگرس کی ہٹ دھرمی، بے اصولی، پیمان شکنی، تلون کیشی اور بدخوئی کو مولانا نے تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن جواہر لال پر جہاں اعتراض کرتے ہیں یا ان کی خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو لب ولہجہ بدل جاتا ہے کہیں چھپتی ہے محبت کی نظر پیار کی آنکھ؟

۴۔ اس کتاب میں مولانا کا "انا" غبارِ خاطر سے بھی زیادہ نمایاں ہے!

جس طرح مروی، نامردی، طنز اور ابتذال، مذاق اور پھکڑ پن میں قدرے فاصلہ دارد کا معاملہ ہے اسی طرح انا اور انانیت کا معاملہ ہے۔

انا سے دامن بچانا کسی طرح ممکن نہیں جب تک "میں" (انا) ہوں، اس

وقت تک اپنی انفرادیت اور شخصیت سے کس طرح دستبردار ہو سکتا ہوں؟ کوئی ادیب ہو، خطیب، شاعر ہو یا واعظ، سپہ سالار ہو یا سپاہی، وزیر ہو یا فقیر، خراہ جم جاہ ہو یا گداتے بے نوا، صوفی صافی ہو یا رندے آشام، عالم ہو یا فاضل اجل، انا سے کوئی دامن نہیں بچا سکتا۔

لیکن انا کا استعمال بہت نازک ہے، ذرا سا بھونڈا پن آجاتے تو پھر انا، انا نہیں رہتا پھوہڑ پن بن جاتا ہے۔ تعلّی کی صورت اختیار کر لیتا ہے، خود پسندی اور خود نمائی کا پیکر منظر آنے لگتا ہے لیکن اگر اس انا میں ٹھہراؤ ہو، رکھ رکھاؤ ہو، وقار ہو، دبدبہ ہو تو یہ بڑی شاندار چیز ہے پھر اس کے سامنے بڑوں بڑوں کے سر جھکنے لگتے ہیں۔

مولانا کے انا میں یہی بات تھی، ان کا انا سمندر کی طرح گہرا، ہمالیہ کی طرح اونچا اور چاند کی طرح خوبصورت تھا۔

لوگ اپنے انا کو سات پردوں میں چھپاتے ہیں لیکن پکڑے جاتے ہیں، وہ سر جھکاتے ہیں، منہ بناتے ہیں، اپنے لیے غلام، خادم، ہیچ میرز، خاکسار، ذرہ و بے مقدار، ننگ اسلاف بندۂ عاصی اور اسی طرح کے بہت سے لاحقوں کے ساتھ انا کی پردہ پوشی کرتے ہیں، لیکن وہ ایک مجرم کی طرح ظاہر ہو ہی جاتا ہے، کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپاتے نہ بنے۔

لیکن مولانا کا انا بے پردہ ہے، بے پرواہ ہے، خود سر ہے، خود بیں ہے، معزز ہے، متکبر ہے لیکن نہایت دلکش، اس میں جلال و جمال کی ایسی آمیزش ہے کہ اس کی انا کی غلطیاں اور کوتاہیاں بھی دل کا دامن اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

جس کانگرس میں گاندھی جی انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ لگاتے ہیں اور سب سر بسجود ہو جاتے ہیں، جس کانگرس میں جواہر لال کی زبان گاندھی جی کو باپو کہتے سوکھتی ہے جس کے سامنے راجگوپال اچاری جیسا منجھا ہوا سیاستدان سر کے بل حاضر ہوتا ہے اور پٹیل اور راجندر پرشاد جیسے لوگوں کے سامنے اگر وہ دن کو رات کہتا ہے تو یہ ـــ ” اینک ماہ پروین “ کا نعرہ لگانے لگتے ہیں جس کے سامنے کانگرس کے بڑے بڑے نیتا، مہاسبھا کے لیڈر، جن سنگھ کے رہنما، گورنر جنرل اور وائسرائے ہند، برطانوی کابینہ کے وزرا، برطانیہ کا وزیر اعظم، جمعیتہ علمائے ہند کے علمائے کرام

سرِ نیاز خم کرتے ہیں وہاں ابوالکلام کہتا ہے۔

میں —

اور اس "میں" کا بانکپن سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس کا "میں" گاندھی جی کو مہاتما نہیں کہتا، جواہر لال کو پنڈت جی نہیں کہتا، راجندر پرشاد اور پٹیل کو وہ ذرۂ بے مقدار سمجھتا ہے، اس کا انا بڑے سے بڑا اعزاز جو گاندھی سے لے کر جواہر لال تک کو دے سکا، وہ "شریکِ کار" COLLEAGUE کا لفظ تھا۔

ساری کتاب پڑھ جائیے، معلوم ہوگا کانگرس کے تمام اہم فیصلے "انا" کی طبعِ رسا کا نتیجہ ہیں، تمام اہم تجویزوں کا مسودہ "انا" کا لکھا ہوا یا لکھوایا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس کا انا ایسا ڈکٹیٹر ہے جس کے سامنے کسی کو مجالِ دم زدن نہیں۔ اس انا کی پشت پر اگر کوئی قوت ہوتی تو شاید اس کی دلکشی ختم ہو جاتی، لطف تو یہ ہے صاحب "انا" ایک ایسا شخص ہے جو اقلیت کا ایک فرد ہے، جس کی قوم نہ صرف یہ کہ اس کی پشت پناہ نہیں بلکہ اس سے بیزار ہے، جو بہت بڑا لیڈر ہے لیکن جس کے متبعین انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، جو کوئی بات اپنی قوم سے نہیں منوا سکتا، جو ایک عرصہ دراز سے اپنی قوم کے اجتماعاتِ عامہ میں نہ شرکت کرتا ہے نہ تقریر، جو اگر کانگرس سے الگ ہو جائے تو پرکاہ کے برابر اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا، شامل ہے تو پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں، وہ بھی اپنی اس کمزوری سے واقف ہے اور اس کے شرکاءِ کار COLLEAGUE بھی لیکن پھر بھی دم خم کا یہ عالم ہے کہ اس کا "انا" ان لوگوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا جو اپنی عظیم اکثریت رکھنے والی قوم کے مہاتما ہیں، شاہِ بے تاج ہیں جن کے ایک اشارہ پر خون کی ندیاں بہہ سکتی ہیں جن کے ایک لفظ پر انقلاب آ سکتا ہے، جن کا ایک بول بغاوت برپا کرا سکتا ہے جن کے پاس دولت بھی ہے، سرمایہ دار اور مالکانِ مل بھی ہیں لیکن اس انا کی جیب خالی ہے کسی سرمایہ دار سے اس کا یارانہ نہیں، کسی مل مالک سے اسے سروکار نہیں اور اگر ہو بھی تو اس کی خودداری ان سے استمداد کو اپنی توہین سمجھتی ہے، ان حالات میں اس بے مثل و بے نظیر اور حسین و جمیل انا کی یہ جرأت، یہ ادا، یہ دھاندلی دیکھئے کہ سب سے اونچا بیٹھتا ہے، سب سے اونچا رہتا ہے، حریفانِ رزم آرا کے ساتھ اگر یہ اصول تھا کہ

نخوت سے جو کوئی پیش آیا
کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

تو ایک بات بھی تھی لیکن بالادست اور بااقتدار رفیقانِ بزم و انجمن سے بھی اس کا معمول یہی تھا۔ ہر طرح کے فکری اور سیاسی اختلافات کے باوجود یہ "انا" دلکش ہے یا نہیں؟

اب آپ کتاب ختم کر رہے ہیں، میں چاہتا ہوں آئیے ہم سب ہاتھ اُٹھا کر مولانا کے حق میں دُعائے خیر کریں اذکرو موتاکُم بالخیر ارشادِ نبوی ہے کہ مرنے والوں کا ذکر اچھائی کے ساتھ کیا کرو۔

مولانا کی آخری زندگی مسلمانوں کے ملّی نقطہ نظر سے کتنی ہی تکلیف دہ تھی، انھوں نے کانگریس اور جواہر لال کی دوستی میں حقائق سے اکثر چشم پوشی کی اور واقعات کو اکثر بہت زیادہ غلط اور مغالطہ آمیز رنگ میں پیش کیا اور یقیناً یہ کوئی قابلِ قدر کارنامہ نہیں تھا، ایک معمولی آدمی کے لیئے بھی نہیں نہ کہ ان جیسے بطلِ جلیل کے لئے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہم نے انہیں معاف بھی نہیں کیا، انہیں ٹوکا، روکا، ان پر نکتہ چینی کی تنقید کی، انہیں ہدف ملامت بنایا۔ اب اس سے بڑھ کر عبرتناک واقعہ کیا ہوگا کہ جس قوم نے پورے انشراحِ قلب کے ساتھ انہیں اپنا امام اور مقتدا بنا لیا تھا، وہی قوم، جب وہ کانگریس کے "شو بوائے" بن گئے تو ان سے بیزار اور بے تعلق ہو گئی ان میں ہمت نہیں تھی کہ اسے مخاطب کر سکیں۔

لیکن اب کہ ہم ان کے اعمال کا محاسبہ کر چکے ہیں، ضروری ہے کہ ان کے بعض حسنات کو بھی عیب می گفتی ورنہ شش نیز بگو کے مصداق یاد کر لیں۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانانِ متحدہ ہندوستان کی مذہبی اور سیاسی بیداری تین اصحاب کی مرہونِ منت ہے۔

۱۔ محمد علی کی خالص اسلامی سیاست، نیز ایثار و قربانی، جرأت و دلیری، خوف غیر اللہ سے بے نیازی، طاغوت کے مقابلہ میں بے سروسامانی کے باوجود جو مکھی جنگ لڑتے اور سجن و زنداں کیا، دار و رسن تک کا خیر مقدم کرنے کی ہمت۔

۲۔ اقبال کی دل میں اُتر جانے والی "غبارِ راہ حجاز ہو جا" والی شاعری "چنگیزی افرنگ" کے خلاف جہاد اور لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کے قلب و جگر کی تعلیم کا گو

ابوالکلام نے اعتراف نہیں کیا مگر محمد علی نے حسبِ عادت صاف الفاظ میں اقرار کر لیا کہ وہ اقبال کا درسِ حیات ہی تھا جس نے مسلمانوں میں مسلمانوں کے اکابر میں اور خوردان میں اسلام کو سربلند کرنے اور اس کی عزت و ناموس پر مرمٹنے کا جذبہ پیدا کیا۔

۳۔ تیسری چیز اس سلسلہ میں ابوالکلام کی صحافت اور خطابت، الہلال کی آواز بانگِ صور تھی جس سے قبر کے مردے زندہ ہو گئے۔ یہ آواز مذہب، سیاست، مسجد، خانقاہ مدرسہ حجرہ، مکتب، سکریٹریٹ، شہر، دیہات ہر جگہ پہنچی اور خاطر خواہ طور پر اثر انداز ہوئی۔

محمد علی آخر وقت تک اپنے مسلک پر قائم رہے اور "حدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی" پر عمل کرتے رہے، لندن میں جہاد کرتے ہوئے، مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے، بیت المقدس کی مسجدِ عمر میں سپردِ خاک ہوئے۔

اقبال کی دعوت کا رنگ بھی مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ نکھرتا گیا، یہ دعوت زیادہ سے زیادہ پرجوش اور ولولہ خیز بنتی گئی۔ اور اس کا انجام ہوا،

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبال کی آخری دعوت یہی تھی، اسی پر ان کا انتقال ہوا، لاہور میں ان کا انتقال ہوا اور شاہی مسجد کے دامن میں دفن ہوئے، وہ آسودہ خواب ہیں جہاں بڑے اور چھوٹے آتے ہیں اور نذرِ عقیدت پیش کر کے جاتے ہیں اور جہاں پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اپنا یہ مصرعہ گنگنا رہے ہوں:

میں جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے؟

ابوالکلام کی دعوت محمد علی اور اقبال کے مقابلہ میں بہت زیادہ پرخروش بلکہ جارحانہ تھی، وہ دنیا کے ہر مسئلہ کو "اسلام" کے رنگ میں دیکھتے تھے، دنیا کی ہر مشکل کا حل ان کے نزدیک "قرآن" تھا، دین ہو یا سیاست، نظامِ کائنات ہو یا دستورِ حیات، آزادی اور غلامی کا مسئلہ ہو یا اقوامِ غالب اور زبردست کے نزاعات، ان کے لئے قرآن کی رہنمائی کافی تھی، وہی تھے جنہوں نے طرابلس، مشہدِ مقدس اور مسجد کانپور کے حادثۂ المیہ پر صفِ ماتم بچھائی تھی اور ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا کہ مثال نہیں ملتی، وہی تھے

جنہوں نے تعلیم دی تھی کہ وطنیت دراصل ثنویت و بُت پرستی ہے اور اسلامیت، انسانیت کی معراجِ خیال لیکن زمانہ کی گردش کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات میں انقلاب آتا گیا۔ اور ملت سے کٹ کر وہ صرف وطن کے ہو رہے اور یہ خود نوشت بتاتی ہے کہ وطن نے بھی انہیں کلیجہ سے نہ لگایا، ان کی قدر نہ کی، ان کا دل دکھایا، ان کی توہین کی، ان کا دل توڑا، انہیں بدگمانی کا ہدف بنایا، انہیں وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے، وہ زندگی بھر خاموش رہے۔ لیکن موت سے کچھ پہلے اپنی خودنوشت میں جسے "اعترافات" کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ اپنے ابنائے وطن کے کارنامے نقش کر گئے، اس کارگاہِ حیات میں اگر واقعی مکافاتِ عمل کوئی چیز ہے تو ماننا چاہیے کہ ملت سے کٹ کر وطن کے دامن میں پناہ لینے کی سزا مولانا کو خود اہلِ وطن اور دیرینہ کارساتھیوں اور رفیقوں کے ہاتھوں مل گئی۔

ہم نے جہاں ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا پردہ چاک کیا ہے، وہاں کیا حرج ہے اگر ایک نظرِ بازگشت ان صفحات پر بھی ڈال لیں جو بہرحال تاریخ کا ایک حصہ ہیں — ناقابلِ فراموش!

بہرحال وہ دور ختم ہو گیا مولانا اس دنیا سے رخصت ہو گئے، جس کانگریس کی وہ رونق تھے، اس نے انہیں بھلا دیا جن ہندوؤں کے وہ دوست تھے آج وہی انہیں فرقہ پرست کہہ رہے ہیں، جن رفیقوں پر انہیں ناز تھا، آج وہ ان کے افکار خیالات کو حیرت انگیز قرار دے رہے ہیں مولانا بھی عالم بالا میں خوش ہوں گے کہ اچھا ہوا۔

حسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

اور جہاں تک قدیم کانگریسی مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں بھی

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد